مخزن

اُپنشد

ہندو فلسفہ اور تصوف کا مجموعہ

اُپنشدوں کی عبارت نہایت دقیق ہے اور ان پر بے انتہا شرحیں سنسکرت زبان میں لکھی گئی ہیں۔ اور ان میں سے بعض کے ترجمے یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ یوروپین دماغ کے لئے ان کی اصلی تہ کو پہنچنا نہایت دشوار ہے۔ اور اس وجہ سے یورپی ترجمے اکثر ناقص ہیں۔ لیکن ان ترجموں سے اس قدر فائدہ البتہ ہوتا ہے۔ کہ یوروپین علما کا طرز خیال اور مشرقی مسائل پر نظر ڈالنے اور نتائج نکالنے کا طریقہ معلوم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے۔ اس وقت تک اردو میں کوئی ترجمہ اُپنشد کا شائع نہیں ہوا ہے۔ گو اسکی سخت ضرورت ہے۔ ہم اپنے ترجمے میں اولاً شنکر اچاریا کی شرح اور آنند گیری کے حاشیے کو جو اس نے اس شرح پر لکھا ہے ملحوظ رکھینگے اور اس کے سوا جو کچھ یورپ کے مصنفین نے اُپنشدوں کی نسبت خیالات ظاہر کئے ہیں اور جو کچھ توجیہیں اُنہوں نے مختلف مقامات کی دی ہیں۔ اُن سے بھی کام لینگے

اشارہ اُن لوگوں کی طرف ہے۔ جو دنیا کو ترک کرکے اور صرف اُتموں پر دھیان دیکر نجات حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ دنیا میں رہنا چاہتے ہیں۔ پھر ان کے لئے یہی راستہ بتایا گیا ہے۔ کہ نیک کام کریں اور سو برس دنیا میں جئیں۔ اس قسم کے اعمال اُن کو بار بار جنم لینے اور سنسار کے چکر سے بچا لینگے۔

۳ - جو شخص اتمن کو مارتے ہیں۔ یعنی اتمن کے علم پر جہالت کا پردہ ڈالتے ہیں۔ وہ اس جسم سے نکلنے کے بعد ایسے بھولوں میں جا پہنچیں گے جو اسوروں کے جنم ہیں اور جو گہری تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

۴ - وہ اتمن ایک ہے۔ لاثانی اور مستقیم با حرکت ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی انسان کے ذہن سے بھی زیادہ تیز ہے۔ انسان کے حواس اس کو پا نہیں سکتے۔ وہ اُن سے آگے آگے جاتا ہے۔ باوجود ایک مقام پر مستقیم ہونے کے وہ اُن سے زیادہ تیز ہے جو اُس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ اسی کی بدولت ہوائے لطیف تمام عالم کی روح اور تمام جانداروں کے افعال کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

اِس فقرے میں اتمن کی حالت بیان کی گئی ہے۔ اس کے مستقیم ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ اور اس کی تیزی سے یہ مراد ہے کہ جس قدر دور تک انسان اپنے خیال اور ذہن کو جولان دے۔ اُس کا منتہیٰ اتمن ہے۔ گویا اتمن اُس کے خیال سے بھی پہلے وہاں جاکر موجود ہوگیا۔

۵ - وہ حرکت میں آتا ہے۔ اور بے حرکت ہے۔ وہ دور ہے۔ اور پھر نزدیک ہے۔ وہ اس تمام عالم کے اندر ہے اور پھر تمام عالم سے باہر ہے۔

۶ - جو کوئی تمام عالم کو اپنے ہی اتمن میں پاتا ہے۔ اور اپنے اتمن کو تمام عالم میں پاتا ہے۔ اُسکو کوئی امر نفرت انگیز نہیں معلوم ہوتا۔

دس اُپنشدوں کا مجموعہ میں جو بمبئی اور کلکتے میں چھپا ہے۔ سب سے پہلا اُپنشد ایشو
پنشد ہے۔ اور اسی کے ترجمے سے ہم ابتدا کرتے ہیں۔ یہ اُپنشد شکل یجر وید سے متعلق ہے
اور شت پتھ برہمنہ[1] کے آخر میں واقع ہوا ہے۔ اور نظم میں ہے۔ جدید تحقیقات سے یہ ثابت
ہوا ہے۔ کہ جن اُپنشدوں کی عبارت نثر ہے۔ وہ بمقابل نظم اُپنشدوں کے زیادہ قدیم ہیں۔
ایشو پنشد ایک لحاظ سے خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ ایسے وید سے متعلق ہے۔
جس میں نرے اعمال بھرے ہوئے ہیں۔ اور نجات کا دارومدار انہی اعمال کے درست
طور پر انجام دینے میں قرار دیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے اُپنشد اور ویدانت کی تعلیم یہ ہے
کہ نجات کا دارومدار محض وِدّیا یعنی اصلی علم پر ہے۔ جس وقت انسان دنیا کے ظاہری
محسوسات سے پار ہو کر ان محسوسات کی جو جڑ ہے۔ اُس تک پہنچ جاتا ہے۔ تب اُس کو
مکتی مل جاتی ہے۔ پس گویا اس اُپنشد کی تعلیم میں اور اُس خاص وید کی تعلیم میں جس کا
یہ ضمیمہ ہے۔ ایک قسم کا تباین واقع ہوا ہے۔

ایشوپنشد

ا۔ تمام دنیا یعنے جو کچھ اس زمین پر ہے اور اس کے ساتھ حرکت کرتا ہے۔ صرف ایک
خدائے مطلق کا ظہور ہے۔ وہ ان سب پر حاوی ہے اور سب کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ پس
اس دنیا کو چھوڑ کر اصلی حقیقت کو پا اور سچا تمتع حاصل کر۔ اے شخص! کسی کی دولت پر نظر نہ ڈال۔
۲۔ اگر کوئی سو برس تک جینے کی تمنا رکھے۔ تو اس کو چاہیئے کہ کریا کرم (اعمال) اور
عبادت کرتا جائے۔ یہی راستہ ہے۔ کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ جس سے انسان کو بُرے کام
چمٹ نہ جائیں

[1] شت پتھ کے لفظی معنے صد باب ہیں ۱۲

چونکہ ایسا شخص اصل حقیقت کو پا گیا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اُسے کسی ایسی چیز کا سامنا نہیں ہوتا۔ جو نفرت دلائے۔

۷۔ جب کہ عارف کی نظروں میں تمام عالم خود اس کی آتمن میں سما جاتا ہے۔ پھر اُسے کس امر کی پریشانی اور کس امر کا رنج۔ وہ تو وحدتِ وجود کو پا گیا ہے۔

۸۔ یہ آتمن نورانی ہے اور بے جسم حِس سے بری۔ خالص اور پاک۔ بصیر اور علیم۔ جبار اور قوی۔ ہر چیز پر محیط ہے۔ اور ہر ایک کو اُس نے اپنا اپنا فرض دوام کے لئے تفسیم یا آ...

۹۔ جو اَودیا (مراد کریا کرم) کو مانتے ہیں۔ وہ گہری تاریکی میں ہیں لیکن وہ جو ودیا (مراد دیوتاؤں) کی پرستش کرتے ہیں وہ اس سے بھی زیادہ تاریکی میں ہیں (یہ شنکراچاریا کی شرح کے مطابق ترجمہ ہے لیکن اس کی نسبت آخر میں بحث کی گئی ہے)۔

۱۰۔ کہا جاتا ہے کہ ودیا کا پھل اَور ہے اور اودیا کا پھل کچھ اَور۔ ہم یہ اُن منیوں سے سُنتے آئے ہیں۔ جنہوں نے ہمیں ودیا اور اودیا کی تعلیم دی۔

۱۱۔ جو ودیا اور اودیا دونو کو جانتا ہے وہ اودیا کے ذریعے سے موت سے بچتا ہے اور ودیا کے ذریعے سے حیاتِ جاودانی پاتا ہے۔

۱۲۔ جو لوگ اُس چیز کی پرستش کرتے ہیں۔ جو سببِ اول نہیں ہے۔ گہری تاریکی میں پڑ جاتے ہیں اور جو بلا واسطہ سببِ اول کے پیچھے جاتے ہیں وہ اس سے بھی زیادہ تاریکی میں پڑتے ہیں۔

۱۳۔ کہتے ہیں کہ سببِ اول کے علم سے ایک بات حاصل ہوتی ہے اور اس چیز کے علم سے جو صرف درمیانی سبب ہے کچھ اَور ہی حاصل ہوتا ہے۔ یہی ہم منیوں سے سُنتے آئے ہیں جنہوں نے ہمیں تعلیم دی ہے۔

۱۴۔ جو کوئی سببِ اول کو جانتا ہے اور اس کے ساتھ ہی فنا سے بھی واقف ہے۔ وہ فنا کے ذریعے سے موت پر فتحیاب ہوتا ہے اور سببِ اول کو جاننے کی وجہ سے حیاتِ جاودانی

پاتا ہے -

۱۵- حقیقت کا چہرہ سونے کے ڈھکنے سے چھپا ہوا ہے۔ اے آفتاب، کھول دے تو ڈھکنا - تاکہ مجھ سا جویانِ حقیقت اس چہرے کو دیکھ لے -

۱۶- اے آفتاب! تنہا آکاش میں پھرنے والا، سب کا نبھانے والا - اے سوریا پرجاپتی کے فرزند - اپنی کرنوں کو الگ کر اور سمیٹ لے - میں تیرے نور کو تیری سادہ صورت کو دیکھتا ہوں - میں وہی ہوں پرش جو تیرے اندر ہوں -

۱۷- اے میری روح تو جا کر ہوائے جاودانی میں مل جا اور اے جسم تو مل خاک میں - اوم[1] - اے نفس اپنے اعمال یاد رکھ یاد رکھ میرے اعمال کو - اے نفس یاد رکھ یاد رکھ میرے اعمال کو -

یہ فقرے گویا ایسے شخص کی زبان سے ہیں جو نزع کی حالت میں ہے -

۱۸ - اے اگنی[2]! ہمیں نیک رستے سے اپنے اعمال کے پھلوں سے متمتع کر۔ کیونکہ تو ہمارے کل اعمال جانتا ہے - گناہ اور بدی کی کجی کو ہم سے دور کر - ہم تجھے باسجدہ آداب

تمام اپنشدوں میں یہ اپنشد نہایت مشکل ہے - اور اس کی وجہ یہ کہ اپنشد اور ویدانت کی اصلی تعلیم میں نجات کا دارومدار صرف آتما یعنے وحدتِ وجود کے علم حاصل کرنے پر رکھا گیا ہے - حالانکہ اس اپنشد میں اعمال اور کرم بھی ایک درجہ تک نجات کا ذریعہ مانے گئے ہیں - اسی لئے شنکر آچاریہ کو اس کی شرح کرنے میں بعض جگہ دقت پیش آئی ہے لیکن اس کی دو شرحیں اور بھی ہیں ایک تو مہیدھر کی اور دوسری اُدوٹ کی اور ان شرحوں میں مشکل مقامات کو زیادہ فصاحت سے بیان کیا گیا ہے - لب لباب اسکی تعلیم کا

---

[1] اوم - ایک نہایت مقدس لفظ ہے جو ہر ایک مقدس کتاب کو شروع کرتے وقت اب تک بڑے لحن سے ادا کیا جاتا ہے -

[2] اگنی - کے اصلی معنی آگ ہیں اور یہ وید میں ایک بہت بڑا دیوتا اور ہر قسم کی قربانی کی قبولیت کا ذریعہ ہے -

یہ ہے۔ کہ اگر انسان اعمال نیک کرے۔ لیکن اس نیت سے نہیں۔ کہ اُن کا پھل پائیگا۔ بلکہ محض
اس نیت سے کہ ایسے اعمال کے ذریعے سے اس کو وحدتِ وجود تک پہنچنے میں مدد ملیگی۔
تب اس قسم کے اعمال اس کے کام آئینگے۔ اور ایسے کام کرتا ہوا وہ سو برس بھی جئے تو اس کے
یہ اعمال مثل معمولی اعمال کے اسکو چمٹ نہیں جائینگے۔ اور اُسے زندگانی کے چکر اپنے
سنسار میں نہیں رکھینگے۔ بلکہ وحدت وجود تک پہنچنے کے لیے اس قسم کے اعمال کی وساطت
کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وحدت وجود کا درجہ حاصل کرنے کے لئے نیچے کے طبقات سے گذرنا
لازمی ہے۔ اور بلا وساطت ان طبقات کے وہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے
برہمن کی عمر کا پہلا حصہ تحصیل علم میں صرف ہونا چاہیئے۔ اور دوسرا کاروبار زندگانی اور کریا
کرم کے کرنے میں اور تیسرا درجہ سنیاس ہے۔ جس میں وہ تمام قیود سے چھٹ جاتا ہے
اور اُسے وحدت وجود کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ جو شخص ان درمیانی مدارج کو چھوڑ کر ایک مرتبہ سنیاس
تک پہنچنا چاہے وہ گنہگار خیال کیا جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے نویں فقرے میں اور بارہویں
فقرے میں کہا گیا ہے۔ کہ جو لوگ اصل کی طرف جانا چاہیں۔ یعنی بلا وساطت ایسے اعمال
کے جن کا ذکر اُوپر کیا گیا۔ وہ ان سے بھی زیادہ تاریکی میں ہیں جو صرف اعمال پر بھروسا
رکھتے ہیں۔ اگرچہ شنکر آچاریا نے مشکل سے بچنے کے لئے نویں فقرے میں (اوِدّیا) سے مراد وہ اعمال لئے ہیں جو پھل کی
غرض سے کئے جائیں اور (وِدّیا) سے مراد صرف دیوتاؤں کا علم لیا ہے لیکن شاستر کے
رُو سے اس قسم کی (اوِدّیا) پِتری لوگ یعنے عالمِ اَرواح میں پہنچاتی ہے اور اس قسم کی
(وِدّیا) دیولوک یعنی اندر وغیرہ دیوتاؤں کے عالم میں پہنچاتی ہے اور وہاں پہنچنے کے
بعد بھی ممکن ہے کہ بندہ وحدت وجود اور نجات کا درجہ نہ حاصل کرکے پھر سنسار کے چکر میں پڑ جائے
غرض عارف جو یہاں کو چاہیئے کہ سیڑھی کے سب زینے طے کرتا ہوا وحدت وجود اور نجات مطلق کے
درجے تک پہنچے۔

اگرچہ ویدانت سوتر میں مانا گیا ہے کہ بلا نیک اور بے غرض اعمال کی سیڑھی طے کئے ہوئے بھی مکتی حاصل ہو سکتی ہے لیکن ایسے اعمال کے ذریعے کو مستحسن ہی بتایا گیا ہے۔ بدھ مذہب نے البتہ عمل کی قید بالکل اٹھا دی۔ لیکن اس اپنشد کی تعلیم یہی ہے کہ عارف نیک اور بے غرض اعمال کے ذریعے اپنے آپ کو تیار کرے اور بتدریج اپنے تئیں وحدت وجود کے درجے تک پہنچائے۔ لیکن صرف اعمال باعثِ نجات نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ نکتہ ملحوظ رہے تو اس اپنشد میں کوئی مشکل امر باقی نہیں رہتا +

سید علی بلگرامی (کیمبرج)

تاریخی واقعات میں اختراع کی گنجایش

عموماً ہر ایک علم اور ہر ایک فن میں اختراع کی گنجایش ہے جو علمی ترقی آج دنیا کو نصیب ہے وہ کہاں ہوتی بلکہ خود علوم و فنون ہی کہاں ہوتے اگر انسان میں اختراع اور دریافت کا مادہ اور شوق موجود نہ ہوتا؟ لیکن یہ امر بھی بظاہر اب تک ٹھیک معلوم ہوتا تھا کہ تاریخ کے واقعات دائرہ اختراع سے باہر ہیں۔ خدا بھلا کرے جناب حسرت موہانی سلمہٗ کا کہ انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ہم جیسے لوگ تاریخ کے واقعات بھی اختراع کر سکتے ہیں۔ اگست ۱۹۰۵ء کے اردوئے معلےٰ میں میر مجروح کے بارے میں حضور ایڈیٹر صاحب کے قلم خاص کا ایک مضمون چھپا ہے اس مضمون سے دنیا کی یہ غلط فہمی قطعی طور سے رفع ہو گئی کہ میر مہدی مجروح دہلی کے رہنے والے تھے۔ اس مضمون کے دوسرے صفحے کو پڑھ کر سب کو یقین آگیا کہ میر مجروح واقعی پانی پت کے باشندے تھے۔ یہ غلط بالکل غلط کہ انکے باپ دادا دہلی کے تھے۔ وہ خود دہلی میں پیدا ہو کر وہیں پرورش پائی وہیں ہوش سنبھالا وہیں جوان ہوئے اور صرف ایام غدر کے انقلابات کے چکر میں آکر جیسے اور سینکڑوں خلائق دہلی کو چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے وہ بھی پانی پت آ رہے تھے۔ مرزا غالب کے رقعے میں پانی پت کی اس عارضی بود و باش کی طرف اشارہ کیونکر ہو سکتا ہے واقعی حضرت موہانی کا یہ اختراع قابل داد ہے۔ ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند +

(تحقیق)

جرمن طالب علموں کی زندگی

یہ مضمون ہمارے فاضل عنایت فرما ریورنڈ ڈاکٹر وائٹ بریخٹ صاحب ایم۔ اے کا عطیہ ہے۔ پادری صاحب کو مخزن کے ساتھ شروع سے دلچسپی رہی ہے اور آپ اس رسالے کے اولین قدردانوں میں ہیں۔ پنجاب کے پادری صاحبان میں کیا باعتبارِ معلوماتِ علمی اور کیا بلحاظِ وسعتِ اخلاق آپ کا رتبہ ایسا ہے کہ محتاجِ توصیف نہیں۔ تعلیمی معاملات سے بھی آپ کو خاص تعلق ہے کیونکہ دیر تک پنجاب یونیورسٹی کے اراکین میں رہے ہیں۔ آپ ان دنوں یورپ میں ہیں اور علمی مشاغل اور سیاحت کے باوجود آپ کا مخزن کو یاد فرمانا اور اس کے لئے ایسا دلچسپ اور معلومات سے بھرا ہوا مضمون بھیجنا ایک ایسا احسان ہے جس کی کافی شکر گذاری نہیں ہو سکتی:—

کچھ بہت مدت نہیں ہوئی کہ اردو میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کا نام تھا "ایم۔ اے بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی"۔ یہ کتاب اور وہ قصہ جو اس میں درج تھا۔ اس رائے کا اظہار تھے۔ کہ مغربی طریق پر جو تعلیم ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ہو رہی ہے۔ اس کے نتائج پورے اطمینان دہ نہیں ہیں۔ اور یہ رائے بعض حلقوں میں مسلّمہ ہے۔ مگر نتائج کا ناقص ہونا کچھ ایسے تعجب کا مقام نہیں ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی دنیا کے تعلیمی مرکز ... اور ایم۔ اے اس قابل نہیں ہوتا کہ یونیورسٹی کی تربیت کے تسلی بخش نتائج دکھا سکے ... واقعہ کے ساتھ اس بات پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ یونیورسٹی کا طریق ... لئے ایک نئی چیز ہے۔ کسی نئی سرزمین میں اگر ایک ... چھوٹے چھوٹے بوٹے ... سے اکھیڑ کر لگانے چاہیں تو ان میں سے ایک خاص تعداد ضرور خراب ہو ... اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہو کہ کل درختوں کے پھل کی تعداد معمول سے ... درجے ...

ہندوستان میں اس امر کی ضرورت ہے کہ یونیورسٹی کا طریق حالات ملک کے مناسب بنایا جائے اور اہل ملک کے دل اس نئے طریق کے اخذ کرنے اور اپنے آپ کو اس کے سانچے میں ڈھالنے کی طرف مائل ہوں۔ مگر دونوں جانب کی اس باہمی کشش کی تکمیل کے لئے جو عرصہ درکار ہے اس کی تکمیل ایک پشت میں نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ ہے کہ تعلیم کا درخت ہندوستان میں اب بھی پھل لانے لگا ہے۔ اور جوں جوں زمانہ گذرتا جائیگا زیادہ پھل لائیگا۔ جو اثرات مترتب ہوئے ہیں۔ اُن کا ایک نمایاں حصہ یہ ہے کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے امتحانات کی امتیازی نمبروں سے نہایت خوش کن شہادت ملتی ہے۔ کہ ہندوستانی طالب علم اپنے انگریز بھائیوں کے ساتھ خاص اُن کے میدان میں مقابلہ کر کے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ بلا شبہ یہ بہت مفید ہو کہ ہمارے ہندوستانی طلبہ میں سے بہترین طالب علم اپنے ہاں تعلیم ختم کرنے کے بعد یونیورسٹی کی تعلیم کے ایک ایسے طریق سے بھی شناسائی حاصل کریں جو اُن کی یونیورسٹیوں سے مختلف ہے۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی مشابہت لنڈن اور مانچسٹر اور لیڈز کی یونیورسٹیوں سے ہے۔ کیونکہ یہ سب زیادہ تر امتحان لینے والی جماعتیں ہیں اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری نسبتاً بہت کم لیتی ہیں۔ اور مشترک تمدن اور باہمی ارتباط کی زندگی ان کے ہاں موجود نہیں۔ یہ خصوصیت آکسفورڈ اور کیمبرج کے کالجوں میں ہے اور یہ کالج ان مقامات کی خصوصیت ہیں۔ ان میں طلبہ نہ صرف تعلیم پانے آتے ہیں۔ بلکہ ہر کالج طلبہ کی ایک جماعت کا گھر ہے۔ جہاں وہ سب مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ بلکہ ابتدا میں مل کر صبح و شام عبادت بھی کرتے تھے۔ گو اب یہ قاعدہ اختیاری ہو گیا ہے۔ اوائل میں یہ تمام کالج مذہبی جماعتیں تھیں۔ مگر اب یہ رشتہ لازمی نہیں رہا۔ ہاں سوشل ارتباط اب تک جاری ہے۔ اور اس کا اثر آدمی پر عمر بھر رہتا ہے اور کالج کے بعد کی زندگی میں زور سے محسوس ہوتا ہے۔ افسران کالج اپنے طلبہ کے معاملات علمیہ میں مدد دیتے اور اُن کے چال چلن اور رویہ کو منضبط رکھتے ہیں۔ اور یہ دونوں اثرات طالب علم

کی زندگی کے لئے اہم ہیں۔

یونیورسٹی کا ایک تیسرا نمونہ بھی ہے۔ جو ہندوستانی اہل علم کی توجہ کے لائق ہے۔ اور یہ انگریزی اور ہندوستانی طریق کے بین بین ہے۔ یہ وہ نمونہ ہے جو جرمنی سے مخصوص ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نمونے کا مختصر سا حال جو مجھے ذاتی تجربے سے معلوم ہے۔ ناظرینِ مخزن کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ میں محض یادداشت سے لکھ رہا ہوں اور اس لئے ہر باب صحیح اعداد نقل نہیں کر سکتا۔

جرمنی کے طریقِ تعلیم پر باہر سے نظر ڈالیں۔ تو وہاں کی یونیورسٹیوں کی خصوصیتیں حسب ذیل ہیں:
(۱) بلحاظ آبادیٔ ملک اُن کی کثیر تعداد (۲) ہر تعلیم گاہ میں معلموں کی کثرت اور لکچر کے ذریعے سے تعلیم دینے کے طریق پر غیر معمولی زور (۳) ایسی تحقیقات پر جو پہلے کسی نے نہ کی ہو زیادہ وقت اور قوت صرف کرنا (۴) طلبہ کی آزاد مگر بسل جول والی زندگی۔ میں ان نکات میں سے ہر ایک کے متعلق تھوڑا تھوڑا بیان کرتا ہوں۔

قیصرِ جرمنی کی حدودِ سلطنت میں بیس سے زیادہ یونیورسٹیاں ہیں۔ حالانکہ سلطنتِ متحدہ برطانیہ میں مانچسٹر اور شیفیلڈ وغیرہ کو چھوڑ کر جہاں حال ہی میں یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں یونیورسٹیوں کی تعداد اس کا نصف ہے۔ جرمن میں تعداد طلبہ بھی انگلستان کے طلبہ کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔ یہ اس لئے ممکن ہوا کہ جرمنی میں یونیورسٹی کی تعلیم کا خرچ انگلستان کے خرچ سے بہت کم ہے۔ انگریزی یونیورسٹیوں میں سے اکثر کی قرونِ وسطی میں بنا ڈالی گئی تھی۔ جرمنی کی تعلیم گاہیں بالعموم سولہویں صدی عیسوی کے زمانہ اصلاح کی یادگار ہیں۔ جرمنی میں یونیورسٹیوں کی کثرت کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ کہ ۱۸۷۰ء تک ملک کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ ہر ریاست کا حکمران اپنے ہاں ایک تعلیمی مرکز رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۶۹۴ء میں پرشیا کے بادشاہ کے ماتحت ہالے کی یونیورسٹی قائم ہوئی۔ باوجودیکہ اس کے

بہت قریب لیپزگ کی پرانی یونیورسٹی سنہ ۱۴۰۹ء سے چلی آتی تھی۔ جو سکسنی کے بادشاہ کے ماتحت تھی۔ مگر لطف یہ کہ باوجود اس قرب کے یہ دونوں اور بہت سی اور نہایت خوشحال تعلیم گاہیں ہیں۔ جن میں ہزاروں طالب علم ہیں۔ اور جن کے علم تمام ممالک میں اپنی فضیلت کے باعث مشہور رہیں۔ جرمنی میں صدیوں سے یہ دستور چلا آیا ہے کہ سرکار تعلیم عامہ اور علوم و فنون لطیفہ کی امداد بڑی فیاضی سے کرتی ہے۔ اور اس بارے میں اس کا طریق عمل انگلستان کی حکومت سے مختلف ہے۔ یہاں انیسویں صدی تک یہ حال تھا کہ تعلیم کے لیے یا تو خاص خاص فیاض اشخاص سے بڑی بڑی رقمیں ملیں۔ جیسا کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے کالجوں کے قیام کو وقت اور یا مذہبی جماعتوں سے امداد ملی۔ جیسا کہ انگلستان کے چرچ۔ گرجا کی طرف سے ساری قوم کی ابتدائی تعلیم کو یک سلسلہ انیسویں صدی میں جاری کیا گیا۔ اور اس کے مصارف چرچ کی سرمایہ سے دیئے گئے۔ جرمنی میں ایسی چیزیں ہمیشہ حکومت وقت سے متعلق رہی ہیں اور اب تک بھی ہیں۔ جو لوگ اپنے طور پر بھی کوئی قابل قدر دریافت یا ایجاد کرتے ہیں۔ ان کو سرکاری امداد جرمنی میں انگلستان کی نسبت زیادہ مستعدی اور زیادہ کشادہ دلی سے دی جاتی ہے۔

جرمنی یونیورسٹیوں میں تعداد معلمین کے تہیہ میں بھی دریا دلی برتی جاتی ہے۔ یہ انکی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ ان میں تعلیمی صیغوں کی یہ تقسیم پرانے زمانے سے مروج ہے۔ کہ چار شعبے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ہر شعبہ یا فیکلٹی ایک علم سے مخصوص ہے۔ دینیات[۵۷]۔ فلسفہ۔ قانون اور طب۔ علم طبعیات فلسفے میں شامل ہے اور اس کی شاخ سمجھا جاتا ہے۔ ہر شعبے میں ایک مکمل گروہ اساتذہ کا موجود ہے۔ یہ پروفیسر تین قسموں میں منقسم ہیں۔ "معمولی"۔ "غیر معمولی" اور "اتالیق" ان میں جو "استاد معمولی" کے لقب سے ملقب ہیں۔ وہ گویا مستقل معلم ہیں۔ "غیر معمولی" ان استادوں کا نام ہے جو "معمولی" پروفیسروں کے سوا زائد کام کے لیے وقتاً فوقتاً مقرر کیے جاتے ہیں۔ اور

۵۷ اس تقسیم کو دیکھ کر اسلامی درسگاہوں کا پرانا اصول یاد آتا ہے جب تقسیم اس اصول پر تھی کہ اعلیٰ علم [illegible] علم الادیان و علم الابدان [illegible] پیش نظر رہے

کی زندگی کے لئے اہم ہیں۔

یونیورسٹی کا ایک تیسرا نمونہ بھی ہے ۔ جو ہندوستانی اہلِ علم کی توجہ کے لائق ہے۔ اور ۔ انگریزی اور ہندوستانی طریق کے بین بین ہے۔ یہ وہ نمونہ ہے جو جرمنی سے مخصوص ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نمونے کا مختصر سا حال جو مجھے ذاتی تجربے سے معلوم ہے۔ ناظرینِ مخزن کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگا ۔ مَیں محض یادداشت سے لکھ رہا ہوں اور اس لئے ہر باب صحیح اعداد نقل نہیں کر سکتا۔

جرمنی کے طریقِ تعلیم پر باہر سے نظر ڈالیں ۔ تو وہاں کی یونیورسٹیوں کی خصوصیتیں حسب ذیل ہیں (۱) بہ لحاظ آبادیٔ ملک اُن کی کثیر تعداد (۲) ہر تعلیم گاہ میں معلموں کی کثرت اور لکچر کے ذریعے سے تعلیم دینے کے طریق پر غیر معمولی زور (۳) ایسی تحقیقات پر جو پہلے کسی نے نہ کی ہو۔ بافراط وقت اور قوت صرف کرنا (۴) طلبہ کی آزاد مگر بھول بھال والی زندگی ۔ مَیں ان نکات میں سے ہر ایک کے متعلق تھوڑا تھوڑا بیان کرتا ہوں۔

قیصرِ جرمنی کی حدودِ سلطنت میں بیس سے زیادہ یونیورسٹیاں ہیں۔ حالانکہ سلطنتِ متحدہ برطانیہ میں مانچسٹر اور شفیلڈ وغیرہ کو چھوڑ کر جہاں حال ہی میں یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں۔ یونیورسٹیوں کی تعداد اس کا نصف ہے ۔ جرمن میں تعداد طلبہ بھی انگلستان کے طلبہ کی تعداد سے بہت زیادہ ہے۔ یہ اس لئے ممکن ہوا کہ جرمنی میں یونیورسٹی کی تعلیم کا خرچ انگلستان کے خرچ سے بہت کم ہے۔ انگریزی یونیورسٹیوں میں سے اکثر کی قرونِ وسطی میں بنا ڈالی گئی تھی۔ جرمنی کی تعلیم گاہیں بالعموم سولھویں صدی عیسوی کے زمانۂ اصلاح کی یادگار ہیں ۔ جرمنی میں یونیورسٹیوں کی کثرت کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ کہ ۱۸۷۰ء تک ملک کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ ہر ریاست کا حکمران اپنے ہاں ایک تعلیمی مرکز رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۶۹۴ء میں پرشیا کے بادشاہ کے ماتحت ہالے کی یونیورسٹی قائم ہوئی ۔ باوجودیکہ اس کے

بہت قریب لیپزگ کی پرانی یونیورسٹی سنہ ۱۴۰۹ء سے چلی آتی تھی۔ جو سکسنی کے بادشاہ کے ماتحت تھی۔ مگر لطف یہ کہ باوجود اس قرب کے یہ دونوں اور بہت سی اور نہایت خوشحال تعلیم گاہیں ہیں۔ جن میں ہزارہا طالب علم ہیں۔ اور جن کے علم تمام ممالک میں اپنی فضیلت کے باعث مشہور ہیں۔ جرمنی میں صدیوں سے یہ دستور چلا آیا ہے کہ سرکار تعلیم عامہ اور علوم فنون لطیفہ کی امداد بڑی فیاضی سے کرتی ہے۔ اور اس بارے میں وہاں کا طریق عمل انگلستان کی حکومت سے مختلف ہے۔ یہاں انیسویں صدی تک یہ حال تھا کہ تعلیم کے لئے یا تو خاص خاص فیاض اشخاص سے بڑی بڑی رقمیں ملیں۔ جیسا کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے کالجوں کے قدیم وقف اور یا مذہبی جماعتوں سے امداد ملی۔ جیسا کہ انگلستان کے چرچ (گرجا) کی طرف سے ساری قوم کی ابتدائی تعلیم کا ایک سلسلہ انیسویں صدی میں جاری کیا گیا۔ اور اس کے مصارف چرچ کے سرمایہ سے دیئے گئے۔ جرمنی میں ایسی چیزیں ہمیشہ حکومت وقت سے متعلق رہی ہیں اور اب تک بھی ہیں۔ جو لوگ اپنے طور پر بھی کوئی قابل قدر دریافت یا ایجاد کرتے ہیں۔ ان کو سرکاری امداد جرمنی میں انگلستان کی نسبت زیادہ مستعدی اور زیادہ کشادہ دلی سے دی جاتی ہے۔

جرمنی یونیورسٹیوں میں تعداد معلمین کے تہیہ میں بھی دریا دلی برتی جاتی ہے۔ یہ انکی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ ان میں تعلیمی صیغوں کی تقسیم پرانے زمانے سے مروج ہے۔ کہ چار شعبے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ہر شعبہ یا فیکلٹی ایک علم سے مخصوص ہے۔ دینیات[1]۔ فلسفہ۔ قانون اور طب۔ علم طبعیات فلسفے میں شامل ہے اور اس کی شاخ سمجھا جاتا ہے۔ ہر شعبے میں ایک مکمل گروہ اساتذہ کا موجود ہے۔ یہ پروفیسر تین قسموں میں منقسم ہیں۔ "معمولی"۔ "غیر معمولی" اور "اتالیق"۔ ان میں جو اُستاد "معمولی" کے لقب سے ملقب ہیں۔ وہ گویا مستقل معلم ہیں۔ "غیر معمولی" اُن اُستادوں کا نام ہے جو "معمولی" پروفیسروں کے سوا زائد کام کے لئے وقتاً فوقتاً مقرر کئے جاتے ہیں۔ اور

[1] اس تقسیم کو دیکھکر اسلامی درسگاہوں کا پرانا اصول یاد آتا ہے جب تقسیم اس اصول پر تھی کہ العلم علمان علم الادیان و علم الابدان

"اتالیق" ایک قسم کے اُمیدواران معلمی ہیں جو یونیورسٹی سے سند حاصل کر چکے ہیں کہ وہ اپنا مضمون پڑھانے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ مگر انہیں تنخواہ کوئی نہیں ملتی۔ اور ان کا گذارہ یا فیس پر ہوتا ہے اور یا اپنی علمی تالیفات وغیرہ پر۔ مگر دونوں آمدنیاں بہت قلیل رہتی ہیں۔

مصارف تعلیم کا یہ طریق عملاً کام نہ دے سکتا۔ اگر علمائے جرمن کفایت شعاری کے نمونے نہ ہوتے۔ انکو جو تنخواہیں یا وظائف سرکار سے ملتے ہیں وُہ ایسے کہ اگر وُہ ہندوستان میں کسی گورنمنٹ کالج کے پروفیسر کو ملیں تو وُہ انہیں نہایت ہی ناکافی سمجھے۔ حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں یورپ بھر میں شہرت حاصل ہو۔ ان کو طلبہ کی فیس سے ضرور آمدنی ہے۔ مگر یہاں فیس کی مقدار اتنی کم ہے۔ کہ تاوقتیکہ کسی پروفیسر کے پاس طلبہ کی کثیر تعداد نہ ہو۔ اس آمدنی سے بھی انہیں کوئی معتد بہ امداد نہیں ملتی۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی۔ تو مجھے دینیات اور فلسفے کے شعبوں میں نصف سال تک لکچر سننے کے لئے بارہ[1] روپے سے زیادہ نہیں دینے پڑے تھے۔ بیشک اس طریق میں یہ فائدہ ہے کہ غریب اور جفاکش طلبہ کے لئے یونیورسٹی کی تعلیم ارزاں ہو جاتی ہے۔

تعلیم بذریعہ لکچروں کے ہوتی ہے۔ جو عموماً گھنٹہ بھر کے ہوتے ہیں۔ ہر لکچر کے بعد ایک وقفہ پندرہ منٹ کا ہوتا ہے۔ تاکہ دماغ دُوسرے مضمون کے لئے تیار ہو جائے۔ اس کے بعد دوسرا لکچر شروع ہوتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ کہ کوئی اُستاد زیادہ سرگرم ہوا۔ یا اپنے مضمون میں ایسا منہمک ہو گیا۔ کہ اپنا وقت ختم ہو جانے کا خیال نہ کر کے برابر تقریر کرتا چلا گیا۔ مگر جب وقت پر لکچر ختم ہو جائے تو طالب علم عموماً یونیورسٹی کی عمارت میں اِدھر اُدھر چہل قدمی کرتے رہتے ہیں۔ یا اگر موسم اچھا ہوتا ہے تو باہر میدان میں ٹہلتے رہتے ہیں۔ اکثر لکچروں کے

[1] ہم یہ صاف طور پر معلوم نہیں کہ اب تک تعلیم کی ارزانی کی یہی کیفیت ہو۔ اگر ہو تو جرمن کی علمی ترقی کا گر یہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ ہندوستان میں ابھی ترقی شروع نہیں ہوئی تھی۔ کہ میلان اسکے برعکس ہو گیا۔ (ایڈیٹر)

نوٹ مفصّل لئے جاتے ہیں۔ اور طالب علم انہیں گھر جاکر یاد کرتا ہے۔ اور بعد میں انکو احتیاط سے مجلد کرا کے رکھتا ہے۔ اُن پروفیسروں کے لکچروں پر خاص توجہ رہتی ہے۔ جنکے ممتحن بننے کی خبر ہوتی ہے۔ ہر طالب علم ایک چمڑے کا بستہ سا رکھتا ہے۔ جس میں اپنے لکچروں کے نوٹ لئے لئے پھرتا ہے۔ اور اس بستے سے آسانی سے شناخت ہو سکتا ہے۔ جو طالب علم محتاط اور کفایت شعار ہوتے ہیں وُہ اپنی دائیں آستین پر ایک سیاہ کپڑے کی آستین نوٹ لکھتے وقت چڑھا لیتے ہیں۔ تاکہ اُن کا کوٹ اور قمیص خراب نہ ہو۔ اگر پروفیسر زیادہ تیز بولتا ہے۔ یا اپنے وقت سے تجاوز کرنے لگتا ہے۔ تو سامعین اپنے پاؤں فرش پر رگڑ کر شور کرتے ہیں اور اس سے اظہار ناراضگی مقصود ہوتا ہے۔

"ہر معمولی پروفیسر کا فرض ہے۔ کہ ہر ٹرم[1] میں ایک سلسلہ عام لکچروں کا بھی جاری رکھے جن کے لئے کوئی فیس نہیں لی جاتی سوائے اس کے کہ سامعین اس سلسلے کے لئے نام درج کراتے وقت اندراج کی قلیل سی فیس دیتے ہیں۔ لیکن طلبہ کی اصل تعلیم "پرائیویٹ" لکچروں کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ جن کے لئے فیس دینی پڑتی ہے۔ گو وہ انہی کمروں میں ہوتے ہیں جن میں عام لکچر۔ ایک تیسری قسم لکچروں کی ہوتی ہے جسے نہایت پرائیویٹ" کہتے ہیں۔ یہ عموماً پروفیسر کے مکان پر ہوتے ہیں۔ اور ان کا منشا زیادہ ہوشیار اور ہونہار طلبہ کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے۔ میں ذاتی تجربے سے یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ بہت مفید ہوتے ہیں۔ ان سبقوں میں تعلیم محض رسمی نہیں ہوتی۔ اور جس مضمون پر بحث ہوتی ہے۔ اُس کے متعلق ایک ماہر فن علامہ سے سوال و جواب کرنا نہ صرف معلومات کو بڑھاتا ہے۔ بلکہ طبیعت کو تیز کرتا ہے۔

یونیورسٹی کے سال میں دو ٹرم ہوتے ہیں۔ سرما کا ٹرم جو اکتوبر سے اپریل تک رہتا ہے۔

---

[1] لفظی معنے میعاد مقررہ۔ اصطلاحاً وہ زمانہ جو یونیورسٹی میں ایک تعطیل اور دُوسری تعطیل کے درمیان گزرتا ہے۔ اور جس میں تعلیم جاری ہوتی ہے۔ (ایڈیٹر)

اور گرما کا ٹرم جولائی سے اگست تک ہوتا ہے۔ موسم بہار کی تعطیل پانچ یا چھ ہفتے کی ہوتی ہے اور موسم خزاں کی تعطیل آٹھ سے دس ہفتے تک کی ہوتی ہے۔

جرمن پروفیسروں کی تنخواہیں گو قلیل ہیں۔ مگر حکومت کی طرف سے تحقیقات کے نتائج کی معقول حوصلہ افزائی ان کے اپنے شوقِ علم سے ملکر یہ نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ کہ وہ اپنے اپنے شعبے کی تحقیقات جدیدہ میں دوسرے ممالک کے علما کی نسبت زیادہ استقلال اور زیادہ عمدگی کے ساتھ مصروف رہتے ہیں کسی اور ملک میں اتنی کثیر جماعت فضلا کی ہمیشہ احاطۂ علم انسانی کے وسیع کرنے کی فکر میں لگی ہوئی نہیں ہے۔ یہ ہر طرح کی تکالیف برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ صرف اتنی بات کے لئے کہ کوئی چیز جو دریافت ہوئی ہے اسکو اچھی طرح پرکھ لیں یا کوئی نئی بات اس پر بڑھا سکیں۔ خواہ وہ کتنی ہی خفیف کیوں نہ ہو۔ جرمن طلبہ میں انہی خوبیوں کی وجہ سے ایک نقص بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ بعض باریک باریک مسئلوں میں جن سے کچھ عملی فایدہ نہیں یا بعض فرضی مسائل میں جنکی حقیقت میں بنیاد نہیں۔ لگ جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی یہ ماننا پڑتا ہے کہ انکو جو خالص محبت علم سے ہے۔ جس میں غرض شامل نہیں۔ اور جو مستقل عزم علمی ترقی کا وہ ہمیشہ رکھتے ہیں۔ ایسے خواص ہیں کہ دنیا کو اُن سے بہت فائدہ پہنچا ہے۔ اور کیا یہی وہ خواص نہیں جنہیں ہم اپنے ہندوستانی نوجوانوں میں پیدا ہوتے اور ترقی پاتے دیکھنا چاہتے ہیں؟ اُن لوگوں میں بھی جو ہندوستان کے صیغۂ تعلیم کی خدمت میں مصروف ہیں۔ کتنے ایسے نکلینگے جو ذراسی زیادہ آمدنی کی اُمید پر فوراً علمی مشاغل کو خیرباد کہہ کر کسی دوسرے صیغے میں جانے کو تیار نہ ہوں۔ حالانکہ اگر حضرت سلیمانؑ کا قول درست ہے "دانش کی قیمت لعل وجواہر سے زیادہ ہے"۔

اگرچہ میں نے یہ بیان کیا ہے کہ انگلستان کی مشہور یونیورسٹیوں کی سوشل زندگی کا جواب جرمنی میں نہیں لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ وہاں کے طلبہ کی زندگی میں سوشل پہلو

بالکل ناپید ہے۔ اُن کا طریق جدا ہے اور اُن کی قومی اغراض کے مطابق ہے۔ مگر وہ بھی لطف سے خالی نہیں۔ رواج قدیم کے باعث سے وہاں کے طلبہ کی جماعت کئی فریقوں پر تقسیم شدہ ہے۔ ایک حصّہ اُن طلبہ کا کسی مجلس کے متعلق ہوتا ہے۔ جیسے انگریزی تعلیم گاہوں کے یونین۔ ہر یونین کی اپنی خاص ٹوپی اور خاص اپنا رنگ ہوتا ہے جس سے شناخت کئے جاتے ہیں۔ ایک یونین فینسنگ بھی شامل ہوتا ہے۔ جس کا ایک حصّہ کوٹ سے ڈھنپا رہتا ہے۔ ان مجالس میں سے بعض میں ڈوئیل[1] کا رواج ہے۔ اچھے خاندان کے طالب علم کے متعلق خصوصاً اگر اُس کا ارادہ فوجی ملازمت کا ہو۔ یہ عام خیال ہے کہ اس کی عزت پر ذرا سی بات سے دھبا آسکتا ہے اور اگر کوئی ذرا بھی اس کے خلاف شان بات کہے تو اُس پر لازم ہے کہ تیغ آبدار سے اُس کا بدلا لے۔ اور اپنے مخالف کو لڑکر فیصلہ کرنے پر مجبور کرے۔ مگر یہ قاعدہ ہے کہ لڑائی ایسی حفاظت سے ہو کہ مخالف کی جان نہ جائے۔ صرف زخم لگانا جائز ہے اور وہ بھی منہ پر۔ اس میں بھی یہ تاکید ہے۔ کہ تلوار کی نوک سے کام نہ لیا جائے۔ بلکہ اس کی دھار سے۔ طلبہ کا یہ فریق عموماً اپنے زخموں پر نازاں ہوتا ہے۔ اور اگر کسی اصلی نزاع کا موقعہ نہ پیش آئے۔ تو ڈوئل کی خاطر جماعتیں قرونِ وسطیٰ کے بہادروں کی طرح ایک دوسرے کو پیغامِ جنگ دیتی ہیں۔ تاکہ یہ رسم قائم رہے۔ تعجب کا مقام ہے کہ قرونِ وسطیٰ کی یہ وحشیانہ رسم اس وقت تک جرمنی کی اعلیٰ درجہ کی یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں اور یورپ بھر میں سب سے بڑی ہوئی قواعد دان فوج میں باقی ہے۔ مگر اب دن بدن گھٹتی جاتی ہے اور غالباً ایک دو پشت کے بعد ڈوئل کا رواج محض ماضی کا فسانہ رہ جائے گا۔

سب یونین اس لڑنے کے رواج میں شامل نہیں۔ مگر سب مع اُن طلبہ کے جو کسی یونین سے متعلق نہیں۔ سوشل میل جول کے لئے "کریپ" میں جاتے ہیں۔ یہاں بیر (جَو کی شراب) کا دور چلتا

---

[1] پرانا دستور جس میں دو آدمی مسلح ہوکر لڑتے ہیں۔

ہے دو ہزار سال سے یا اس سے بھی زیادہ مدت سے بیر اہل جرمنی کی قومی شراب چلی آتی ہے۔ عموماً یہ بہت ہی ہلکی بنائی جاتی ہے۔ اور اسی لئے اس سے کبھی کوئی بدمست نظر نہیں آتا۔ یہاں اس دَور کے ساتھ گیتوں اور لطیفوں کا بھی دَور چلتا ہے اور جن طلبہ میں نظمیں یا ہجویں لکھی ہوں وہ بھی یہاں پڑھی جاتی ہیں۔ کھیلوں میں بعض طالب علم اب تک کھیلتے ہیں۔ بعض تیغ زنی اور دُوسری ورزشیں کرتے ہیں اور چند سالوں سے بعض انگریزی کھیلیں بھی کھیلنے لگے ہیں۔ مثلاً فٹ بال اور کشتی رانی۔ مگر گیند بلا ابھی جرمن میں مقبول نہیں ہوا۔ ان دنوں جرمن طلبہ میں بھی کچھ لوگ "ٹی ٹوٹلر" یعنے شراب سے قطعی پرہیز کرنے والے ہو چلے ہیں۔

جرمن طلبہ کی زندگی کے مذکورہ بالا پہلو کی وجہ سمجھنے کے لئے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہر جرمن نوجوان جو تندرست اور قابل خدمت ہو۔ مجبور ہے کہ مُلک کی فوجی خدمت کچھ عرصے کے لئے کرے۔ بیس برس کی عمر میں اسے پیش ہونا پڑتا ہے۔ اگر یونیورسٹی کا داخلہ پاس کیا ہوا ہو تو اُس کی فوجی خدمت کی میعاد بجائے تین سال کے ایک سال ہوتی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہوتا ہو کہ وُہ اس زمانے کو کسی ایسے مقام میں گذارے جہاں یونیورسٹی ہو۔ تاکہ اس کی تعلیم کا کام بھی جاری رہ سکے۔ اسی لئے یہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ لکچر کے کمرے میں وردی پوش جوان بیٹھے ہیں۔ مگر عموماً اُن کے فرائض ایسے سخت ہوتے ہیں۔ کہ لمبے سے کوچ یا پریشان سے دِن کے بعد اُن میں زیادہ پڑھنے کی ہمت باقی نہیں رہتی جسمانی وبندش کے اس عملی مدرسے سے ہر جرمن کو گذرنا ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے اُس کا جسم مضبوط ہو کر زندگی بھر کے اہم کاموں کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ جن میں انسان کی ساری قوت درکار ہوتی ہے +

ایچ ۔ یو ۔ وائٹ بریخٹ

گلبازی یا گلباری

یوں تو ہر ملک کے میلے اور تماشے اپنی اپنی جگہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ اور کونسا آباد ملک ہے جو ایسی دلچسپیوں سے خالی ہے۔ مگر چند ہفتے ہوئے مجھے بولون علاقہ فرانس میں ایک نہایت اُجلا میلا نظر آیا۔ جس میں اہلِ شہر نے کمال نفاست مذاق سے کام لیا تھا۔ اور جسے دیکھنا شمالی فرانس کی زندگی کے ایک نادر پہلو کو دیکھنا تھا۔ اس کے فرانسیسی نام کا لفظی ترجمہ تو "پھولوں کی لڑائی" ہے۔ مگر چونکہ اس میں ایک پرانے ایشیائی کھیل کا اصول موجود ہے۔ اس لئے ہم اسے "گل بازی" کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جس کثرت سے اس میں دو گھنٹے تک پھول برسائے گئے۔ اگر اس کثرت کو ملحوظ رکھیں۔ تو اُسے گلباری کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

بولون شمالی فرانس کے اُن مقامات میں سے ہے۔ جہاں لوگ جولائی اور اگست کے مہینوں میں گرمی بسر کرنے جاتے ہیں۔ نہ صرف قُرب و جوار کے فرانسیسی آتے ہیں۔ بلکہ پیرس تک سے لوگ سمندر کے ساحل کی کشش سے کھنچے آتے ہیں۔ گو ساحل کی زندگی کا شوق فرانس میں اُس درجے پر نہیں ہے۔ جس پر انگلستان میں۔ بولون چونکہ انگلستان کے ساحلِ جنوبی کے مقابل واقع ہے۔ اس لئے انگریز بھی اس موسم میں کثیر تعداد میں بولون کی رونق کو بڑھاتے ہیں۔ وہ ہے بھی مزے کی بات فوکسٹن سے ساحل پر کھڑے ہو کر دیکھو تو بولون نظر آتا ہے۔ جہاز پر سوار ہو جاؤ تو رودبار عبور کر کے گھنٹے سوا گھنٹے میں بولون آ سکتے ہو۔ ادھر ریلوے اور جہاز کی کمپنیاں خلقت کا رجوع دیکھ کر کرایہ بھی کم کر دیتی ہیں۔ اور اس تخفیف سے ہر دل میں

اُمنگ اُٹھتی ہے۔ کہ ذرا سی ہمت اور تھوڑے سے خرچ سے ایک نئی سرزمین دیکھی جا سکتی ہے۔ کیوں نہ دیکھ لیں۔ بس ایک سیل سا اُمنڈ آتا ہے۔ جدھر جاؤ۔ انگریزی اور فرانسیسی کی آواز ملی ہوئی کان میں پڑتی ہے۔ انگریز زباندانی میں ممتاز نہیں۔ اس لئے باوجود صدیوں کی ہمسائگی اور کثرتِ آمد و رفت کے اور باوجودیکہ اکثر مدارس انگلستان میں فرانسیسی سبقاً پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے بولنے سے عاری ہیں۔ اور اگر بولنے بھی لگیں تو چند فقروں سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اور اس میں بھی تلفظ کی غلطی عام سی بات ہے۔ مگر خیر فرانسیسی دکاندار بھی اپنی زبان کے قتلِ عام کا بدلا انگریزوں سے لئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ بھی دوکان پر لکھ رکھتے ہیں "یہاں انگریزی بولی جاتی ہے" تاکہ انگریزی بولنے والا گاہک آئے اور جب آتا ہے تو عموماً جیسی اُس کی فرانسیسی ہوتی ہے ویسی اِن کی انگریزی۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد کام تو چل جاتا ہے۔ مگر انسان خود فریقین میں نہ ہو تو دور سے اس تماشے کا دیکھنا لطف خاص رکھتا ہے۔ فرانسیسی آدمی جہاں الفاظ جواب دیتے ہیں۔ حرکات سے کام لیتا ہے۔ اور اثنائے گفتگو میں اُس کے شانے بیحد ہلتے ہیں اور انگریز جوں جوں تنتنے یا سمجھانے میں رہتا ہے گھبراتا ہے۔ مگر ہم گلہاری سے دور رہے جاتے ہیں۔

گلہاری میں سب شریک ہوتے ہیں۔ مسافر اور مقیم۔ انگلستان سے آتے ہوئے مہمان اور فرانس کے اہلِ وطن۔ بوڑھے اور جوان۔ عورتیں اور بچے۔ بانکے چھیلے اور سیدھے سادے کون ہے جو احاطے کے اندر داخلے کے چند پیسے دے سکتا ہے اور نہیں جاتا۔ عین کنارے پر ایک تماشاگاہ ہے۔ جس کے متعلق ایک باغیچہ ہے۔ وہی باغیچہ اس دفعہ اس میلے کے لئے مقرر تھا۔ کئی دن پہلے سے تیار ہا تھیں۔ اس کی روشیں رستہ کی گرد تھیں ... روشوں کے دونوں طرف نشست کا سامان تھا۔ ایک طرف اُونچے اُونچے عارضی چبوترے تھے ممتاز لوگ جو مدعو تھے یا جنہوں نے زیادہ قیمتی ٹکٹ خریدے تھے۔ بیٹھ سکیں دوسری طرف

صرف پنج آنہ ہیں تین کرسیاں - جن پر اُن سے کم قیمت ٹکٹ لیکر لوگ بیٹھ سکیں - صبح سے
گلدستوں کی دکانیں غیر معمولی طور پر پھولوں سے پُر نظر آنے لگیں - اور دوپہر کے بعد
اُس باغیچے کے قریب بھیڑ بھاڑ شروع ہو گئی - اور اس کی سڑک پر دکانوں کی قطاریں ہندوستان
کے میلوں کی طرح لگ گئیں - چار بجے اصل تماشا شروع ہوا - تمام نشستیں تماشائیوں سے
پُر تھیں اور اُن کے سوا ایک بڑی تعداد ایسے تماشائیوں کی تھی - جو صرف داخلہ ٹکٹ
لیتے تھے اور انہیں میلے کے رستے میں چلنے پھرنے کی اجازت تھی - مگر اُن کے لئے بیٹھنے
کا کوئی انتظام نہ تھا - سب تماشائی پھولوں سے جھولیاں بھرے ہوئے تھے - "گو جھولی"
بجائے تھے یا روپے کی جھولی کے کاغذ کی جھولی تھی - و بعض زیادہ دولتمند لوگ نہایت
خوشنما اور قیمتی گلدستے لئے کھڑے تھے - کہ اتنے میں سواریٔ گُل کی آمد آمد ہوئی - تحسین گُل کا شور
اُٹھا اور سب اُس طرف متوجہ ہو گئے -

سب سے آگے ایک گاڑی تھی - ہمہ تن گُل - گھوڑا تو سر سے پاؤں تک پھولوں سے سجا ہوا -
پیچھے پھولوں سے لدے ہوئے پشت ایک تختۂ گُل - اور وسط میں ایک خوبصورت لڑکی پھولوں کی
پوشاک اندر پھول - باہر پھول - اس میں ایک عزیز فرانسیسی لیڈی ایک پھول سے بنے دستہ
لئے بیٹھی تھی - چہرے پر باریک پھولدار نقاب - ٹوپی پر پھول اور تکیے پر پھولوں کی چادر -
اس پر پھول برسنے شروع ہوئے - دونوں طرف سے بوچھاڑ ہوتی تھی اور وہ ایک ہاتھ سے گھوڑے
کی باگ تھامے ہوئے ایک ہاتھ سے سب کو جواب دیتی جاتی تھی - اس گاڑی کے پیچھے ایک دوسری
گاڑی تھی - جس کی سجاوٹ اس سے کچھ کم نہ تھی - صرف رنگ آمیزی میں فرق تھا - ہر گاڑی کی
سجاوٹ میں ہر کسی نے اپنے اپنے مرغوب رنگ لگائے تھے اور اپنی پسند کے گُل کھلائے تھے -
اس میں چار لڑنے والیاں تھیں اور گھوڑے کی باگ کوچوان سنبھالے ہوئے تھا - جسے صف گُل
میں بیٹھنے کا انعام برابر مل رہا تھا - کئی دل لگی باز نشانہ اُڑاتے تھے اور وہ جواب نہیں لیتا

تھا۔ سر جھکائے ہوئے گاڑی ہانکتا جاتا تھا۔ اس گاڑی کا چبوتروں کے سامنے آنا تھا۔ کہ
چونکھی لڑائی ہونے لگی۔ لوگ ہزاروں تھے تو کیا ہوا۔ یہ چار چنچل نارتھیں۔ ان سے کون
بازی جیت سکتا تھا۔ جس طرف سے پھول آتا تھا۔ اسی طرف جواب جاتا تھا۔ کوئی گلدستہ
پھینکتا تھا تو ادھر سے بھی فی الفور اسی پر بوچھاڑ ہوتی تھی۔ کسی کا وار خالی گیا۔ تو یار لوگ
ہنس دیئے۔ کسی نے تاک کر پھول مارا۔ تو واہ وا ہوئی۔ ان کے پیچھے ایک اور سواری تھی
جس میں اس پرانی رسم پر بیسویں صدی کا پیوند لگایا گیا تھا۔ یعنی موٹر کار۔ اسی طرح پھولوں
سے لدی ہوئی۔ اس میں مرد اور عورتیں دونو سوار تھے اور چلانے والے کے سوا سب
ہاتھ چلا رہے تھے۔ ایک گاڑی آئی جس میں بہت سے بچے تھے۔ ان کا آنا چھوٹے بڑے
سب کے لئے اشارہ تھا کہ "بس پڑو" خصوصاً ہم عمروں سے ان کی خوب ٹھنی تھی۔ ان کے
پیچھے ایک اور گاڑی آئی۔ جس میں ایک زندہ دل بوڑھا اپنی بڑھیا کو لئے جلوس گل میں شامل
ہو لیا تھا۔ کوئی نہ کوئی خدا ترس ان کی طرف بھی پھول پھینک دیتا تھا اور یہ بھی بہت کشادہ
دلی سے پھول برسائے جاتے تھے۔ مگر عام دلچسپی اس گاڑی سے بہت کم تھی۔ وہ جشن عجب
کو یہ سبق ملتا تھا۔ کہ ایسے کھیل ایک خاص وقت تک ہی موزوں ہیں۔ اور جیتے جی ہی وہ [illegible]
آ جاتا ہے۔ جب زندگی کی بہت سی خوشیوں کو خیرباد کہنا ہوتا ہے۔ اسی طرح اور سواریاں
تھیں جن میں ہر شخص نے اپنی توفیق اور شوق کے مطابق سجاوٹ کی تھی اور یہ قطار [illegible]
کے گرد چکر میں چلتی تھی اور وسط صحن میں باجا بجتا تھا۔ چھ بجے تک یہ چکر جاری رہا آخر کب
تک چلتا۔ ہر انسانی خوشی محدود ہے۔ اور کیسی ہی پر لطف کیوں نہ ہو آدمی خود [illegible]

اس دو گھنٹے کے عرصے میں کئی پھولوں کی جھولیاں بار بار خالی ہوئیں اور [illegible]
پھول والے ٹوکرے بھرے بیٹھے تھے میلے کے ختم ہونے سے پہلے سب بک گئے [illegible]
گاڑیوں میں کئی کئی دفعہ پھولوں کے نئے ذخیرے کی مانگ ہوئی۔ مگر کتنا ہی بڑا خزانہ [illegible]

ہاتھ سے لٹایا جاوے۔ تو کہاں تک ساتھ دیگا۔ آخر پھول ختم ہو چلے۔ گھڑیال نے بھی آواز دی
کہ جشن کے لئے وقت کے اہلِ قانون نے جتنے منٹ اور جتنے ثانیے فیاضی سے عطا کئے
تھے۔ سب ہو لئے۔ ہاتھ جو برابر مصروفِ ورزش رہے۔ تھکے پکار اٹھے کہ اب استراحت
درکار ہے۔ گھوڑے چکر لگاتے لگاتے تھک گئے۔ وہ فطرتِ انسانی کا مجموعہ جو انبوہِ
تماشائیاں میں نمودار تھا۔ اپنی تغیر پسندی کا ثبوت دینے لگا۔ تماشائی ایک ایک دو دو کرکے
کھسکنے لگے۔ اور آخر پھولوں والی گاڑیاں جس ترتیب سے آئی تھیں۔ اسی ترتیب سے قطار
باندھے ایک بیرونی چکر سے گھوم کر باہر نکل کر چل نکلیں۔ گاؤں کے بالاخانوں پر ان
واپسی کے دیکھنے کے لئے ہجوم ہوگیا۔ کہیں کہیں سے پھول بھی برسے۔ مگر تھوڑی دور جاکر
یہ قطار منتشر ہوگئی اور ہر ایک نے اپنا اپنا راستہ لیا۔

جب اس میلے کو دیکھ کر آیا۔ تو ایک ہجومِ خیال ساتھ لایا۔ گل باری کی پہلی جھلک دیکھی تو
خیال آیا کہ کیا اچھا ہو اگر کوئی ملک ایسا ہو جہاں روز اسی طرح پھول برسا کریں۔ میلے
کے ختم ہونے کی کیفیت دیکھی تو اس خیال کی اصلاح کی کہ پھول برسنے کا لطف ہی جاتا رہے
اگر روز یہ سامان میسر ہو۔ میلے کی بے تکلفی نے اپنے ملک کی ہولی یاد دلائی۔ عجب نہیں کہ
ہندوستان کے اس تہوار کے بانیوں نے ایسی ہی بے ضرر دل لگی اور چہل پہل کے لئے
ہولی کی رسم جاری کی ہوگی۔ اور مصفا آبِ گلرنگ ایک دوسرے پر چھڑکنا ابتدائی
دستور ہوگا۔ مگر حضرتِ انسان کہیں ایک بات پر قرار پکڑتے ہیں۔ ایک ستم ایجاد ہیں۔
وہ وہ ایجادیں اس رنگ میں کیں۔ کہ ہولی کو ہوا بنا دیا۔ مزاج تغیر پسند تو قدرتاً واقع
ہوا ہے۔ فرق صرف یہ ہوا۔ کہ دنیا کے مغربی حصے میں گذشتہ چند صدیاں اس تغیر کی
نذر ہوئیں جسے ترقی کہتے ہیں اور ہم اس تغیر کی طرف مائل رہے جس کا نام ترقی معکوس
ہے۔ میں نے انگریزوں کو فرانسیسیوں کے گروہ میں دیکھا۔ تو خیال کیا کہ برابر کے جوڑ

ہیں۔ جبھی تو ان دنوں میل ملاپ ہو رہا ہے۔ صدیوں کی لڑائی اور مخالفت کے بعد ایک کے دل میں دوسرے کی وقعت پیدا ہو گئی ہے اور دونوں نے محسوس کیا ہے کہ ناحق لڑنے جھگڑنے سے بہتر ہے کہ دونو ہمسایہ قومیں صلح سے رہیں اور باہمی موافقت سے دونو دنیا میں اپنا رعب بڑھائیں اور ایک دوسرے پر گولہ باری کرنے کی بجائے ایسے جلسوں میں جمع ہو کر ایک دوسرے پر گل باری کریں۔ اس بھیڑ بھاڑ میں اپنی طرف خیال گیا۔ اس مجمع اغیار میں ایک میں اور ایک میرا رفیق دو ہندوستانی تھے۔ سوچا کہ ہم کیا ہیں اور کہاں ہیں۔ ع۔ مثلِ گل بازی نہ ادھر کے نہ ادھر کے۔ ہم پر کیا موقوف۔ جاپان کو چھوڑ کر ساری ایشیائی قومیں اقوامِ یورپ کے ہاتھ میں گل بازی بنی ہوتی ہیں۔ وہ جو سلوک چاہیں کریں۔ ہاں اگر اپنی گلوں میں قوتِ اجتماع پیدا ہو جائے۔ تو شاید ادھر اُدھر پھینکے جانے سے محفوظ ہو جائیں۔ فرانس اور انگلستان کی مصالحت آج سے دس برس پہلے کون باور کر سکتا تھا کہ ممکن ہوگی۔ اسکو دیکھ کر سعدیؒ کا قول یاد آیا۔ کہ "ختن و ختا صلح کردند۔ اما زید و عمرو را ہنوز خصومت باقیست"۔ فرانس اور انگلستان جیسے صدیوں کے دشمن ملاپ میں اور ہم ہندوستانی ہندو مسلمانوں کے ملاپ کو ترسا کریں۔ ؎

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

اطالیہ

اٹلی کے حالات کے متعلق مندرجہ ذیل دلچسپ مضمون ہمارے کرم فرما پنڈت [illegible] صاحب [illegible] پنجاب نے عنایت کیا ہے صاحب موصوف اس دفعہ بحیثیت کانگریس ڈیپوٹیشن کے ممبر ہونے کے یورپ میں تشریف لے گئے تھے۔ وہ سرزمین اٹلی میں انہوں نے لندن جاتے ہوئے زیارت کی۔ انہیں اس ملک کے تاریخی حالات کا عرصے سے شوق ہے۔ چنانچہ انہوں نے ناموران اٹلی میں دو کی سوانح عمریاں لکھی ہیں اس لئے اٹلی پر مضمون لکھنے اور ان کے واقعات سے بحث دینے والے نتائج نکالنے کا انہیں خاص حق ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مضمون نہایت شوق سے پڑھا جائیگا۔

یوروپین ممالک میں اگر کوئی ملک ایسا ہے جو آب و ہوا اور اپنے باشندوں کے عادات و خصائل میں ہمارے وطن سے بمقابلہ دیگر ممالک کے زیادہ مشابہت رکھتا ہے تو وہ ملک اطالیہ ہے۔ ہندوستان اور اطالیہ کے نقشوں کے مقابلہ کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ شکل و صورت میں بھی دونوں ملک بہت کچھ ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان بہت بڑا ہے جس میں آبادی ۳۰ کروڑ کے قریب ہے اور اٹلی بہت چھوٹا ہے جس کی آبادی محض ۳۶ لاکھ کے قریب ہے۔ خالق کائنات نے دونوں کو ایسی عالیشان اور ظاہرا ناقابل گذر چھتیں عنایت کی ہیں کہ اپنے اپنے براعظم میں بلندی اور خوبصورتی میں اپنا آپ ہی نظیر ہیں۔ ہندوستان کی چھت تو دنیا میں سب سے بلند اور لاثانی ہے۔ مگر اطالیہ کی چھت بھی یورپ میں سب سے اونچی اور بے نظیر ہے۔ ہندوستان کو سلسلہ ہمالیہ عین وسط میں مشرق سے مغرب کی جانب چیرتا ہے۔ اطالیہ کو کوہ ایپی نائینس شمالاً جنوباً گذرتا ہوا دو

ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

علاوہ ان قدرتی کششوں کے جو ہم کو اطالیہ اور اہل اطالیہ کی طرف کھینچتی ہیں یہ بھی باور ہے کہ شاید دُنیا میں کسی مُلک نے انسانی تماشاگاہ پر اس قدر کروٹیں نہیں لیں۔ اور اس قدر رنگ نہیں بدلے جیسے اطالیہ نے تاریخی تغیرات میں جس قسم کے گوناگون سین اطالیہ نے دکھائے اور جیسے رنگا رنگ کے پردے اُس نے بدلے ہیں وہ سب اس درجہ پُر سبق اور دلکش ہیں کہ پڑھا لکھا انسان بے اختیار اطالیہ کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ یہ وہ مُلک ہے جس نے دو بار انسانی تاریخ میں "ملکہ جہان" (کوئین اف دی ورلڈ) کا خطاب حاصل کیا۔ ایک وقت تھا کہ دُنیا رومن سلطنت کا سکہ مانتی تھی اور چار دانگ عالم میں رومن رعب اب رومن تلوار اور رومن حکومت کا زور شور تھا۔ سارا یورپ اور قریبًا سارا شرقی ایشیا اور کل شمالی افریقہ اہلِ روما کے باجگذار تھے۔

ان علاقوں میں کوئی سپاہ دار نہ تھا جس کو روما کے سپاہیوں نے پچھاڑا نہ ہو۔ کوئی تاجدار نہ تھا جس کو مطیع کر کے سرنگوں نہ کیا ہو۔ رومن شاہنشاہ کے تاج میں اتنے شاہی نگین تھے جو کسی سے شمار نہ ہو سکتے تھے۔ اُس کے چاکروں کی صف میں اتنے حکمران کمربستہ رہتے تھے کہ جنکی گنتی نہ ہو سکتی تھی۔ رُوم کے تخت پر ایسے بھی بادشاہ بیٹھ چکے ہیں جو گھوڑے پر سواری کرنے کے وقت دیگر مطیع شدہ فرمانروایان کی گردن پر پاؤں رکھ کر سوار ہوتے تھے۔ ایک وقت تھا کہ روما کی سلطنت جمہوری اپنے جوبن پر تھی۔ دُنیاوی جاہ و حشمت اور سلطنت میں دُور دراز علاقوں پر حکومت کرتی تھی اور [illegible] کی حفاظت اور علم و فضل کی اشاعت و ترقی میں نامور تھی۔ [illegible] کے گھمنڈ اور بادشاہت کے زعم اور تہذیب کی شیخی [illegible] دُوسرے ممالک کے فرماں روایان اور رعایا پر کی [illegible]

اور باہمی خانہ جنگیوں اور گھر کے جھگڑوں اور لیڈروں کے حسد و نفاق و بغض و کینہ کی سزا پوری پوری بھگتنی پڑی۔ اور جو ابھی تھوڑا عرصہ پہلے زیر تھے وہ زبر ہو گئے۔ اس عرصے میں اطالیہ (روم اطالیہ کا دار الخلافہ ہے) کئی دفعہ لوٹا گیا۔ اور جلایا گیا۔ سچ پوچھو تو انسانی غرور اور تکبر کی بھی حد ہے۔ جب کسی نے حد سے تجاوز کیا منہ کے بل گرا۔ جس وقت اطالیہ اپنے تہذیب کے پروں پر پرواز کر رہا تھا، وہ دُنیا میں جو ناگفتہ بہ سامان عیش و عشرت میں اُن کی زور، زر لہروں میں بہا دیتا تھا۔ اُسی وقت قدرت نے ایسا تھپیڑا لگایا کہ حضرات روما کو ساری تہذیب اور سارا عیش و طرب بھول گیا۔ اس کے بعد پھر ایک اور زمانہ آیا جب کہ روما نے ایک نیا بھیس بھرا۔ اور اس دفعہ دنیاوی تہذیب اور دنیاوی عظمت کو چھوڑ کر دینی حکومت اور دینی اقتدار کا سوانگ رچا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب روما کا پوپ یورپ کے تخت و تاج بخشنے اور چھین لینے کے اختیار وسیع رکھتا تھا۔ کسی کو مجال نہ تھی کہ اُس کے فیصلے کے خلاف چون و چرا کرے۔ کسی کو جرأت نہ تھی کہ اُس کی حکم عدولی کرے۔ پوپ کی تحریر گویا تقدیر کا لکھا تھا۔ یورپ کی جملہ سلطنتیں روم کے نام سے کانپتی تھیں۔ سارا یورپ روم کے آواز کے نیچے تھا۔ تمام بادشاہی خزانے اور تمام افواج روم کی وضعداری اور اُس کے جلوس کی رونق بڑھانے کے لئے ہر وقت موجود تھیں۔ یہ وہ شان تھی کہ ایک دفعہ تو انسان کا دل ہل جاتا تھا۔ یہ وہ اقتدار تھا کہ جس کے سامنے نہ کسی بادشاہ کی مجال تھی اور نہ کسی رعایا کو سر ہلانے کی گنجائش۔ آخر اس کا بھی انجام آ پہنچا اور جرمن میں ایک غریب سے مُلّا (مارٹن لیوتھر) نے جھنجھلا کر اس طرح حضرت پوپ کی عالیشان عمارت کو ہلا دیا کہ بنیادوں تک جنبش کھا گئیں۔ پوپ کے دینی رُعب داب کا کم ہونا تھا کہ اطالیہ کا پولٹیکل آفتاب بھی مدھم پڑ گیا۔ اور آخری نتیجہ یہ ہوا کہ اردگرد کی طاقتوں نے موقعہ پا کر ملک کے مختلف حصے دبا لئے اور اپنے اپنے

بھائی بندوں کو سونپ کر ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

ایک چھوٹا سا ملک اور اُس میں کئی شاہی خاندان حکومت کرنے لگے۔ جنوبی حصہ سسلی کا تخت علیحدہ نیپلز کا علیحدہ۔ ٹسکنی کا علیحدہ۔ پیڈمانٹ کا جُدا۔ فلارنس کا جُدا۔ ان سب کے علاوہ خاص روم میں حضرت پوپ علیحدہ اپنی ڈھائی چاول کی کھچڑی پکاتے رہے۔ طرفہ یہ کہ یہ مختلف حصص مختلف طاقتوں کے زیر سایہ تھے۔ بعض فرانس کے بعض آسٹریا کے بعض اسپین کے اور بعض خود مختار۔ ایسی حالت میں رعایا کی جو حالت ہو سکتی ہے اور ہوئی اُس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہمارے ہموطنوں کو ان سب حالتوں کا اسقدر تجربہ ہے کہ یقیناً اُن کے سامنے اُس ذلّت و نکبت کا نقشہ کھینچنے کی ضرورت نہیں۔ جو ایسی صورت میں محکوم رعایا کے لاحق حال ہوتی ہے۔ آخر قدرت نے پھر ایک پلٹا دینے کی ضرورت محسوس کی۔ اور اہل ملک و مختلف فرمان روایان کے مابین باقاعدہ شطرنج کی بازی جم گئی۔ طرفین سے کشت پر کشت پڑنے لگیں۔ کئی دفعہ بازی ختم ہونے کو آئی مگر آخر حکمران حضرات کو کوئی نہ کوئی راستہ ملتا رہا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ یہ بازی بہت مدت تک لگی رہی۔ رعایا نے علانیہ خفیہ مختلف طریقوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بہت جدوجہد کی۔ اِدھر حکمراں فرمان روایان نے اپنی طاقت و حکومت کے برقرار رکھنے میں کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھی۔ قریباً ایک صدی تک یہ نقشہ جارہا۔ ملک میں کتنی ہی خفیہ سوسائٹیاں قائم ہو گئیں۔ اہلِ قلم نے اپنی جودت طبع آزادی کے خیالات کی اشاعت میں صرف کی شعلہ و رانے بھی ملک کو اُبھارنے اور طبیعتوں کو جوش دینے کے لئے دیگر ہمدردانِ ملک کا ہاتھ بٹایا۔ حتّٰی کہ جون سنہ ۱۸۰۵ء میں اطالیہ کے ایک اکڑکی چاہتی خاتون نے ایک بچہ جنا جس کے ماتھے پر اطالیہ اتفاق اور اطالیہ کی آزادی کے نقش پلٹے گئے۔ یہ شخص جوزف میزینی تھا جس کو اٹالین اتفاق کا پیغمبر اور اٹالین آزادی کا رسول کیا جاتا ہے۔ ہمارا یہ منشا نہیں

ہے کہ ہم اس وقت اس شخص کی زندگی کے واقعات قلمبند کریں۔ گو ہمیں یقین ہے کہ وُہ حالات نہایت دلچسپ اور پر معنے ہیں۔ تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس شخص کی تعلیم و تلقین اور اس کی فنا فی القوم زندگی نے اطالیہ کے پولٹیکل شطرنج کا نقشہ بدل دیا۔ اس شخص کا جوان ہونا تھا کہ کھیل گرم ہوگیا اور چاروں طرف سے انقلاب انقلاب کی آواز آنے لگی۔ چاروں طرف سے زبانی تحریک و تحریری کوشش کی امداد میں ہتھیار چلنے شروع ہو گئے۔ یہ تمام کوششیں شاید بار آور نہ ہوتیں اگر خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک جوانمرد جس نے میزینی کی شاگردی میں اٹالین اتفاق اور اٹالین آزادی کی تعلیم پائی تھی۔ اہل اطالیہ کی سرداری کے لئے کھڑا نہ ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ خداوند کریم ہمیشہ ضرورت کے وقت اپنے برگزیدہ بندوں میں سے کسی نہ کسی کو اپنی خلق کی امداد کے لئے بھیجتا رہتا ہے۔ یہ شخص جس نے اپنی تلوار اور اپنی دلیری اور جانبازی سے اہل اطالیہ کے بند کاٹے۔ اور غیر قوم کے حکمران خاندان کو نیچا دکھا کر ملک سے باہر کر دیا۔ گیری بالڈی تھا جو آج اہل اطالیہ کا سب سے پیارا اور سب سے چاہتا ہیرو ہے۔ اگر یورپ میں کسی شخص نے تاج اور تخت چھین کر بخش دیئے اور ملک فتح کر کے دوسرے کو دیدیئے تو وُہ گیری بالڈی تھا جس نے شاہ میلان کو اطالیہ کا بادشاہ بنایا اور سارے ملک میں قومی حکومت قائم کی۔ انصاف سے بعید ہوگا اگر ہم اس موقعہ پر اُس وزیر باتدبیر کا ذکر خیر نہ کریں۔ جس کی تدبیر و دانائی نے گیری بالڈی کی شجاعت کو پُوری کامیابی کا مُنہہ دکھایا۔

ہمارا اشارہ کونٹ کیور کی طرف ہے جو شاہ پیڈمانٹ کا وزیر اعظم تھا اور جس کے تدبر و تدبیر و حکمت عملی کا آج سارا یورپ قائل ہے۔ اس عقلمند بادشاہ (وکٹر ایمونیل) کی دانائی بھی کم سراہنے کے قابل نہیں ہے۔ گو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان چاروں بزرگوں میں سے اوّل الذکر دو خاص عزت کے قابل ہیں کیونکہ زیادہ تر انقلاب کا بوجھ اُن پر پڑا۔ اُنہوں نے

سخت سے سخت مصائب کا مقابلہ کیا۔ اپنی جان جوکھوں میں ڈالی۔ مدت تک جلاوطن رہے۔ ناگفتنی عذاب اٹھائیے۔ مگر وطن کی محبت اور آزادی کی چاہ میں کبھی کمی نہ آنے دی۔ آج اٹلی اور اہل اٹلی ان دونوں بزرگان قوم کے نام پر فدا ہیں۔ جگہ جگہ اُن کے بُت ایستادہ کیئے گئے ہیں اور کیئے جا رہے ہیں۔ جگہ جگہ ان کی یادگاریں بنائی گئیں ہیں اور بنائی جا رہی ہیں۔ شہر شہر میں گلی کوچے۔ چوک اور محلے بازار اور گذرگاہیں اُن کے نام سے موسوم ہیں۔ روم میں سب سے بلندی پر اور سب سے عمدہ موقعہ پر گیری بالڈی کا بُت ہے جس کو اُستاد نے اسی طرح نصب کیا ہے کہ مرحوم جنرل کی نظر ہمیشہ پوپ کے محلات کی طرف رہتی ہے۔ جس سے کاریگر نے یہ ظاہر کیا کہ جب تک اہل ملک پوپ کے محلات پر قابو نہیں پاتے اُن کو پورا امن نصیب نہیں ہو سکتا۔

میلان میں جو اٹلی کے آزاد ہونے سے پہلے شاہ وکٹر ایمونیل کا دارالسلطنت تھا کیور کا بت ہے

اٹلی میں روم۔ نیپلیز۔ میلان۔ جنوا اور فلارنس قابل دید شہر ہیں۔ اوّل الذکر شہر دارالخلافہ ہے۔ اس شہر میں ایک حصہ جس میں پوپ کے محلات واقع ہیں۔ پوپ کے تسلط میں ہے اور اس حصے میں پوپ کو اختیارات کامل حاصل ہیں گویا ایک شہر میں دو بادشاہیاں ہیں۔ اس حصے میں سینٹ پیٹر کا گرجا ہے جو ایک قدیم بُت خانے کی جگہ پر بنایا گیا ہے۔ اس گرجے کے سامنے دو بُت ایستادہ ہیں جن میں سے ایک سینٹ پیٹر کا اور دوسرا سینٹ پال کا ہے۔ اوّل الذکر کے ہاتھ میں بہشت کی کنجی ہے اور آخر الذکر کے ہاتھ میں دین کی تلوار ہے۔ روم میں بہت بڑے بڑے عالیشان گرجے ہیں مگر سینٹ پیٹر کا گرجا خاص پوپ کا گرجا ہے اور اپنی شان۔ آراستگی اور خوبصورتی میں دنیا میں لاثانی ہے۔ پوپ کا مذہب کسی طرح بُت پرستوں سے مختلف نہیں ہے۔ ان گرجاؤں میں حضرت عیسیٰ۔ اُن کی والدہ مریم کے بُت اور حواریوں ولیوں اور شہیدوں کی قبریں اور اُن کے بُت پوجے جاتے ہیں۔ اور ان پر چڑھاوے چڑھائے

جاتے ہیں۔ منتیں مانی جاتی ہیں۔ چراغ روشن کئے جاتے ہیں۔ دھوپ جلائی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ
بہت سے گرجے سابقہ مندروں کو گرا کر بنائے گئے ہیں۔ پرانے بُت توڑ کر عیسائی تصاویر اور
عیسائی بُت رکھ دیئے گئے ہیں۔ اس شہر کا ہر ایک حصہ انسان کے لئے عبرت سے بھرا ہوا ہے
قدیم سلطنت روما کے آثار صنادید قدم قدم پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ میلوں تک
زیرزمین مکانات۔ قبریں اور پرانے محل کھودے جا رہے ہیں اور پرانی عظمت اور تہذیب
اور شان کو یاد دلا رہے ہیں۔ ان زیر زمین کھنڈرات میں جا کر بے اختیار خدا کی خدائی
یاد آتی ہے اور سخت سے سخت منکر خدا کو بھی ایک پروردگار کی ہستی کا قائل ہونا پڑتا ہے
ان کھنڈرات میں عیسائی پادری چراغوں کی روشنی میں لوگوں کو ابتدائی زمانہ کے عیسائیوں
کے مکانات ان کی قبریں اور اُن کی عبادت گاہیں دکھاتے ہیں۔ اور یہ بتاتے ہیں کہ
کس طرح وہ لوگ اپنے دین کی حفاظت میں اور اپنے ایمان کی خاطر شہید ہوئے۔ ہائے افسوس!
ہر نئی عمارت کا بنانے والا یہ بھول جاتا ہے کہ اُس کی اپنی بنائی ہوئی عمارت کتنے بندگانِ
خدا کی نعشوں پر کھڑی ہے۔ اور کتنوں کے خون سے تعمیر کی گئی ہے۔ اور جن باتوں کا وہ
دوسروں کو جوابدہ ٹھہراتا ہے وہ اس سے خود بھی کس حد تک سرزد ہوئی ہیں۔

اٹلی میں دو زبردست آتش خیز پہاڑ ہیں۔ کوہ اٹنا اور کوہ وسوویس یہ دونوں
خونخوار پہاڑ وقتاً فوقتاً اہل روما کے زعم کو توڑتے رہے ہیں۔ دو ہزار برس کے قریب عرصہ گذرا
جب سلطنت روم اور رومن تہذیب اپنے جوبن پر تھیں اُس وقت ویسوویس نے خدا کے
غضب کی شکل اختیار کی اور اٹلی کے ایک نہایت عظیم الشان شہر کو اپنی راکھ کے نیچے دفن
کر دیا۔ لوگ بستروں سے اُٹھنے نہیں پائے تھے کہ شعلوں سے دب کر فنا ہو گئے۔ یہ مقام اب
کھودا جا رہا ہے اور اُس میں سے عالیشان مکانات کے کھنڈرات۔ بُت۔ مندر۔ سرکاری
عمارتیں اور دیگر مختلف سامانِ معاشرت و تہذیب نکل رہے ہیں۔

ان کھنڈرات میں سے بعض نعشیں ایسی ملی ہیں جن کا جسم گو پتھرا گیا ہے مگر جن کے دانت اور ہڈیاں بجنسہٖ اصل شکل میں اب تک موجود ہیں۔

ایک موقعہ پر ایک ماں بیٹی سوئی ہوئی نکلیں۔ ایک دوسرے موقعہ پر عاشق اور معشوق ہمکنار نکلے بہت سے جانوروں کے پنجر نکلے۔ ان کھنڈرات کو دیکھنے سے اور اُن میں سے جو اشیاء برآمد ہوئی ہیں اُن کا ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے کی تہذیب پر اُس زمانے کے لوگوں کا ناز کرنا کیسا فضول ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں تہذیب ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ صرف تفاوت اس قدر ہے کہ یہ درخت جگہ بدلتا رہتا ہے ✦

لاجپت رائے

غزل

شفا سے کیا غرض اے چارہ گر بیمارِ جاناں کو
مجھے یہ درد ہی اچھا ہے رہنے دیجیو درماں کو

جلایا ہے وہ خرمن آپ کی برقِ تبسم نے
کہ حسرت جس پہ گرنے کی رہی ہر برقِ تاباں کو

بلا کے من چلے مردانِ میدانِ جنوں دیکھو
کیا آباد جا کر کوہ کو صحرا کو زنداں کو

سیہ مستی ہے ان میں بھی ترے گیسوئے سرکش کی
کوئی دیکھے ترے سودائیانِ پابجولاں کو

اُدھر غایت عنایت کی اِدھر پایانِ مجبوری
دکھاؤں کس طرح صورت نگاہِ لطفِ جاناں کو

رہینگے دل کے دل میں یہ نہ نکلی ہیں نہ نکلیں گے
نہ ٹوکو میری حسرت کو نہ چھیڑو میرے ارماں کو

کوئی ایسا تو دل لیں جس کی قیمت آپ کا دل ہو
کرینگے آپ کیا اس مردہ دل کی جنسِ ارزاں کو

یہ نیرنگی ہے سب نیرنگ کی افسردگی ورنہ
ترے کوچے کے گلشن سے کوئی کیوں جائے گلشن کو

(نیرنگ)

فنِ شاعری

نمبر (۳)

واقف علیہ الرحمۃ

ای دل کہ ز ما پیش باین بزم رسیدی — بازے خبرے دہ کہ چہ گفتی چہ شنیدی

بستی بخطِ غبار چہ تعویذ بباز و — غم نامہ ما بود کہ ناخواندہ دریدی

عمر تو دلا در قفس سینہ بسر رفت — یک روز اسیرانہ صفیرے نکشیدی

اے اشک ترا فائدہ زیں قطرہ زدن چیست — بسیار دویدی و بجائے نرسیدی

بابست ترا زود دوید از پئے آن طفل — از چشم من اے اشک چرا دیر چکیدی

صد بار نشستی بکمینِ دلِ ما حیف — تیرے نکشادی و کمانے نکشیدی

دل مے برد از ما چہ صباحت چہ ملاحت — در عشق ندانیم سیاہی و سفیدی

چوں شمع مرا سوخت درازئی شبِ ہجر — داغم ز تو اے صبح چرا دیر دمیدی

دیگر چہ فروشد بتو واقف کہ متاعش — دل بود کہ آں را تو بیک عشوہ خریدی

یہ دونوں غزلیں مشہور فارسی شاعروں کی ہیں۔ ان میں نہ تو اخلاق ہے۔ اور نہ مبالغہ[1]۔ اور مشکل پسندی۔ سادہ طرز اور روشن زمین میں کہی گئی ہیں۔ مگر باوجود اس سادگی

---

[1] تیسرا اعتراض یہ تھا۔ کہ ایشیائی شاعری میں مبالغہ ہوتا ہے۔ یہ اعتراض بھی تکلف سے خالی نہیں۔ جہاں خالی واقعات اور خیالی کیفیات سے کام لیا جاوے۔ مبالغہ ضرور ہوگا۔ کیا ناولوں اور ڈراما میں مبالغہ نہیں ہوتا

کے بھی ان میں مناسب مناسب استعارات ہیں۔ اگر ایسے استعارات سے بھی طبیعت اُکتاتی اور دل کڑھتا ہے۔ تو پھر میں نہیں جانتا کہ نظم کی خوبی اور نفاست کیا ہوگی۔ شاعر ایک بڑے لمبے چوڑے واقعہ کی تلخیص اور ایک وسیع مضمون ایک شعر میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ خیالات میں جو تموّج اور جوش ہوتا ہے۔ اُسے ایک خاص دائرہ میں لاکر دکھانا اپنا فرض سمجھتا ہے ایسی حالت میں شاعر کس طرح ایک معمولی تکلیف سے بچ سکتا ہے۔ شعر کہنا یا کسی واقعہ اور خیال کا نظم کرنا اسواسطے بھی زیادہ مشکل ہے کہ طائرِ واقعات کا دامِ تلخیص میں بند کرنا۔ اور پری معانی کا آئینہ وضاحت میں دکھانا خیلے مشکلے وارد۔ شعر اور نظم اگر نثر کے قالب میں لائی جائے۔ تو کیوں بھدی معلوم ہوتی ہے۔ اور کیوں دل سے اُتر جاتی ہے۔ اسواسطے کہ نہ تو وہ بندش اور تلخیص باقی رہتی ہے۔ اور نہ وہ طاقت جو اُس تلخیص میں بھری گئی تھی۔ شعر یا نظم دراصل چند واقعات یا حادثات یا کیفیات کا لُب یا ست ہوتی ہے۔ اگر ایک خاص مقدار کے لب یا ست میں وافر پانی ڈالا جاوے۔ تو اس کا وہ اثر اور وہ طاقت باقی نہیں رہیگی۔ اور اگر اس کے برعکس ایک شے کا ست لیا جاوے تو وہ بہ نسبت اپنے ابتدائی یا اصلی مقدار کے زیادہ تر قوی ہوگا۔ جب نثر یا عام طرزِ بیان کی شعری قالب میں تلخیص کی جاتی ہے۔ تو وہ بھی گویا اُس کا ایک لطیف ست یا لُب ہوتا ہے۔ اس میں انبساط قوت زیادہ اور کشش قوی ہوتی ہے۔ نثر کا ایک صفحہ پڑھ دینے سے وہ اثر نہیں ہوتا۔ جو ایک شعر سے

حاشیہ: کیا فرضی داستانوں اور تذکروں میں اس سے کام نہیں لیا جاتا۔ کیا اثر ڈالنے کی غرض سے ایک معمولی واقعہ پُر درد الفاظ کے قالب میں ایک درد اور سوز سے ظاہر نہیں کیا جاتا۔ رزمیہ نظموں اور عشقوں کے قصوں میں جو طرز اختیار کی جاتی ہے۔ کیا وہ مبالغہ سے خالی ہوتی ہے۔ مبالغہ دو قسم پر ہے۔ مبالغہ فی الاصل" اور "مبالغہ فی الزوائد"۔ "مبالغہ فی الاصل" کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے کوئی شاعر ایک واقعی حسین کی تعریف میں بوجہ اس کی ذاتی کشش اور دلربائی کے دلچسپ استعاروں اور موزون فقرات اور چُست کلمات سے کام لے۔ یا ایک سدتی منظر کی ذاتی

ہوتا ہے۔ سپیکر اور واعظین جو اپنی اپنی سپیچ اور وعظ میں کبھی کبھی نوٹر اشعار پڑھتے۔ اور ضرب الامثال یا اقوال کا حوالہ دیتے ہیں۔ اُسکا موجب یہی ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے کلام کو ان مصالحہ سے موثر اور پُرمزہ بنانا چاہتے ہیں۔ اوپر کی غزل میں حضرت واقف علیہ الرحمۃ کہتے ہیں ؎ اے اشک

تا فائدہ زیں قطرہ زدن چیست۔ بسیار دویدی و بجائے نرسیدی +

عام طبیعتیں اس منزل تک پہنچ کر رہ گئی ہونگی۔ کہ شیخ اور نعین واقف اشک چشم سے مخاطب ہیں۔ نہیں نہیں یہ تو ایک تمثیلی اخلاقی سبق ہے۔ اگر اسے نثر کے قالب میں لایا جائے تو اس پر ایک علیحدہ عنوان سے ایک بسیط مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ اس میں تمثیلاً اشک کی ہمت۔ جرأت۔ اور کمال کا مذکور ہو کر یہ جتلایا گیا ہے۔ کہ باوجود اس تگ و دو کی منزل کچھ بھی طے نہ ہوئی۔ ایسی حرکت اور تگ و دو کا فائدہ ہی کیا۔ یہ شعر اُن لوگوں کے واسطے اخلاقی رنگ میں ایک تمثیلی تازیانہ ہے۔ جو باوجود کم ہمتی۔ کم بضاعتی اور کم لیاقتی کے اپنی حد سے باہر جاتے اور باہر قدم رکھتے ہیں۔ جب ایک مقرر یا لکچرار اس مضمون پر وعظ کہتا اور لکچر سناتا ہے۔ تو یہ شعر نظیراً اپنے دعویٰ کی تائید اور توضیح میں پڑھ کر جو کچھ پہلے تفصیلاً کہا ہے۔ اسکو خلاصۃً پھر دہرا سکتا ہے۔

عمدگی کا اعلیٰ درجہ کی تمثیلات سے اظہار کرے۔ دراصل یہ مبالغہ نہیں ہر ایک شے کے ان اوصاف اور ان جذبات کی مکمل تشریح ہے۔ جس سے عوام الناس ناآشنا ہیں۔ ایک قدرتی منظر پر ہر ایک کی نگھ پڑتی ہے۔ لیکن جب ایک بامذاق شاعر اس کے اپنے مذاق کے مطابق تفصیل و تشریح کرتا ہے۔ تو سامعین کو رُلاتا ہی نہیں۔ بلکہ اُن کے گوہر دل چھید چھید چھلنی کر دیتا اور ان کا سوز اندرونی جوش میں لاتا ہے۔ صدائے نے ہر کوئی سنتا اور نے ہر کوئی دیکھتا ہے لیکن جس وقت ایک ہمدرد شاعر اپنے رنگ میں صدائے نے اور نے کی حکایت سناتا ہے۔ اُس وقت دلوں پر جو گذرتا ہے۔ اُسے دل ہی جانتے ہیں۔ نے کے دیکھنے سے وہ لطف اور وہ سوز نہیں ہوتا۔ جو نے کے بجانے یا سننے سے ہوتا ہے۔

شاعری کا مدعا . . . . . . وہ لوگ غلطی پر ہیں - جو شاعری کا کوئی مدعا نہیں سمجھتے - شاعری ایک فن ہے اور ہر فن کا کوئی نہ کوئی مدعا ہوتا ہے - وہ لوگ بھی غلطی پر ہیں - جو شاعری کا مدعا صرف یہ سمجھتے ہیں :-

"چند الفاظ کا بہ تقیدِ اوزان و بحور جمع کر لینا"

"چند واقعات اور کیفیات کی بندش یا تخئیل" یہ شاعری کے مدعا نہیں ہیں یہ تو عوارض یا زوائد خاصہ ہیں - ہاں ایسے زوائد ہیں جن کے بغیر کالبدِ شاعری بھدا سا معلوم ہوتا ہے - بیشک اَلنَّاسُ بِاللِّبَاسِ لیکن جیسے نرے لباس اور فوق البھڑک پوشاک سے ہی انسانیت کا رتبہ نہیں ملتا - اِسی طرح محض اُن زوائد سے بھی شاعری کا مدعا حاصل نہیں ہو سکتا. شاعر یا شاعری

یہ کیوں اس وجہ سے کہ نے انسانی لبوں سے نکل قصہ درد و سوز تلخیصاً پیش سامعین کرتی - اور اپنا فوری اثر نہ ڈالتی ہے - اسی طرح معمولی منظر اور ان چیت یا خشک واقعات اور کیفیات جب شاعر کے مذاق اور سوزِ دل سے تعلق پذیر ہو کر اُس کی پُر درد جادو بیان زبان سے معرضِ اظہار میں آتے ہیں - تو اُنکا اثر اُنکا سوز اُنکا جذب معمولی حالات سے کہیں زیادہ اور پُر جوش ہوتا ہے - سامعین کی طبیعت میں ایک اُمنگ شوق - ولولہ - آرزو پیدا ہوتی ہے اور انہیں اُن تفریحات کے مقدس دائرہ میں لیجاتی ہے - جو دماغی اور قلبی خوشی کا ایک حقیقی اور طبعی ذریعہ ہیں یہ شاعر کی لطافت بیانی اور معجز اثری کا ہی اثر ہے - کہ ایک خشک اور ان چیت واقعہ بحرِ سوز میں ڈوبا ہوا آبِ درد سے لبریز طبیعتوں میں فوری اثر جاتا اور دلوں کو رُلاتا ہے - اگر شاعر ایسے مذاق اور تصرفات سے کام نہ لے تو یہ حالت کیونکر پیدا ہو سکتی ہے . . . .

جب طبیعت یا کوئی شخص چند منتشر واقعات میں اپنے مذاق کے موافق تصرف کرتا ہے - تو اُسے ایک اختیار یا اعتبار اختصار و ایجاز تشریح و تفصیل اشارہ و کنایہ - معاد و استعارہ - تشبیہ و تلازمہ حاصل ہوتا ہے - بمصداق یجوز للشاعر ما لا یجوز لغیرہ بتائے ایسے تصرف کے مناظرین کو تربیت کرنی پڑتی ہے - بیشک ایک مخمل کا تھان ایک قیمتی شے ہے - اُسے مقراض کیا ہاتھ ہی نہیں لگنا چاہئے لیکن اس حالت میں مخمل کا تھان کہاں تک عزت اور بار پا سکتا ہے اور اُسے

کا خاص مدعا یہ ہے کہ :۔

ہماری قوتِ متخیلہ کو جوش و تحریک میں لاکر ہم پر ایسے جذبات کا انشاء اظہار کرے جس میں دنیا و مافیہا زندگی۔ خوشی۔ غم اور سوز کا عملی اصول معلوم کر سکے۔ قوتِ متخیلہ کی فضا میں ہمارے ہاتھ میں ہوں۔ اور ہم قوتِ متخیلہ کے ہاتھ میں۔ یہی شاعر اور شاعری کا مدعا ہے۔ اور یہی شاعری اور شاعر کی غرض۔ جو شخص اور جو طبیعت اس اصول پر چلتی اور اُسے اپنا راہنما بناتی ہے۔ وہی بہی

ایسے کیا فوقیت مل سکتی ہو۔ ایسی حالت میں فوقیت اور بار پائیگا۔ جب متراعی نہ ہیر اور مضامین تجویز سے کٹا اور بنایا جائیگا۔ مناظر اور واقعات یا قدرتی کیفیات بھی ایک تہ دار نشان ہے۔ بیشک اس حالت میں بھی وہ خوبصورت اور دلربا ہے۔ مگر جب تک مضامین تخیل سے کٹے اور مضامین تالیف سے بنے نہ جاویں۔ تب تک اُن میں اثر اور درد کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ جو لوگ فن شاعری اور شاعر کو تصرفات سے بالکل ہی معطل اور بے بہرہ رکھنا چاہتے ہیں۔ کیا اُنکی یہ مرضی ہے۔ کہ شاعر ایک مولف ہی رہ جائے اور بمصداق ؎ چشمانِ تو زیرِ ابرو آنند دندانِ تو جملہ در دہانند یہ ایک مضمون کی تالیف یا ایک ترکیب ہے۔ اس میں کوئی خوبی۔ اور کوئی لطافت یا نفاست سوائے اس کے نہیں ہے کہ ایک واقعہ کا ہو بہو اظہار کیا گیا ہے۔ اس کا اثر کسی طبیعت پر یا کسی سامع پر ایسا نہیں پڑ سکتا۔ جیسے ایک شعر یا ایک بیت یا نظم تابع مفہوم شاعری کے واسطے لازمی ہے۔ بہت لوگوں نے نظم اور شاعری ایک ہی سمجھ رکھی ہے۔ بیشک شاعری کے مفہوم میں نظم داخل ہے۔ لیکن نظم کے مفہوم میں شاعری داخل نہیں۔ نظم نام ہے۔ چند متفرق اور منتشر واقعات کی بندش اور ترکیب کا۔ ضروری نہیں۔ کہ اس میں لطافت شاعری بھی ہو۔ جیسے شعر بھا میں۔ لیکن شاعری یا شعر میں۔ بندش اور ترکیب ہی نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ اثر۔ جذب۔ جوش۔ سوز۔ درد۔ زورِ بیان کی بھی سخت ضرورت ہے۔ ان امور کے پیدا کرنے کے واسطے شاعر نظم پر ہی بس نہیں کر سکتا۔ بلکہ اُسے اپنا زورِ طبیعت اور جوشِ مذاق بھی دکھانا پڑتا ہے۔ شاعر مناظر و واقعات اور کیفیات و حادثات کا محل اپنے زورِ طبیعت سے اس وادی میں لیجاتا ہے۔ جو شاعری کی زمین وادیِ سوز۔ وادیِ درد اور وادیِ جوش سے موسوم ہے۔ اس وادی میں پہنچکر اور لوگ ہی حیران نہیں ہوتے۔ بلکہ خود شاعر بھی ششدر رہ جاتا ہے۔ شاعروں کا

اور حقیقی شاعری کی تابع ہے۔ اور وہی الشعراء تلامیذ الرحمٰن کے زمرہ میں داخل ہے۔ صرف چند الفاظ یا کلمات کے جوڑ لینے یا ترکیب دے لینے سے کوئی شخص اور کوئی طبیعت حقیقی معنوں میں شاعر نہیں بن سکتی۔ ہاں ناظم واقعات یا مرتب واقعات کہہ لو تو کہہ لو۔

اپنا ہی شعر مکرر سہ کرر پڑھنا اور جھوم جھوم مزے لینا اس امر کی زندہ دلیل ہے۔ کہ خود شاعر بھی بندش لطیف اور تخیل نفیس سے سوز درد میں آجاتا ہے۔ اسکی طبیعت پر بھی وہی اثر ہوتا ہے۔ جو سامعین پر۔ جس طرح ایک اچھا نشانچی نشانہ بہدف دیکھ کر اچھلتا خوش ہوتا اور اپنے فن پر ناز کرتا ہے۔ ایسے ہی ایک شاعر بھی اپنی طبع خداداد کے زور پر فخر اور ناز کرتا ہے۔ یہ بھی اعتراض بعض اوقات کیا جاتا ہے۔

"ایشیائی شاعر اکثر اپنی تعریف آپ کرتے ہیں"۔

"عموماً شاعری کے مذاق میں خود تعریفی داخل ہے۔"

اخلاقی کتابوں میں بیشک یہ بتایا گیا ہے کہ خود تعریفی اچھا رویہ نہیں۔ جو شخص اپنی تعریف آپ کرتا ہے۔ وہ حد اخلاقی قیود سے باہر جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ منشا نہیں ہوسکتا۔ کہ ایک لائق شاعر یا ایک لائق مصنف اپنی معلومات یا طاقت اور زور معلومات کا اظہار بھی نہ کرے۔ جو شخص ایک فن میں ماہر ہے۔ وہ ضرور کہنے کا حق رکھتا ہے۔ کہ میں اس فن میں ماہر ہوں۔ وہ اپنی لیاقت کے اظہار سے کبھی بھی شرم نہیں کرتا۔ ایک

ایک انگریزی مصنف کا قول ہے کہ "لیاقت اور شرمیلا پن دو متضاد چیزیں ہیں"۔

ایک عربی مصنف کہتا ہے کہ "وہی لوگ زیادہ شرمیلے ہوتے ہیں۔ جو نالائق ہیں"۔

ایک اور حکیم کا یہ قول ہے کہ "گدا اکثر شرمیلے ہوتے ہیں"۔

جو لوگ صاحب دماغ اور صاحب فطنت ہیں۔ وہ اپنی لیاقت کا اظہار اور اعتراف بھی کرتے ہیں اور دوسروں کی لیاقت کے بھی بخوشی معترف ہوتے ہیں۔ لیکن جو شخص خود لائق نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ لائق جماعت کے لوگ زمانے میں باقی نہ رہیں۔ یا انکی شہرت پر حرف آئے۔ وہ دوسروں کی لیاقت سے جلتا اور کڑھتا ہے اور کہتا ہے۔ کہ اگر ایسے لوگ زندہ رہیں۔ تو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں

غزل ہی مرصّع ہو جاتی ہے۔

شاعروں کے مدارج۔ جس طرح ہر علم اور ہر فن کے اندرونی درجے اور نمبر ہیں اسی طرح شاعری یا شاعروں کے بھی درجے اور نمبر ہیں۔ ہر درجہ اور ہر نمبر میں مقابلتًا امتیاز اور فرق ہے۔ چونکہ مذاقِ طبائع میں اختلاف اور فرق ہے۔ اس واسطے ضروری ہو کہ نمبروں یا درجوں میں بھی گونہ فرق ہو۔ شاعروں کے بڑے بڑے درجے ہو سکتے ہیں:-

(الف) طبعی یا وہبی شاعر　(ب) اکتسابی شاعر

ان دونوں قسموں کے تابع اور قسمیں بھی ہیں۔ بعض شاعروں میں آمد زیادہ ہوتی ہی۔ اور

اور تمام جوشی نالے ہیں۔ جو کس اسی غرض سے معرضِ بیان میں لائے جاتے ہیں۔ کہ سامعین کے دلوں پر ایک حیرت نما اثر ڈالا جاوے۔ اور واقعات میں ایک غیر معمولی عمدگی خوبی یا درشتی۔ وحشت [illegible] جاوے۔ ایسے طور پر [illegible] کیا جاوے۔ جو ایک معمولی واقعہ کی وسعت بڑے [illegible] سے بڑھ کر دکھا سکے۔ اس قسم کے مبالغے بیشک داستانوں اور تذکروں میں ہوتے ہیں۔ [illegible] کہ ایشیا [illegible] زیادہ [illegible] مواد پایا جاتا ہے۔ اور یہ صرف نظم و شاعری میں ہی نہیں۔ بلکہ [illegible] بھی موجود [illegible] کہ ایشیائی شاعری کا سارا سرمایہ ہی اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ بجائے خود ایک [illegible] نظموں اور ان تصنیفات سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں جو ایک شاعر اپنے خاص مذاق [illegible] ہوتی ہیں۔ وہ صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔ ایک خاص مذاق [illegible] واقعات [illegible] کھینچتی ہے۔ تو وہ مبالغہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک خاص طرزِ بیان یا طرزِ تحریر [illegible] صوفیانہ واقعات اور کیفیات کی اپنے مذاق کے مطابق تشریح کرتا ہے۔ [illegible] کا استعمال کرتا ہی۔ لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ وہ مبالغہ کر رہا ہے۔ [illegible] ایک شاعر ایک مفہوم بذریعہ ایک تشبیہ کے ظاہر کرتا ہے۔ لوگ [illegible] بعض اوقات ایک شخص کے لئے جادو نظر یا جادو چشم استعمال کرتا ہی۔ [illegible]

ہوجاتی ہے ۔ وہ ہمیشہ مضامین اور کیفیات کا انتخاب بہ نظرِ امتیاز کرتا ہے ۔ جیسے شاعروں کے درجے اور نمبر ہوتے ہیں ۔ ایسے ہی اُنکی شاعری کے درجے ہوتے ہیں ۔

ہر شاعر کا مذاقِ طبیعت بادنیٰ تعمق ظاہر کرسکتا ہے ۔ کہ اُس کا مقابلتاً درجہ کیا ہے ۔ ممکن ہے کہ ایک شاعر کا مذاق دُوسرے شاعر کے مذاق سے مماثل ہو ۔ لیکن ہُوبہُو اُس کا رنگ پایا جانا ذرا مشکل ہے ۔ بہتوں نے اپنے مذاقِ طبیعت کو دُوسروں کے رنگ میں رنگا ۔ مگر آخرکار وہ کھل ہی گیا ۔ شاگرد اور اُستاد کے رنگ طبیعت یا رنگ مذاق میں کچھ نہ کچھ مناسبت پیدا ہوجاتی ہے ۔ مگر نہ اس قدر کہ دونوں کا طبعی رنگ بالکل ہی مفقود ہوجاتے ۔ (باقی دارد)

سلطان احمد (میانوالی پنجاب)

ہیں ۔ اور وہاں صباحت و ملاحت اور قدرتی منظر مرکزِ اوج سمجھے گئے ۔

باوجود اس تاویل کے بھی میں اس اصول کا حامی ہوں ۔ کہ ہماری شاعری میں ابھی سادگی لطافت ۔ نفاست ۔ اور درد و سوز ہونا چاہیئے ۔ اگر کوئی مواد مغشوش ہے ۔ تو وہ باہر نکال پھینک دیا جاوے ۔ اگرچہ در مبالغہ سے اس کی خوبصورتی ۔ حسن خداداد ۔ اپنے حقیقی مرکز سے ہٹ کر چھپ جاتی ہے ۔ تو اُسے نویسادگی ۔ نو لطافت سے منور بنانے کی کوشش کیجاوے ۔

یورپین شاعری کے کمالات اور دلچسپیوں کا فارسی یا اُردو شاعری میں منتقل کرنا کسی بُرائی یا قباحت کا موجب نہیں ہر عمدگی اور ہر دلچسپی (خواہ اُس کا مخزن کوئی ہی ہو) قابل ہے کہ وہ حاصل کی جاوے ۔ خُذْ مَاصَفَا وَدَعْ مَاکَدِر ۔
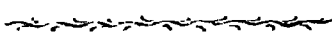
ناظم

یتیم

خدا کی ذات بھی بڑی بے نیاز ہے۔ قدرت کے اسرار سے کون واقف ہو سکتا ہے۔ عالم
کے جو تغیرات ہیں بعض اوقات اُن میں سے کسی میں ایسا انقلاب واقع ہوتا ہے کہ
انسان ضعیف البنیان کلیجہ پکڑ کے بیٹھ جاتا ہے۔ مگر دم نہیں مار سکتا۔ گھر ویران ہو جاتے
ہیں۔ خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ مگر سوائے صبر اور شکر کے کیا چارہ ہے۔ نظامِ زندگی
میں یہ بات کس قدر پُربہار ہے کہ لڑکا کہیں پلا۔ لڑکی کہیں پلی۔ بیاہ اور جوان ہوتے۔
جوان ہوئے۔ اور بڑے پیار سے شادی ہوئی۔ اوّل اوّل تو زندگی کا لطف اُٹھایا۔ پھر
خانہ داری اور بچے پالنے کے فرائض نے ساری توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ اولاد ماں
باپ دونوں کی آنکھ کا تارا ہے۔ بچہ ضد کرتا ہے۔ ماں باپ سہتے ہیں۔ اپنا پیٹ کاٹتے
ہیں۔ پھٹا پرانا پہنتے ہیں۔ مگر اُس کو اچھے سے اچھا کھلاتے ہیں اور اچھے سے اچھا
پہناتے ہیں۔ اور یہ سب اُس ممتا کے جوش میں ہوتا ہے۔ جو فطری طور پر ان کے
دلوں میں ودیعت کی گئی ہے۔ اللہ کے کارخانے دیکھو۔ یہ جوش اُن میں نہ ہوتا تو اس
بیکسی کے زمانے میں کون پرورش کرتا۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلا آیا ہے اور یوں ہی چلا جائیگا
مگر کبھی کبھی یہ سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اور قلبِ انسان ایک عظیم الشان انقلاب محسوس کرتا ہے۔
ہمیں اس وقت ان بھائی بہنوں کے خیالات لکھنے ہیں جو یتیم ہو گئے ہیں۔ کچی عمریں ہیں۔
مگر کچھ کچھ سمجھ آچلی ہے۔ دکھیاری ماں جس پر بس روز ہوئے۔ یہ پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے
اپنے سارے وقت کو۔ اس وقت کو جو رونے دھونے ا[illegible]۔ بے باپ کے بچوں کو دیکھ دیکھ کر
کڑھنے سے بچتا ہے۔ محنت مزدوری اور دُکھڑا کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنے میں لگاتی ہے

پھر بھی وُہ بات نہیں پیدا کر سکتی۔ جو اُس بندھی ہُوئی آمدنی میں میسّر تھی۔ عزیز و اقارب
اپنے اپنے مخمصوں میں لگے ہُوئے ہیں۔ دُوسرے اس نفسا نفسی کے زمانہ میں کون کسی کی مدد
کرتا ہے۔ لوگوں کے نفس دن بدن موٹے ہوتے جاتے ہیں۔ اور بیکسوں پر رحم کرنیکا مادہ
روز بروز کم ہوتا جاتا ہے۔ اے فطرتِ انسانی! تو بعض وقت کس قدر ظلم کرتی ہے! پڑوس
میں فاقہ ہو اور ہم پلاؤ زردہ کھا رہے ہیں۔ یتیم بچے ننگے حال اور ہم زرق برق پوشاک پہنے
پھرتے ہیں۔ یہ جائز ہے؟ آہ۔ آہ۔ دل پتھر ہے۔ اب بیکس بیوہ کوئی دو ہفتے سے اس
فکر میں لگی ہوئی ہے کہ عید کو بچوں کے پاس نئے کپڑے ہو جائیں۔ دو چار آنے سودا کھانے
اور کھلونوں کے واسطے بھی اُن کے پاس ہوں۔ اپنے رنڈاپے کے غم کو بھول گئی ہے
اور دن رات اسی فکر میں ہے۔ عید آگئی ہے اور سب کام ادھورے ہیں۔ لاکھ جتن کئے مگر بچے کے
پاس نئی جوتی نہ ہو سکی۔ لڑکی کی اوڑھنی تو سنور گئی۔ مگر پاجامہ نہ میسّر آیا۔ بچوں کو دیکھتی ہے اور روتی
ہے۔ دو دو پیسے بڑی مشکل سے دونوں کو دیے ہیں۔ مگر دل خوش نہیں ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے
ہُوئے ہیں۔ سویاں پکائی ہیں۔ مگر کیا تینوں کا پیٹ بھر جائیگا۔ پہلی عید کو تو وہ بیمار تھے۔
بچے کو بڑھے نانا کے ساتھ عیدگاہ بھیجدیا تھا۔ اب کے نہ باپ ہے نہ نانا۔ بچہ کس کے
ساتھ جائے۔ دن بھر آپ روئے اور بچوں کو رلائے۔ بس یہی کرے۔ خیر۔ یہ دقت خدا نے
رفع کر دی۔ پڑوسن کے میاں اپنے بچوں کے ساتھ رحیم کو بھی لے گئے۔ بیچارے خود غریب تھے
اور کچا ساتھ تھا پھر بھی دو ڈھائی آنے کے کھلونے۔ ترکاری اور کچوریاں اسے بھی لا دیں۔
بھائی جزاک اللہ! وہ در دنیا و بہتر در آخرت۔ تم خدا کی نگاہ میں ان امیروں سے لاکھ
درجہ بہتر ہو جن کی کمائی میں حرامکاریوں کے لئے تو سینکڑوں ہزاروں روپے موجود ہیں مگر
رانڈوں۔ یتیموں۔ محتاجوں، اور بیکسوں کے حق کا ایک پیسہ بھی نہیں۔ کیا ظلم ہے ۔۔۔
بردبار خدا۔ تو سہتا ہے مگر انسان نہیں سہہ سکتا۔ نصیبن کی اس آواز نے کہ "۔۔۔

کھلونے لاتے" بدنصیب کے کلیجے پر گھونسا سا لگا۔ مگر وہ بچوں کی خوشی میں کم منت نہیں ڈالتی وہ جو چیزیں رحیم لایا ہے اُن کے حصے کر دیتی ہے۔ بچے ناچتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ بہن ختم ہو جاتا ہے۔ تو برف والے کی آواز پر کو جو نصیبن سی ذرا بڑی ہے دیکھا ہے۔ بہن کر دیتی ہے وہ پوچھتی ہے بھائی برف دلوا دو گے؟ ماں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہی دو پیسے ہیں چاہے بڑے لینا چاہے بیر اور گنڈیریاں کھانا۔ پیسے پیسے والی دو قلفیاں … اور … پیسے بڑوں کے لئے۔ سب نے وہ پیئے۔ رحیم اداس ہونے لگا۔ ابا یاد آرہے ہیں۔ … پر تنکے سے کپڑے کے ٹکڑے بنا رہا ہے۔ نصیبن سے بولا بہن کہہ رہی ہے۔ ابا ہوتے تو آج کھلونے۔ اور سودے خوب کھلاتے۔ اوروں کے تو سب کے ابا ہیں۔ ہمارے ہی ابا مر گئے۔ اماں بھی تو اسی لئے ہمیں کوئی نہ دیتی ہیں۔ تو تو بہت تھی عیدگاہ میں سب بچے اپنے اپنے اباؤں کے ساتھ تھے۔ وہ انہیں جو مانگتے تھے دلوا دیتے تھے۔ ہماری اماں گھر گھر د بنتی ہیں۔ تو کارخانہ دار پیسے دیتا ہے اس کا آنا آتا ہے۔ ابا تو کتنا سے آیا کرتے تھے۔"

نصیبن۔ "بھائی یہ کیا بات ہے کہ اوروں کے تو سب کے ابا جیتے ہیں۔ ہمارے ابا کیوں مر گئے؟"

بھائی۔ "تو بھی دیوانی ہے۔ اللہ کی مرضی۔ اماں کہا نہیں کرتی ہیں کہ جس کی موت آ جاتی ہے مر جاتا ہے۔"

نصیبن۔ "پر بچوں کو یوں ہی چھوڑ جاتا ہے۔ کسی سے کہہ نہیں جاتا کہ انہیں کھلا دیا کرنا۔"

بھائی۔ "وہ کس سے کہہ جائے اور اس کی کوئی مانتے ہی کیوں لگا۔ ابا نے ماموں سے کہہ دیا تھا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر بمبئی چلے گئے۔ خیر خبر تک تو بھیجتے ہی نہیں۔ ہمارا کوئی چچا ہوتا یا پھوپھی یا دادا دادی ہوتے تو وہ ضرور ہماری خبر لیتے۔ اب تو ہماری اماں ہیں سو محنت کر کے ہم سب کا پیٹ پالتی ہیں۔"

نصیبن۔ "تو اماں یوں ہی گوکھرو بنا کریں گی اور ہمیں کھلایا کریں گی؟"

بھائی۔ "نہیں۔ ایک برس دو برس میں میں بڑا ہو جاؤں گا۔ کارخانہ دار میرا بھی

کردیگا وُہ بھی اماں کو لادیا کرونگا۔ اِدھر تو بھی گو کھروسیکھ جائیگی۔ تیرے بھی پیسے آنے لگیں گے"۔

نصیبن:۔ "تو پھر ہم تم بھی فضل اور سکینہ کے سے کپڑے پہننے لگیں گے۔ سکینہ کے تو ہاتھوں میں چوڑیاں بھی ہیں"۔

اتفاق دیکھو کہ ماں کسی کام کو ڈیوڑھی کی طرف آئی تھی۔ اُن کی باتیں کان لگا کر سُنیں دِل بھر آیا۔ بیتاب ہو کر دونوں بچّوں کو چھاتی سے لگایا اور آپ بھی خوب روئی اور اُنہیں بھی رُلایا۔ لڑکے کی اس ہمّت پر ڈھارس بندھی کہ یہ بھی کما کر لایا کریگا۔ اُسے لاکھوں دُعائیں دیں۔ اور ایک لمحہ کے لئے خاوند کے نہ ہونے کا غم بھول گئی۔ سچ ہے سعادتمند اولاد سے رانڈ ماؤں کا رنڈاپا کٹ جاتا ہے۔ دِل میں باغ باغ ہوتی ہے کہ بس چھ مہینے میں پانچ چھ آنے روز گھر میں آنے لگیں گے۔ خوب پیٹ ڈھلنے لگے گا۔ ہمیں اِن بیکس رانڈ اور اِن یتیم بچّوں سے بہت ہمدردی ہے۔ خدا ان پر رحم کرے۔ ماں کو بچّوں کا سہارا ہے۔ اور بچّوں کو ماں کا۔ مگر ایک وُہ رانڈیں بھی ہیں۔ جن کو تنکے کا بھی سہارا نہیں عمر کاٹنی مشکل ہو جاتی ہے۔ نہ گھر نہ ور۔ ماماگری کرتی ہیں۔ پرائے بچّے کھلاتی ہیں اور رو دھو کر عمر گذار دیتی ہیں۔ آہ۔ آہ۔ ایک وُہ بھی یتیم بچّے ہیں جنہوں نے نہ باپ دیکھا نہ ماں۔ نہ رہنے کو گھر۔ نہ کھانے کو روٹی۔ کون اُن کی پرورش کرے۔ کون اُن کا دِل ہاتھ میں لے۔ نوّاب۔ امیر۔ یہ کام کرتے مگر اُن کی آنکھوں پر چربی چھائی ہوئی ہے۔ اپنے عیش آرام سے کہاں فرصت۔ نہ مرنیکا ڈر ہے۔ نہ خُدا کے ہاں جانیکا خوف +

عـــزمی دہلوی

ایک سیب کا معاوضہ

شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے عہد کا ذکر ہے کہ ضلع جھنگ میں ایک غریب کاشتکار رہتا تھا
جس کے خاندان میں کئی آدمی تھے مگر آمدنی کافی نہ تھی اور اس وجہ سے نہایت عُسرت کے
ساتھ بسر ہوتی تھی - اتفاق سے کاشتکار کی حاملہ بیوی کا وضع حمل سے تین چار دن پہلے سیب
کھانے کو جی چاہا - غریب کاشتکار نے عمر بھر سیب کی صُورت تک نہ دیکھی تھی لہذا تعمیل فرمائش سے
قاصر رہا لیکن جب بیوی نے بیمار ہو کر بہت مجبور کیا تو وہ گاؤں کے نمبردار کے پاس گیا اور اس سے
سیب کا طالب ہُوا - نمبردار سیب کے لئے شہر کو آدمی بھیجنا ہی چاہتا تھا کہ ایک شخص نے کاشتکار
سے کہا کہ اس گاؤں کے قریب ایک بڑا سوداگر خیمہ زن ہے اور امید ہے کہ اُس کے پاس سے
سیب مل جاوے - کاشتکار بیچارہ یہ سُنکر اس جانب روانہ ہوا اور خیمہ گاہ میں پہنچکر ہر شخص سے
دریافت کرنا شروع کیا کہ سیب کہاں بکتے ہیں - اور جب کوئی سیب کی ضرورت دریافت کرتا تھا
تو ہمارا مسکین کسان اپنی بیوی کی حالت بیان کر دیتا تھا - آخر کار لوگ اس کو سوداگر کے روبرو لے
گئے جو اپنی خداداد ذہانت سے سمجھ گیا کہ اس عورت کا بیٹا جو وضع حمل کے قریب سیب کھانا
چاہتی ہے کوئی عالی مرتبہ شخص ہوگا اور عجب نہیں جو دربار شاہی کا کوئی بڑا عہدہ دار ہو جاوے - یہ
خیال کر کے اُس ملک التجار نے کاشتکار سے ایک اقرار نامے پر دستخط کرنے کو کہا جس میں لکھا تھا
کہ مقر کا لڑکا جب بڑا ہو کر دربار شاہی میں رُسوخ حاصل کرے اور با اختیار ہووے تو وہ اس سوداگر
کو محصول درآمد و برآمد مال کی ادائیگی سے مستثنٰی کر دے - اور اُس سے کہا کہ اس کے معاوضے میں
وہ جس قدر سیب چاہے لے جاوے - غریب کسان نے نہ تو یہ پُوچھا کہ اس اقرار نامے کا کیا
مطلب ہے اور نہ وہ محصُول درآمد و برآمد جانتا تھا بلکہ غریب نے جلدی سے اُس کاغذ پر دستخط کئے چند

لکیریں کھینچدیں اور ایک سیب لیکر گھر کو چلتا ہؤا۔ اور بیوی کو جا کر دیدیا۔ یہ سیب کھانے کے تین چار روز بعد اُس کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہؤا جس کا نام سعد اللہ رکھا گیا اور جو بعد کو علامی نواب سعد اللہ خاں کے نام سے مشہور ہؤا۔

سعد اللہ جب کچھ بڑا ہو گیا تو معمول کے موافق جنگل میں مویشی چرایا کرتا تھا مگر چراگاہ میں وُہ اپنی چادر بچھا کر بیٹھ جاتا تھا اور اس کے ساتھیوں میں جب کوئی جھگڑا ہوتا تو بادشاہ کی طرح اس کو فیصل کیا کرتا تھا۔ ایک دن جنگل میں ہی ایک بزرگ کے مزار کے قریب وہ چادر بچھا کر سو گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بزرگ سبز پوش اس کے پاس آ کر کھڑے ہوئے اور اُس کو دہلی جانے اور کسی مکتب میں داخل ہونے کی ہدایت کی۔ تین دفعہ وُہ جاگا اور سویا اور ہر دفعہ اس نے ان بزرگ کو یہی فرماتے ہوئے سنا۔ آخر اُس نے دہلی جانے کی ٹھان لی اور چند ضروری چیزیں اپنے ساتھ لیکر دوسرے دن دار السلطنت مغلیہ کا رستہ پکڑا۔

تین مہینے راستے کی صعوبتیں اُٹھا کر وہ دہلی پہنچا اور اُس بزرگ کی ہدایت کے موافق ایک مکتب میں بیٹھ گیا جہاں اُس نے تھوڑے ہی عرصے کے اندر اکتساب علوم میں بہت ترقی کی۔ دو برس بعد شاہجہان بادشاہ وقت کے پاس شاہ ایران کی طرف سے ایک تحریر پہنچی جس میں بوجہ شاہ ہند ہونے کے شاہ جہان کا لقب اختیار کرنے کی وجہ دریافت کی گئی تھی۔ چونکہ خود بادشاہ کے ذہن میں اس کا کوئی معقول جواب نہیں آیا اس لئے اس نے تمام اُمرا و علما کو مشورت کے لئے طلب فرمایا لیکن کسی سے اِس کا قابلِ اطمینان جواب نہ بن پڑا۔ مجبور ہو کر بادشاہ نے عام منادی کرا دی کہ جو شخص اس کا مناسب جواب دیگا اس کو دربار میں ایک معزز عہدہ دیا جائیگا۔ اُس مکتب کے مولوی صاحب نے بھی جس میں سعد اللہ پڑھتا تھا یہ عقدہ حل کرنے کی کوشش کی۔ مگر بیفائدہ۔ اور پھر اپنے طالبعلموں سے کہا کہ وُہ بھی کوشش کریں۔ ہر ایک لڑکے نے اپنی اپنی سمجھ کے موافق ادق اور طویل جوابات لکھے لیکن سعد اللہ نے ایک کاغذ کے پُرزے پر صرف یہ تین کلمے

وہی عدد ہیں جو "جہان" کے اس نئے "شاہ ہند" گویا "جہان" کہتے ہیں۔ اور کا مذاق اپنے اُستاد
کو دیدیا۔ مولوی صاحب دل میں تو سعد اللہ کی قابلیت اور ذہانت کے قائل ہوگئے لیکن بوجہ
رشک کے ظاہر یہ کیا کہ اُس کا جواب بھی کچھ قابل اطمینان نہیں ہے۔ آخر مولوی صاحب نے
فیصلہ کیا کہ یہ جوابات بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے جاویں۔ چنانچہ اُن سب کو لیکے دربار
میں پہنچے لیکن چالاکی یہ کی کہ سعد اللہ کا جواب سب کاغذوں کے نیچے رکھدیا کہ دو چار جواب
پڑھکر بادشاہ سب کو پھینکدیگا اور ہر ایک کو پڑھنے کی تکلیف گوارا نہیں کریگا۔ لیکن اتفاق سے
سعد اللہ کا جواب چونکہ سب کے نیچے تھا بادشاہ کے ہاتھ سے گر پڑا اور اس نے اتفاق سے سب سے
پہلے وہی پڑھنا شروع کردیا ع عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد۔ مولوی صاحب نے یہ تدبیر
کچھ اور ہی عداوت سے پیش کرنے چاہے لیکن سعد اللہ کا مختصر سا جواب بادشاہ کے دل کو لگ گیا
دوسرے روز اُس نے سعد اللہ کو اپنے حضور میں طلب کیا۔ وعدہ کے موافق اُس کو ایک بڑا عہدہ
دیا گیا لیکن بعض اُمرا کو اس سے حسد ہوا کہ ایک طفل مکتب اسی طرح بازی لے جاوے اور ایک
معزز عہدہ پاجاوے۔ چنانچہ انہوں نے شاہجہان کے کان بھرنے شروع کئے اور ایک روز
موقع پاکر یہ شکایت کی کہ گو سعد اللہ ایک بڑا عہدہ دار ہے مگر اُس کو قلم بنانا بھی نہیں آتا۔ بادشاہ
نے حکم دیا کہ کل سعد اللہ کو دربار میں قلم بنانے کا حکم دیا جاویگا اور اگر وہ نہ بناسکا تو موقوف کردیا
جاویگا۔ اتفاق سے سعد اللہ کو بھی اس بات کی کسی نے خبر دی۔ چنانچہ تمام رات اُس نے
قلم بنانے کی مشق کی اور صبح تک ایسا چابکدست ہوگیا کہ صرف تین تراشوں میں وہ نہایت
عمدہ قلم بنانے لگا۔ حسب قرارداد سابق دوسرے دن علی الصباح اُس کی دربار میں طلبی ہوئی
اور جہاں پناہ نے قلم بنانے کا حکم دیا تو وہ سعد اللہ اس امتحان میں کامیاب ہوگیا۔
اور دشمنوں کو ندامت اُٹھانی پڑی۔ اس روز سے اُس کی قابلیت کا سکہ پہلے سے زیادہ
بیٹھ گیا۔ بادشاہ کی نظر میں اُس کی اور بھی عزت ہوگئی اور آخرش وہ شاہجہان کا وزیراعظم

مقرر ہو گیا۔

ایک دن علامی نواب سعد اللہ خاں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک معمر سوداگر ایک بوسیدہ کاغذ ہاتھ میں لئے ہوئے اُس کے سامنے حاضر ہوا اور نہائیت ادب سے سلام کر کے وُہ کاغذ پیش کیا۔ ناظرین! یہ وُہی سوداگر تھا جس نے سعد اللہ خاں کے باپ سے اقرار نامہ لکھا کر ایک سیب دیا تھا۔ اور یہ کاغذ وہی اقرار نامہ تھا جس کو پڑھتے ہی وزیر اعظم نے تمام عمّال کے نام ایک فرمان جاری کیا کہ یہ سوداگر ادائیگی محصُول سے یک قلم مستثنےٰ کیا گیا اور یہ اُس ایک سیب کا معاوضہ تھا۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ہم کو اصلی حاجتمندوں کی مدد کرنی چاہئے جس میں بڑے بڑے فائدے ہیں نہ کہ اُن غیر مستحقین کی جو حقداروں کا حق غصب کرتے پھرتے ہیں اور جنہوں نے مانگنا ایک ذریعہ آمدنی سمجھ لیا ہے *

نیاز احمد

ریویو (ڈرامیٹک) بمبئی کی مشہور و معروف وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی کی موجُودگی سے لاہور کی رونق میں اندنوں معتدبہ اضافہ ہو گیا ہے اور مہذب تفریح کے شائقین کے لئے دلچسپی کا خاصہ سامان مہیا ہے۔ اسوقت تک اس کمپنی کے صرف دو کھیل ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ یعنی نازاں اور گوپی چند لیکن وہ دو کھیل کمپنی کے محاسن کا پتہ لگانے کے لئے کافی ہیں۔ ایک بات تو صاف ظاہر ہے کہ مسٹر بالی والا (مالک کمپنی) ایکٹنگ کے فن پر بالخصوص توجہ کرتے ہیں۔ اور اُن کے ایکٹروں کو دوسری کمپنیوں کے ایکٹروں پر ایک خاص فوقیت حاصل ہے جو ذوقِ سلیم پر مخفی نہیں رہتی۔ نازاں میں مصنف نے ترکی اوضاع و اطوار کا نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بحیثیت مجموعی خاصہ دلچسپ ناٹک ہے۔ لیکن اگر بالاستیعاب دیکھا جائے تو پلاٹ میں بعض اس قسم کی خامیاں ہیں۔ جن سے کھیل کی دلچسپی میں بہت کچھ فرق آجاتا ہے۔ گوپی چند ہمارے دوست حضرت طالب کی زود قلم کا نتیجہ ہے۔ اور قبولیت عامہ کا تاج پہن چکا ہے۔ روشن اور جوگن کی چُست فقرات زبان زد ہر خاص و عام ہیں۔ اس لئے اس ظرافت پیکر کھیل کی زیادہ توصیف فضول ہے *

التجائے مسافر

۲ ستمبر ۱۹۰۵ء ہمارے خاص احباب کی تاریخ محبت میں ایک قابلِ یادگار دن ہے۔ صبح کا سہانا سماں ہے بمبئی میل دہلی کے بڑے سٹیشن پر پہنچی ہے خواجہ سید حسن نظامی دہلوی اور منشی نذر محمد بی۔ اے اسسٹنٹ سیکرٹری مدرسہ عالیہ دہلی سٹیشن پر استقبال کو آئے ہیں۔ استقبال کس کا ہے؟ جدید شاعری کے روحِ رواں اقبال۔ اقبال اور اس کے ہمراہیوں کا۔ وہ کیسے؟ اقبال بغرضِ تکمیلِ علوم و فنون انگلستان کو روانہ ہوتے ہیں۔ نیرنگ اور راقم اپنے پیارے دوست کو رخصت کرنے کے لئے دہلی تک ساتھ گئے ہیں۔ ریل سے اُتر کر اوّل منشی نذر محمد صاحب کے مکان پر تھوڑی دیر آرام کیا۔ بعد میں سب دوست مل کر حضرت محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ العزیز کی درگاہ آسمان بارگاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے کی زیارت اور سیر کی۔ درگاہ میں پہنچ کر مزارِ مبارک پر حاضر ہوئے اوّل اقبال نے عالمِ تنہائی میں مزارِ مبارک کے سرہانے بیٹھ کر ذیل کی نظم پڑھی اور تمام دوست پر سب احباب باہر حجرہ میں ٹھہرے رہے۔ بعد میں دوستوں کے اصرار پر اقبال نے اس نظم کو درگاہ کے صحن میں بیٹھ کر مزارِ مبارک کی طرف منہ کر کے دوبارہ ایک نہایت دردانگیز اور دلنشین لہجے میں پڑھا۔ سب احباب اور دیگر سامعین نہایت متاثر ہوئے اور بے تحاشا زبان سے موقع بموقع کلماتِ تحسین و آفرین و آمین نکلتے تھے۔ ایک محویت کا عالم تھا کہ جس کی تصویر حاضرین کے تصور ہی کھینچ سکتے ہیں۔ درگاہ سے واپس ہو کر خواجہ حسن نظامی صاحب کے مکان پر قیام کیا۔ اور حضرت محبوبِ الٰہی کے لنگر کی مہمانی سے بہرہ اندوز ہوئے۔ ولائت نامی ایک نوعمر قوال خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ نو تعلیم تھا مگر خوش گلو اور

اور با طبیعت۔ وہ کچھ گاتا رہا اور وقت نہایت مزے اور کیفیت سے گذرا۔ اس کے بعد شہر کو واپس ہوئے واپسی کے وقت خاتم الشعرا مرزا اسد اللہ خاں غالب کی تربت پر حاضر ہوئے۔ عجیب کیفیت تھی۔ بندۂ نیرنگ مرزا صاحب کی تربت کے سرہانے لوح تربت پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھا تھا میرے دائیں آقبال عالم محویت میں بیٹھے تھے اور تربت کے گرداگرد تمام پارٹی حلقہ باندھے ہوئے تھی دو بجے دن کا وقت اور دن بھی ستمبر کا دھوپ تیز اور ہوا میں گھمس مگر اس قبر کی زیارت کا اثر تھا کہ کوئی گرمی کا احساس نہ کرتا تھا۔ قوال زادے کو عجب وقت کی سوجھی بولا حضور مرزا غالب کی ایک غزل یاد آ گئی اگر ارشاد ہو تو سناؤں۔ سرود مستاں یاد دہانیدن یہاں عذر کس کو تھا۔ چنانچہ اس نے یہ غزل گائی۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی   دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

ذیل کے دو شعروں پر عجب کیفیت رہی۔

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں   بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں   اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

غزل کے ختم ہونے پر جب ایک دو منٹ میں ذرا ہوش سا آ گیا تو سب بیدل کو [illegible]۔ آقبال نے جوشِ محویت میں مرزا صاحب کی لوحِ مزار کو بوسہ دیا۔ اور سب شہر کو روانہ ہوئے۔

اچھا پیارے اقبال سفرِ [illegible] مبارک باد۔ بسلامت روی و باز آئی

رہیں گے تو تین سال بعد تیرے پیارے کلام کو تیری پیاری زبان سے پھر سنیں گے۔

مخزن کی ضیافتِ طبع کے لئے یہ نظم اس نوٹ کے ساتھ بھیجتا ہوں۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا   بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی   مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

ترے وجود سے روشن ہے راہ منزل شوق ۔۔۔ دیارِ عشق کا مصحف کلام ہے تیرا

عیاں ہے تیری محبت سے رنگِ محبوبی ۔۔۔ بڑی ہے شان بڑا احترام ہے تیرا

ترے نفس سے کدۂ دل ہے ترے دم سے ۔۔۔ طلب ہے خضر کو جس کی وہ جام ہے تیرا

ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم ۔۔۔ نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا

[illegible] کرم کہ غریب الدیار ہے اقبال ۔۔۔ مرید پیر [illegible] سے غلام ہے تیرا

اگر سیاہ دلم داغِ لالہ زار تو ام

وگر کشادہ جبینم گلِ بہار تو ام

ملا ہے تیرا مقدر نے مدح خواں مجھ کو ۔۔۔ رہے ہزار مبارک یہی زباں مجھ کو

چڑھا کے پھول مرے [illegible] سر تربت ۔۔۔ اڑا کے پھرتی ہے حیرت کہاں کہاں مجھ کو

بیاں کروں جو تپش عشق کو تو آتش دل ۔۔۔ شرر سے دے [illegible] داستاں مجھ کو

میں نفتہ دل ہوں [illegible] نیاز مست ترا ۔۔۔ دکھایا آج خدا نے یہ آستاں مجھ کو

مرے سفینے کو تو نے کنارے [illegible] کیا ۔۔۔ [illegible] مجھ کو

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثل نکہت گل ۔۔۔ ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو

تپش [illegible] اڑا کے چمن ۔۔۔ ذرا سا دیتا ہے غنچے کا آشیاں مجھ کو

[illegible] ہے لے کے [illegible] نگار خانے سے ۔۔۔ شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

نظر ہے ابر کرم پر درخت صحرا ہوں ۔۔۔ کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجھ کو

فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں ۔۔۔ تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو

مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے ۔۔۔ کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو

مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے ۔۔۔ کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھ کو

رہوں میں خادمِ خلقِ خدا جیوں جب تک ۔۔۔ نہیں ہے آرزوئے عمرِ جاوداں مجھ کو

دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر — تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

گریز میرے دلِ دردمند کا ہے شعار — بہت ستاتا ہے اندیشۂ زیاں مجھ کو

بنایا تھا جسے چُن چُن کے خار و خس میں نے — چمن میں پھر نظر آئے وُہ آشیاں مجھ کو

پھر آ رکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں — کیا جنہوں نے محبت کا رازداں مجھ کو

وُہ شمع[۱] بارگہِ خاندانِ مرتضوی — رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو

دُعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں — کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

وُہ میرا یوسفِ ثانی وُہ شمعِ محفلِ عشق — ہُوئی ہے جس کی اخوّت قرارِ جاں مجھ کو

جلا کے جس کی محبّت نے دفترِ من و تو — ہوائے عیش میں پالا کیا جواں مجھ کو

ہوا وُہ یار بھی مشتاق بھی برادر بھی — کہ جس کے عشق سے جنّت ہے یہ جہاں مجھ کو

ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں — کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو

یونہیں بنی رہے محفل مرے احبّا کی — ہرا بھرا نظر آئے یہ بوستاں مجھ کو

کھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا — ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں مجھ کو

قسم ہے اس کے دلِ دردمند کی آقا! — تری ثنا کے لئے حق نے دی زباں مجھ کو

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

اقبال

---

[۱] مولوی سید میر حسن صاحب قبلہ استادِ اقبال ۱۲

شاعری

تو نے مجھ کو آہ کیوں چھیڑا عروسِ شاعری
تجھ کو اک مدت سے امید تھی کرن بتہ کی

حافظ و خسرو کی تو ہے سمجھتیں پائے ہوئے
مصحفی و میر کی آنکھیں ہیں تو دیکھے ہوئے

چاہتی ہے مجھ سے کیا لائی ہے کیا میرے لئے
ننگ ہے مضمون جعد و ناف کا میرے لئے

شاعری گانا ہے اتنا نہ مجھے تسلیم ہے
یہ تو گانا بھی نہیں ہے ناچ کی تعلیم ہے[۱]

چبھ رہی ہیں میرے دل میں یہ تری کلبازیاں
کچھ بھلی لگتی نہیں مجھ کو تری یہ شوخیاں

کوئی بانکا کوئی ترچھا حسبِ مرضی ڈھونڈ لے
لکھنؤ سارا پڑا ہے اور کوئی ڈھونڈ لے

تو مرے قابل نہیں ہے میں ترے قابل نہیں
تجھ کو جو سامان ہے درکار وہ حاصل نہیں

دن کو اک گلشن ہے جس میں پھول کچھ کانٹے ہیں کچھ
رات کو اک آسماں اک چاند اور تارے ہیں کچھ

سال پیچھے یا کبھی کالی گھٹا کچھ آ گئی
لیکن اس سے بھی طبیعت اب مری گھبرا گئی

میز پر کچھ جام کچھ ساغر کوئی پیمانہ ہے
یہ مرا سامانِ دلچسپی ہے یہ میخانہ ہے

بس یہ پونجی یہ اثاثہ ہے ترے نوشاہ کا
میرے گھر میں کیا ہے میں ہوں اور نام اللہ کا

سبزہ و گل کا جو باقی رہ گیا ہے اک لباس
ماہ و انجم کی جو اک چادر رہی ہے میرے پاس

کب تلک اس جامہ کو پہناؤں تجھ کو دھو دھو کے میں
جس کی نکہت کہتی ہے اڑ جاؤں گی بو ہو کے میں

آہ یہ سونے کی تجھ پر آنتیاں اچھی نہیں
یہ پرانی تلکڑی[۲] کی بجلیاں اچھی نہیں

تیرے گیسو کو بساتا نافۂ مشکِ ختن
کان میں ہوتا ترے آویزۂ لعلِ یمن

کیا بتاؤں ملک نے کوئی مدد تیری نہ کی
اور زمانہ کی کشاکش نے مجھے فرصت نہ دی

---

[۱] یعنی تغزل کی عاشقانہ شاعری ۱۲ [۲] تلکڑی قسم ساخت ۱۲

میں پہنا دیتا ہوں قدرت کے ہاتھوں کا لباس	یعنی سب پھولوں کا گہنا اور پھولوں کی باس

پھول جو پنجاب کے ہیں اور وہ جو دکنی ہیں	اُن کا رنگ اچھا نہیں اور اُنکی بو اچھی نہیں

چین کے، سپین کے، ٹرکی کے اور اٹلی کے پھول	خوشنما۔ خوشرنگ۔ خوشبودار۔ تر تازہ پھول

ہند کی ایک پارسی دیوی میں بنا دیتا تجھے	اور گر ایوانِ لندن میں بٹھا دیتا تجھے

* * * * * * * * * * * * * * *

شاعروں کو روز اک دنیا نئی درکار ہے	شاعری کو آئے دن اک تازگی درکار ہے

سیکڑوں ملکوں کی جو شاعر ہوا کھاتا ہو گو	اور ہو سیر و سیاحت کی سند پائے ہو گو

اُس کا دل کیا ہو بس اک اچھّی نمائش گاہ ہو	جس میں قدرت کی ہر اک اچھی ادا محفوظ ہو

سیر ہو سامان ہو تفریح ہو گلگشت ہو	بحرِ بے پایاں ہو ساحل ہو جبل ہو دشت ہو

یہ مناظر مجھ کو قدرت کے کوئی حاصل نہیں	اک قفس میں مرغ ہے سینہ میں میرا دل نہیں

مانگتا ہوں بادشاہوں سے ہُما کا شہپر مستعار	کوئی لا دے آہ مجھ کو تختِ اِندر مستعار

دو گھڑی کر آؤں سیرِ ساحلِ پُرشورِ نیل	دیکھ آؤں بالٹک کی پُرفضا موتی جھیل

کھینچ لاؤں کوہِ آتشبار کی تصویر میں	ہند میں روشن کروں سیلون کی تنویر میں

منتقل کردوں میں امریکہ سے چاندی کا پہاڑ	مشتعل کر دوں میں اک ایورسٹ کیسا پہاڑ

پاس سے دیکھوں میں جاکر آبشارِ نیاگرا	پونچھ لوں دامن سے چشمِ اشکبارِ نیاگرا

* * * * * * * * * * * * * * *

آہ یہ یکسانیت اچھی نہیں اوقات کی	آفرینش اس میں ہو سکتی نہیں جذبات کی

روز اک گلشن نیا ہو سیر کرنے کے لئے	روز اک پیکر نیا ہو رنگ بھرنے کے لئے

مجھ کو فرسودہ مضامیں تو پسندیدہ نہیں	غیر کے معشوق پر ہرگز میں گرویدہ نہیں

اے سخنور تو مری شیوا بیانی پر نہ جا	تو مرے بحرِ طبیعت کی روانی پر نہ جا

ہاں اس بحر میں خاشاک بھی اور گل بھی ہے — اِس قفس میں زاغ بھی ہے اور بلبل بھی ہے

میں نے مانا لوگ کہتے ہیں یہ چشمہ پاک ہے — لیکن اس کی تہ میں جا کر دیکھو کتنی خاک ہے

جو تعلق پیدا کیے میں نے وہ فرضی ہیں سب — [illegible] ہیں سب

جانتا ہوں حسن پیکر کی اصلیت کو [illegible] — تازگی کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں [illegible] میں

بشتِ غربت کو چھوڑا ہوں میں وطن کو چھوڑ کر — [illegible]

[illegible] جوش [illegible] سر ہے پا مجھے — [illegible]

(نادر [illegible] کاکوروی)

بکائے انگلستان

(شیلے اور کیٹس کا مزار)

میں نے سونپے تھے جو تجھ کو روم کی او زمیں — کیا کئے تو نے وہ میرے تاجِ شہرت کے نگیں

میرے بستانِ سخن کے نو دمیدہ پھول دو — تیرے ویرانے میں ہیں اب افسوس پیوندِ زمیں

گرد آلودہ جبیں ۔ چہرے ہیں سنولائے ہوئے — وہ صباحت ہے نہ زیبِ نقش و نگارِ دل نشیں

ذوقِ نظارہ میں لبریز کے جو رہتی تھیں وا — آہ! اُن آنکھوں میں اب خوابِ عدم ہے گزیں

گوشۂ تاریکِ مرقد میں ہیں اب محوِ سکوت — بولتا تھا جن کا طوطی ۔ وہ لبِ سحر آفریں

اب نہ وہ شوقِ تکلم ہے نہ وہ ذوقِ سخن — آہ! ان ہونٹوں پہ اب موجِ تبسم بھی نہیں

جس میں قدرت نے بھرا تھا کوٹ کر سوزِ سخن — ہو گیا خاموش آخر ساز وہ زیرِ زمیں

تیری ظلمت کا گہن ایسا لگا اے خاکِ روم — چاند سورج آہ! میرے چھپ گئے زیرِ زمیں

میرے ساحل سے اگر ہو رُوم کو جانا ترا — تو تجھے میری قسم ! اے موجِ نسیمِ عنبریں
میری جانب سے سلامِ شوق پہنچانا انہیں — میرے پردیسی جو ہیں شہرِ خموشاں کے مکیں
پھر یہ کہنا خاک اُڑا کر سر پہ اے بادِ صبا! — آفریں ! میرے تغافل کیش تم کو آفریں

ایسے غربت کو سدھارے پھر وطن کی سُدھ نہ لی
بن میں جا کر میرے پھولوں نے چمن کی سُدھ نہ لی

نازشِ تاجِ سخن تھے میرے دُرِّ شاہوار — پیس ڈالے آہ ! تو نے آسیائے روزگار
دشتِ غربت میں کیے کس نے پیوندِ زمیں — تو لئے جاتا ہے گھر سے آسمانِ دُوں شعار
میرے پھولوں کا ہے گہوارہ کدھر اے خاکِ روم! — کس حدیقے میں ہے میرے سرو و ریحاں کی بہار
تُو نے گلچینِ اجل! چن چن کے توڑے میرے پھول — جی کے جی میں آہ ! ظالم میرے ابتک ہیں وہ خار
برقِ خرمن سوز اب کس پر گرائے گا فلک — لہلہا کر جل گئے میرے نہالِ باردار
خانۂ دل میں جگہ دینا مکینوں کو مرے — دیکھنا ! پہلو تہی کرنا نہ اے کُنجِ مزار
گُدگُداتی ہے صبا ! کیوں خفتگانِ خاک کو — ان کی نیندوں کا قیامت تک نہ اُترے گا خمار
سوئے ہیں جس وضع سے شہرِ خموشاں کے مکیں — یوں ہی یہ سوتے رہیں گے آہ ! تا یوم القرار
تو شفق کے پھول قبروں پر چڑھاتی ہے جہاں — مجھ کو لے چل ! ساتھ اُس مدفن میں اے صبحِ بہار
اپنے پھولوں کی زیارت میں بھی کر لوں اک نظر — ایک مدت سے ہے حسرت تیری اے طوفِ مزار
وہ دلاویزی نہیں اگلی سی تجھ میں آہ ! روم — تیرے ویرانے میں ہیں کچھ نقشِ عبرت یادگار
جس پہ اتراتی ہے اب تک آہ ! تیری خاکِ پاک — دفن ہے زیرِ زمیں یہ کون فخرِ روزگار

کس کی تربت پر "دل دلہا" یہ ہے لکھا ہوا
مہرِ نقشِ دل نشیں گورِ غریباں ! کیا ہوا

تو کہاں ہے آہ ! اب اے بلبلِ رنگیں بیاں — چھا رہی ہے تیرے پھولوں کی حدیقے پر خزاں

کوٹ کر جس میں بھرا تھا جلوۂ حسنِ ازل — آب و گل میں تیری تھا وُہ آگ کا شعلہ نہاں

تیرے ذرّوں کی زمیں تھی نازشِ خلدِ بریں — خوشنما نیلم سے تھا تاروں کا تیرے آسماں

تھا پرِ پیمانۂ سمندر کا ترے اِک اِک حباب — تیری اِک اِک موج پر تھا جوئے جنّت کا گماں

وجد میں تاروں کو لاتا تھا۔ وُہ جادو کا اثر — تیرے مُرغانِ چمن کے زمزموں میں تھا نہاں

بوٹے بوٹے میں تھی تیرے صنعتِ پرداز کا — پتے پتے میں یہ قُدرت کی تھیں صناعیاں

حُسنِ فطرت کا مرقع تھی وُہ نیلے خیال — تھی جہاں محوِ تماشا تیری فکرِ نکتہ داں

نقشِ ہستی آہ اے شیلے! مٹ گیا تیرا تو کیا — نقش ہیں برسوں رہیگا تیرا اندازِ بیاں

آ نکلے تیری زیارت کے لئے اہلِ سخن — روم میں باقی ہے جب تک تیری تُربت کا نشاں

تیرے ہیرو کی ہی پیوندِ زمیں اب آہ ایک — تیرے ساحل سے نہیں اُٹھتا ہے اب اٹلی دھواں

بیکسوں پر رحم کر اے دستِ بیدادِ فلک! — خُوں رُلاتی ہے تمناؤں کو یادِ رفتگاں

مارتا ہے تیر تو اُس دل پہ صیادِ اجل! — آگ کے شعلے بھی پہنچتے نہیں جس تک یہاں

آہ اے دُنیا نہیں ہرگز کسی قابل ہے تو
حسرت و غم جس کا ہے انجام وُہ محفل ہے تو

سرور جہان آبادی

سرودِ فنا

جیتے ہی جی جہان کے جھگڑے پچاس تھے — اُمید و بیم حرص و ہوس درد و یاس تھے

زحمت قرین کبھی کبھی رحمت کی پاس تھے — دم تھا تو دامِ دہر کے ہر دم ہراس تھے

خاکی طلسم آج ہر آفت سے پاک ہے
جس خاک سے بنا تھا وُہی مشتِ خاک ہے

گرمی سے آفتاب کی خوفِ سقر نہیں — سردی سے سردآہ کی دردِ جگر نہیں
دُنیا کے رنج و غم کا نمایاں اثر نہیں — پہنچے ہیں ایسے گھر میں کہ عزمِ سفر نہیں
اب تابِ حُسن ہے نہ حسینوں کی تاک ہے
جس خاک سے بنا تھا وہی مُشتِ خاک ہے

کچھ خوف جَور کا ہے نہ ظالم کا ڈر ہے آج — افلاس کا خیال نہ درکارِ زر ہے آج
گلبن کی جا ببُول کوئی قبر پر ہے آج — اِک ڈھیر خاک کا سا سرِ رہگذر ہے آج
جمشید جاہ یا کوئی رشکِ ضحّاک ہے
جس خاک سے بنا تھا وُہی مشتِ خاک ہے

بجلی گرے ہزار تو ہرگز نہیں ضرر — دریا بہائے ابر برس کر تو کیا خطر؟
دورِ فلک کا جَور گیا سر سے سب گذر — دہشت نہ طعن سے ہے نہ تہمت سے کوئی ڈر
فکرِ کفن سے گور کا اب سینہ چاک ہے
جس خاک سے بنا تھا وُہی مشتِ خاک ہے

پانی میں آج کوئی بہا دے تو ہیچ ہے — یا جل کے کوئی آگ لگا دے تو ہیچ ہے
موجِ ہوا یہ دُھول اُڑا دے تو ہیچ ہے — مٹی میں کوئی مٹی ملا دے تو ہیچ ہے
خالی مکان خاک جو بے جان پاک ہے
جس خاک سے بنا تھا وُہی مشتِ خاک ہے

طالب (بنارسی)

ترجمۂ اینک آرڈن

مصنفہ

(لارڈ ٹنی سن مرحوم ملک الشعرائے انگلستان)

اک سلسلہ ہے پہاڑیوں کا ۔۔۔ بہتا ہے جس کے نیچے دریا
اُن میں کئی ایک جو درے ہیں ۔۔۔ کف سے اور ریت سے بھرے ہیں
آگے اک گھاٹ کی برابر ۔۔۔ ہیں سامنے لال لال کچھ گھر
ہے بیچ میں اک پرانا گرجا ۔۔۔ آثارِ قدیم کا نمونا
اور آگے جو سڑک بنی ہے ۔۔۔ اونچی ہوتی چلی گئی ہے
دیکھو جو اُدھر نظر اٹھا کے ۔۔۔ گرنی کے بلند ہیں منارے
گرنی کے عقب میں جو سماں ہے ۔۔۔ قوتِ دل و قوتِ رواں ہے
اونچا سا نزہ مرغزار دلکش ۔۔۔ سبزہ جس کا زمرّدیں وش
دکھلاتے ہیں دورِ چرخ کا پھیر ۔۔۔ ڈنمارکیوں کے جابجا ڈھیر
ہے وہاں جو نشیب خوشنما سا ۔۔۔ جیسے کشتی میں ہو کٹورا
ہیزل کے اُس میں ہیں گھنے جھنڈ ۔۔۔ خوانِ یغما ہے جس سے یہ گنڈ
یعنے کہ بہار جب ہے آتی ۔۔۔ لڑکوں کو ہے ساتھ گھیر لاتی
خوش خوش سب چنتے ہیں پھل ۔۔۔ جنگل میں ہیں مناتے منگل

. . . .

سو سال ہوئے کہ اس جگہ پر ۔۔۔ ساحل کے کنارے آ کے اکثر

کھیلا کرتے تھے تین لڑکے گو تینوں کے گھر جُدا جُدا تھے
ایک اُن میں حسین اینی لی تھی تھی رشکِ شباب جس کی طفلی
گو سِن تھا بہت صغیر اُس کا بستی میں نہ تھا نظیر اُس کا
لڑکا اک دوسرا فلپ تھا گرنی والے کا تھا جو بیٹا
تھا جان وُہ مادر و پدر کی اک شمع یہی تھی اُن کے گھر کی
تھا تیسرا اینک آرڈن نام ملّاح کا طفل بے سرانجام
طوفان نے بے پدر کیا تھا بچپن میں یتیم ہو گیا تھا
تینوں شیر و شکر تھے باہم دُنیا کا نہ تھا اُنہیں کوئی غم
طفلانہ تھا کاروبار اُن کا بس کھیل تھا روزگار اُنکا
ساحل کی گری پڑی غنیمت اُن کے حق میں تھی اک دولت
انبار کہیں تھے ریسماں کے ٹکڑے کہیں ڈھیر بادباں کے
بوسیدہ کہیں سے جال اُٹھا لائے کشتی کوئی پانی سے ہٹا لائے
ریتی کے محل بنا رہے ہیں کچھ لطف اسی میں پا رہے ہیں
شورِ امواج دیکھتے ہیں وُہ گھر تاراج دیکھتے ہیں
ہر روز اسی طرح ہیں آتے اور نقشِ قدم ہیں چھوڑ جاتے
لے جاتی ہے لہر جن کو آ کے تا چشمِ حباب میں جگہ دے

. . . .

ٹیلے کے نیچے ایک ہے غار مثلِ دلِ تنگ تیرہ و تار
تھے کھیلتے آ کے یاں وُہ اطفال تھے حال میں اپنے مست و خوشحال
جو جو ہیں امورِ خانہ داری طے ہوتے تھے یُوں وہ باری باری

ہے صاحبِ خانہ گر فلپ آج ہوتا اینک کا کل کے دن راج
لیکن بنتی تھی روز اپنی دونوں کے ساتھ گھر کی بیوی
ایسا بھی گاہے ماہے ہوتا اینک کئی روز رہتا تنہا
آتا جو فلپ تو یہ تکرار کہتا مرا گھر ہے یہ دلدار
دیتا تھا فلپ جواب اُس کو بیوی میری بھی ہے یہ خوشخو
باہم جھگڑا جو پیش آتا اینک نہ قوی تھا فتح پاتا
اُس وقت فلپ بہ یاس و حسرت بھر کر آنکھوں میں اشکِ خجلت
اینک کو بُری بھلی سناتا کہتا جو جی میں اُس کے آتا
صورت یہ دیکھتی جب آینی ثالث دونوں میں آپ بنتی
سنگت کے لئے ملال کرتی آنکھیں رو رو کے لال کرتی
کہتی نہ لڑو ہماری خاطر کرتی ہے مجھے تمہاری خاطر
باہم تم کو نہ لڑنے دونگی بیوی دونوں کی میں بنونگی

. . . .

ہر صبح بہارِ عہدِ طفلی صبح کاذب نئی تھی سپیدی
گذرتے وُہ دن شباب آیا بالائے سر آفتاب آیا
آئی جو ہوائے باغِ اُلفت دونوں لگے کھانے داغِ اُلفت
دل میں چُبھے عشق کے جو کانٹے بُلبل ہُوئے دونوں ایک گل کے
موقعہ اینک نے پاکے ناگاہ اُس کو کیا حالِ دل سے آگاہ
پر لب پہ جو مُہرِ خامشی تھی اُلفت نہ فلپ کی کھُلنے پائی
اینک ہی کی آینی کو بھی تھی چاہ گو دل کی لگی سے تھی نہ آگاہ

پر شکل اُدھر کچھ اور ہی تھی — اینک کے دل کو لو لگی تھی
تھی فکر اُسی کی دھیان اُسی کا — تھا خانۂ دل مکاں اُسی کا
دُھن یہ کہ جو بچ سکے بچائے — کشتی ایک اُس سے مول لائے
جب آمدنی کے ہوں کچھ آثار — اینی کے لئے بنائے گھر بار
تھا نیک خیال اُس کا جیسا — آخر ہوا بامراد ایسا
ماہی گیروں میں منزلوں تک — آتا تھا نظر نہ مثل اینک
تھا ایک ہی وہ میانِ ساحل — خوشحال جفاکش اور پُردل
اِک سال وہ اُس کے بھی علاوہ — ملّاح کا کام کر چکا تھا
جس سے خوب اُس کو ہوگئی تھی — مشقِ فنِ جہاز رانی
طوفاں میں بھی تین بار اس نے — پائی تھی نجات اجل کے منہ سے
اب چلنے لگا تھا کام اُس کا — مشہور تھا سب میں نام اُس کا
طے ہو چکی اس طرح بہ مشکل — اکیسویں عمر کی جو منزل
ذاتی کشتی خرید لایا — چلتے ہوئے کام کو بڑھایا
گرنی کی سڑک پہ گھر بنایا — چھوٹا خوش وضع صاف ستھرا
مقصد کا حصول دل میں ٹھانا — اینی کے لئے کیا ٹھکانا

. . . .

آخر آیا وہ نیک ہنگام — اور موسمِ گل کی جانفزا شام
اُس گانوں کے طفل و جوان جب — تعطیل منانے آتے تھے سب
جھولی لئے کوئی کوئی ڈالی — پھل چُنتے تھے بھر کے ڈالی ڈالی
لیکن تھا فلپ کا باپ بیمار — ساتھ آ نہ سکا وہ سب سے ناچار

آنے میں جو ہو گئی ذرا دیر — قسمت نے دکھایا اور ہی پھیر
آیا دل میں بھرے ہوئے ذوق — ٹیلے پہ چڑھ گیا بصد شوق
نزدیک نشیب کے جو پہنچا — جھاڑی ہے گھنی جہاں۔ تو دیکھا
اینک اور ایتی دست در دست — بیٹھے ہیں شرابِ عشق سے مست
اینک کا رُخ تعب کشیدہ — سرد و گرمِ زمانہ دیدہ
اور اُس کی وہ چشم ہائے میگوں — اندازِ نشاطِ دشت و ہاموں
اِک جانِ بہار۔ دل کشِ عشق — اِک شعلہ فروشِ آتشِ عشق
اُن کے چہروں پہ جو لکھا تھا — جس کی قسمت کا فیصلہ تھا
دونوں کو لب بہ لب جو دیکھا — سینے سے اِک دھواں سا اُٹھا
آہستہ سے بسملوں کے مانند — دل باختہ بیدلوں کے مانند
جھاڑی میں اُتر گیا وہ غمگیں — جی کھول کے زار نالیاں کیں
خوشیاں سب اُدھر منا رہے تھے — حرماں جان اُس کی کھا رہے تھے
آخر اُٹھا چلا بمشکل — گھر کی لی راہ داغ بر دل

. . . .

اللہ نے پھر یہ دن دکھایا — اینک کا مُدعا بر آیا
گرجا میں خوشی خوشی جرس نے — شادی کے بجائے شادیانے
دِن کٹنے لگے ہنسی خوشی سے — کس لُطف سے سات سال گذرے
آپس کا خلوص اور محبّت — محنت کی کمائی اور قناعت
مسعود یہ عہد ہفت سالہ — یُوں صحت و عیش میں گذارا
اولاد بھی حق نے کی کرامت — دُختر ہوئی پہلے اِک عنایت

بیٹی کی صدائے گریہ جس دم — آئی گوشِ پدر میں پیہم
سوچا انجامِ کار مولود — پیدا ہوا یہ خیالِ محمود
جو ہو سکے جس طرح بچائے — تعلیم اچھی اُسے دلائے
ماں باپ میں جو کسر ہے باقی — اولاد میں وہ کمی ہو پوری
پورے کئے شمس کے جو دو دور — قوت ہوئی اس خیال کو اور
یعنے اینک تھا جب سفر میں — آغوشِ محیطِ پُرخطر میں
یا یہ کہ روانِ میانِ بر تھا — راہِ خشکی میں رہ سپر تھا
ازبسکہ وہ نقرہ رنگ ہوا — اور رہ آوردِ بحرِ زخار
اُس کا وہ لال لال چہرہ — محنت سے سفر کی خوشتر تھا
اینک جو ہر جگہ گذر تھا — پہچانا ہوا تھا ہر بشر کا
بازار ہی تک وہ تھا نہ آتا — تھا دامنِ کوہ میں بھی جاتا
ایک ایک گلی تھی اس کی چھانی — ایک ایک ڈیوڑھی تھی اُس کی جانی
ہوتی تھی رسائی اسکی واں پر — ڈیوڑھی وہ قدیم ہے جہاں پر
طاؤس کا در یہ معرکہ ہے — ببر ایک طرف بنا ہوا ہے
اس کی ہر جمعہ کی غنیمت[1] — واں ہوتی تھی زیبِ خوانِ نعمت
اس حال میں آئی جب تھی تنہا — بیٹا خالق نے اُس کو بخشا
لعلِ شب تاب ہاتھ آیا — تنہائی کا غمگسار پایا

ضامن کنتوری

[1] مچھلیاں مراد ہیں ۱۲

خاندان حکیماں لاہور کے سینہ بسینہ مجرب نسخے

مجموعہ ۱۵ اک (کحل بے نظیر یعنی سرمہ بے نظیر) پیشنہ سینہ

اگر کسی صاحب کو نزول الماء - دھند - غبار - ککرے - ضعف بصارت وغیرہ کی شکایت ہو - یا آنکھ کے متعلق کسی قسم کی اذیت ہو تو ہمارا سرمہ منگائیں انشاء اللہ تعالیٰ کل نقص رفع ہوگا - قیمت فی تولہ دو روپیہ عہ نمونہ مفت جو صاحب نمونہ منگوانا چاہیں - تو محصول ڈاک وغیرہ کے واسطے ۴ر کے ٹکٹ ارسال فرمادیں -

شہادتیں - ۲ - اگست سنہ ۱۹۰۳ء } مشفق مکرمی جناب سید حکیم نادر علی شاہ صاحب السلام علیکم مزاج شریف - آپکے مشہور کحل بے نظیر کا میں نے خود بھی امتحان کیا - دو ر احباب نے بھی اسکی بابت رائے پوچھی - میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ یہ سرمہ اسم بامسمےٰ ہے - دھند غبار سرخی چشم کے رفع کرنے میں فوری اثر رکھتا ہے - حکمت اگرچہ آپکا وراثتاً حصہ ہے لیکن اس خاص شوق اور دلچسپی کے باعث جو آپ کو قدرتاً اس فن میں ہے مجھے امید واثق ہے کہ آپ دن دونی رات چوگنی ترقی کرینگے - والسلام -

آپکا مخلص فقیر سید سعید الدین حسٹرار عدالت خفیفہ لاہور (حال منصف پٹھان کوٹ)

کرم فرمائے بندہ جناب حکیم صاحب دام الطافکم :-

بعد سلام سنت الاسلام دانکہ مزاج شریف ہو - آپکے کحل بے نظیر کا میں نے استعمال کیا اور اسکو واقعی بے نظیر پایا - مجھکو عرصہ سے ضعف بصر اور غبار و دھند کی شکایت تھی اور آنکھوں میں پانی بھرا رہتا تھا بہت سے مختلف اشتہاری سرموں کا استعمال کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا - البتہ آپکے سرمہ سے آنکھوں کو بہت فائدہ پہنچایا اسمیں خاص خوبی یہ ہے کہ روز اول کے استعمال سے ہی آنکھیں صاف غبار اور پانی خشک ہوجاتا ہے - آنکھوں میں قوت بینائی زیادہ ہونے لگتی ہے اسلئے خواہ مخواہ دل چاہتا ہے کہ ہر روز بلا ناغہ استعمال کیا جاوے اشتہاری دوا کے خریدنے سے جو مایوسی سی دل میں ہوا کرتی ہے - وہ اسکے اول روز کے ہی استعمال سے دور ہوجاتی ہے اور قیمت ادا کردہ کا افسوس نہیں ہوتا اس سرمہ کے روز اول ہی کے استعمال سے مجھے اسقدر فائدہ ہوا ہے - جو دوسرے سرموں کے چالیس دن تک کے استعمال سے نہیں ہوا ہے

رقیمہ نیاز عبد العزیز کلرک دفتر پوسٹماسٹر جنرل صاحب بہادر پنجاب و نارتھ ویسٹ فرنٹیئر

مرقومہ ۳۱ - اگست ۱۹۰۳ء

پتہ - حکیم سید نادر علی شاہ - بازار حکیماں لاہور پنجاب

وکیل اور زمیندار کا قصہ

کسی گاؤں میں ایک سادہ لوح و غریب زمیندار رہتا تھا۔ ناگہاں ایکدن اسکو شہر جانیکا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک مشہور وکیل سے ملا اور پوچھا کہ مجھے بچنے کی کوئی راہ بتلا دیں۔ وکیل نے اپنی فیس لیکر ایک بند لفافہ زمیندار کے حوالے کیا۔ گھر میں آکر شام کے وقت زمیندار نے لفافہ کھولا۔ تو لکھا تھا۔

جو کام آج کر سکتے ہو اسکو کل پر مت ڈالو۔

زمیندار کا ہزاروں من چارہ باہر کھیت میں پڑا تھا۔ فوراً اسکو گھر لاکر مکان کے اندر رکھوا دیا۔ رات کو طوفان آیا اور بارش موسلا دھار ہوئی جن لوگوں کا چارہ باہر تھا۔ سب بہ گیا۔ ملک دن سارے گاؤں میں صرف زمیندار ہی ہشاش بشاش تھا۔ طاعون کا طوفان بارش کے طوفان سے بدرجہا خوفناک ہے جو لوگ زمیندار کی طرح خوش و خرم بیفکر رہنا چاہتے ہوں۔ انکو طاعون کی دوا ہر وقت گھر میں رکھنی چاہئے۔ ہمکو کبھی نہیں سنا۔ کہ کسی مریض نے ہماری دوا کا استعمال کیا ہو اور وہ راضی نہوا ہو۔ یا کسی تندرست آدمی نے اسکا قطرہ استعمال کیا ہو اور وہ طاعون کا شکار ہوا ہو۔

۱۔ دوائی طاعون ہزاروں جانیں بچا چکی ہے۔ قیمت دو روپے فی شیشی۔

۲۔ خضاب۔ مثل تیل چنبیل کے لگایا جاتا ہے۔ سفید بالوں کو سیاہ بھنورے کے اصلی رنگت دیتا ہے بالوں کو ریشم جیسے نرم رکھتا ہے۔ جلد پر داغ نہیں دیتا۔ قیمت دو روپے (۲)

۳۔ روغنی گولیاں۔ انکے استعمال سے بال ہمیشہ سیاہ رہتے ہیں اگر سفید ہو گئے ہوں تو بھی آہستہ آہستہ سیاہ ہو جائیں گے (۲)

۴۔ ملک ... چہرے کے جھائیں۔ چھائیاں سیاہ داغ و کیل دور کر دیتا ہے خوبصورتی کیواسطے لازمی ہے قیمت (۱)

۵۔ دوائی بواسیر۔ بواسیر خونی ہو یا بادی مستے اگر ہوں تو بلا تکلیف گم۔ بشرطیہ شفا قیمت (۲)

۶۔ روح الشفا معدے کی سب بیماریوں کے واسطے اکسیر ہے قیمت (۱)

۷۔ روغن کان بہرے ہوں بہتے ہوں درد سا ساں طرح طرح کی آوازیں آتی ہوں فوراً آرام ہوتا ہے قیمت (۲)

۸۔ سرمہ بینظیر۔ دھند۔ غبار۔ لالی۔ پڑبال۔ پانی۔ جالا۔ ناخنہ وغیرہ کیواسطے اکسیر ہے آنکھ کے واسطے مفید امریکہ و جرمنی تک مشہور (۲)

۹۔ [illegible] بلا تکلیف [illegible] دو منٹ میں [illegible] قیمت [illegible] فی شیشی [illegible]

ملنے کا پتہ۔ ڈاکٹر کیسر سنگھ ایم اے بی حکیم ہسپتال فیروز پور شہر (پنجاب)

دوسو روپیہ ماہوار کی اسامی

حکیم محمد شریف صاحب آئی ڈاکٹر لاہور مقدمہ کتاب سرمایۂ نشاط کی پیروی کے لئے ولائت تشریف لیجاتے ہیں۔ اُنکو اپنے کارخانجات کے مینجمنٹ کے لئے اشتہاری دنیا سے ماہر تجربہ کار بی۔ اے پاس مینجر کی ضرورت ہے۔ تنخواہ دوسو روپیہ ماہوار دینگے ۔

درخواستیں حکیم صاحب کے نام بھیجنی چاہئیں۔

آپ بہت کچھ کما سکتے ہیں

ہم کو تمام انڈیا کے ہر ایک شہر اور قصبہ میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔ تنخواہ دار اور کمیشن پر کام کرنے والے سردست

دو ہزار ایجنٹ

رکھے جاوینگے۔ ہیڈ ایجنٹوں کے سوائے۔ اسٹیشن ماسٹر۔ پوسٹ ماسٹر۔ سکول ماسٹر۔ پٹواری۔ عرضی نویس۔ ضلعدار۔ قانون گوئے۔ کلرک وغیرہ کمیشن ایجنٹ مقرر ہو سکتے ہیں۔

کمیشن معقول دیجاویگی۔

تمام درخواستیں حکیم محمد شریف آئی ڈاکٹر۔ لاہور کے نام آنی چاہئیں۔

مخزن

وطن آخر وطن ہے

(ترجمہ از فرانسیسی)

(۱)

آنڈالبرے ڈوڈویر مقام فلیڈلفیا کی سمتھسن کمپنی کے مشہور تجارتی کارخانہ کا معتبر ملازم اپنے کمرے میں مضطربانہ پھر رہا ہے۔ اِدھر سے اُدھر جاتا ہے اور اُدھر سے اِدھر آتا ہے۔ کوئی پریشانی دامنگیر ہے۔ کبھی اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے اور کبھی تُند و تیز حرکات سے اُس بحث کا اظہار کرتا ہے۔ جو اس کے دل میں اندر ہی اندر جاری ہے۔

اگر اُس کے دوستوں میں سے کوئی اُسے اِس وقت دیکھے۔ تو یقیناً حیران ہو۔ کیونکہ فلیڈلفیا میں اس کے جاننے والے سب اُسے کامیاب آدمی سمجھتے ہیں اور باعثِ رشک خیال کرتے ہیں۔ جب سے اُس نے امریکا میں قدم رکھا۔ کامیابی نے اُس کا ساتھ دیا۔ اُسے ابھی دو برس سے زیادہ یہاں نہیں گذرے۔ مگر ہر ایک کے دل میں اُس نے گھر کر لیا ہے۔ اور گو ابھی اس کی عمر تھوڑی ہے۔ تاہم اس کارخانے میں ذمہ واری کا کام اس کے سپرد ہے۔ اس بنا پر لوگ اُسے ذی فہم اور ہونہار نوجوان سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ ایک دن مالدار ہوگا۔

چند ہفتوں سے اُسے ایک اور خوش قسمتی حاصل ہے۔ سمتھسن صاحب کی بیوی نے اُسے

اپنے شام کے بے تکلف جلسوں میں آنے کا کئی بار موقعہ دیا ہے۔ اور وہاں مس ادا بلا سمتھ اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے چاء کی پیالیاں اُسے دیتی ہے اور اپنے لطف آمیز تبسم اور مہربانی کی نگاہوں سے اس مزے کو اور دوبالا کرتی ہے۔ چنانچہ آج قرارداد کے مطابق ان دونوں ماں بیٹیوں کے ساتھ اُسے نمائشگاہِ عام میں باجا سننے جانا ہے۔ جہاں ہر قوم کے موسیقی کا نمونہ دکھایا جانے کو ہے۔ اس عزت پر اس کے بہت سے ہمسروں کو رشک ہے۔ وہ اس میں معنی پیدا کرتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ محبت کے کرنے سے وہ شادی کی لاٹری میں بہت سا مال جیت لیجائیگا۔

با ایں ہمہ اگر وہ متفکر ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اُسے آج ہی اپنے باپ کا ایک خط ملا ہے جس کے مضمون نے یہ اضطراب اُس کے دل میں پیدا کیا ہے۔ بوڑھا ڈُودیر ایک پنشن یافتہ فوجی کمان افسر ہے۔ جو اپنے زاد و بُوم۔ فرانس کی خدمت کے بعد وہیں ایک گانوں میں اپنی آزادی کے دن کاٹ رہا ہے۔

آنڈرے نے کچھ عرصہ ہوا اپنے باپ کو ایک تجویز لکھ کر بھیجی تھی۔ جس میں امریکا میں مستقل سکونت اختیار کرکے قانوناً وہیں کا باشندہ قرار دیا جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ یہ اُس تجویز کے جواب میں ہے۔

بوڑھے سپہ سالار کے خط کا مضمون ذیل میں درج ہے:۔

میرے پیارے انڈرے

جب مدرسے سے نکلتے ہی تم نے مجھے یہ کہا کہ تم سپہ گری کا پیشہ اختیار کرنا نہیں چاہتے تو مَیں نے تمہاری خواہش کو تسلیم کیا۔ سپاہی ہونے کے لئے اپنے فن کا شوق اور ایثار کی خصلت درکار ہے۔ تم اس صدی کے آخری حصّے کی پیدائش ہو۔ تمہارے خیالات اَور ہیں۔ اور تم نے کوئی اور ذریعہ معاش تلاش کرنا چاہا۔ پس مَیں نے مناسب نہ سمجھا کہ مَیں اپنے خیالات کی موافقت پر تمہیں مجبور کروں۔

میں صفائی سے اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہُوں۔ کہ جب سے تم فرانس سے گئے ہو۔ تم نے

اپنے فیصلے کی عمدگی کا اپنی نمایاں کامیابی سے عملی ثبوت دیا ہے اور جو خط مجھے فلانڈرز سے آیا ہے اس میں تمہاری تعریف ہی آئی ہے۔

مگر اب جو تم جلدی امیر ہونے کی خاطر، دیر کی جنگ سے بچنے کی غرض سے ایک دوسری قوم میں شامل ہونا چاہتے ہو اور اپنے وطن کو ترک کرنا چاہتے ہو۔ جیسا کوئی پرانے کپڑے کو اتار کر پھینک دیتا ہے۔ تو اے پیارے بیٹے۔ میں سخت ہمدردانہ خیالات سے اس کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ تمہارے لئے پھر یورپ میں آنا باعث تکلیف ہوگا۔ اوّل تو تمہیں ہر سال فوج میں صرف کرنے پڑینگے۔ جو ہر ایک کے لئے لابد ہے۔ اگر وہ فرانسیسی رہنا چاہے۔ مگر فرض کا خیال، قومیت اور فرض یہی حکم دیتا ہے۔ کہ تم واپس آؤ۔

جان پدر! وطن اس جگہ کو نہیں کہتے جہاں معاش میسر ہو۔ بلکہ یہ اس سرزمین کا نام ہے جہاں والدین رہتے ہوں۔ جہاں آبا و اجداد کی ہڈیاں مدفون ہوں۔ یا جہاں تمہارا جنم ہوا ہو اسی کی خاطر تمہارا دادا دشمن کے ہاتھوں مارا گیا۔ اسی کے واسطے مجھے لوادر کی فتح میں زخمی ہونے کی عزت حاصل ہوئی۔ آؤ اور اس پیارے جھنڈے کے نیچے اپنی جگہ لو۔ جس نے تمہارے بزرگوں کے خون کا رنگ دیکھا ہے۔

میں اپنے زمانے میں خاصی ترقی کرتا رہا ہوں۔ گو مجھے کوئی بڑی جاگیر نہیں ہوئی لیکن میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اپنے ملک کو دیا ہے۔ اور آڑے وقت میں اس کے کام آیا ہوں۔ اور اس وقت میں جو کچھ ہوں فرانس کی طفیل ہے۔

جب تم گھر سے نکلے تھے۔ اور میں نے تمہیں گلے لگا کر تمہاری پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ اس وقت میں نے عہد کیا تھا۔ کہ تم میرے بعد اپنے ملک کی خدمت کرو گے اور تمہاری نسل ہمیشہ بڑھ کر خوش قسمت ہوگی۔

اَے فرزند! مَیں تم سے درخواست کرتا ہوں۔ اور اگر ضرورت ہو۔ تو تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم فرانسیسی رہو۔ اور اپنا وطن نہ بدلو۔

کماندار۔ ڈُوودیو"

انڈرے نے اس خط کو پھر ایک دفعہ پڑھا اور میز کے قریب آ کر کانپتے ہوئے ہاتھ سے جواب لکھنا شروع کیا۔ جس کا یہ مضمون تھا:-

میرے والدِ بزرگوار!

آپ نے لکھا ہے۔ کہ وطن اُس جگہ کو نہیں کہتے۔ جہاں معاش ہو۔ منظور! مگر کیا اس جگہ کو بھی نہیں کہتے۔ جہاں اُس کا محبوب ہو۔ میرا دل یہاں ہے۔ اور میرا کاروبار یہاں ...

مجھے فرانس جسے مَیں نے مدرسے کی کھڑکیوں سے ہی دیکھا ہے۔ اب اچھی طرح یاد بھی نہیں ہے اور نہ مجھے اُس کا چنداں خیال ہے۔ آپ کے لئے اُس نے کیا کیا ہے۔ آپ نے اپنی ساری زندگی اس کی خدمت میں وقف کر دی۔ اور اس کے بدلے اپنا خون بہایا۔ اس کے عوض میں آپ کے کندھے پر ایک رنگدار فیتہ بڑھانے اور بڑھاپے میں محض گذارے کے موافق مدد دینے کے سوا اس نے کیا کیا۔ مگر امریکا نے مجھے دولتمند اور باثر بنا دیا۔

اباجان! مَیں اس بارے میں آپ کی حکم عدولی پر مجبور ہوں۔ گو مجھے اس کا سخت افسوس ہے۔ مگر مَیں اپنی جوانی کے تین بیش قیمت برس گولہ باری سیکھنے میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اور جتنی جلدی ممکن ہوگا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی آزاد مملکت جمہوری کے اہالی میں شامل ہو جاؤنگا۔

نوجوان انڈرے یہاں تک لکھنے پایا تھا۔ کہ ٹائم پیس نے گھنٹی بجائی۔ اور اُسے معلوم ہوا کہ مسٹر سمتھسن صاحب و مِس سمتھسن سے ملنے کا وقت ہو گیا۔ اُس نے قلم رکھدیا اور خط ختم کئے بغیر وہ اُن کی ملاقات کے لئے گھر سے نکلا۔

۲

فرانسیسی نوجوان کا مع دو خواتین کے تماشگاہ میں داخل ہونا باوجود مجمع کی کثرت کے لوگوں کی

نظر سے بچا نہیں۔ کئی نگاہیں اُن پر پڑیں۔ دو جوان دراز قد۔ چھریرے بدن کا۔ سیاہ مونچھیں بانکپن سے
چڑھائے ہوئے۔ فرانسیسی نسل کا ایک عمدہ نمونہ تھا۔ اور اُس کے ساتھ والی مس اِزابل کی خوبصورت
نیلگوں آنکھیں۔ نازک کمر۔ سنہری بال اُن حسینوں کو یاد دلاتے تھے جن کے فسانے دنیا بھر میں مشہور ہیں
جہاں باجا بجتا تھا۔ اُس کے قریب کی کرسیاں بالکل بھری تھیں۔ لیکن چونکہ ان تینوں کے لئے کرسیاں
پہلے سے مخصوص ہو چکی تھیں۔ اس لئے انہیں جگہ ڈھونڈنے میں دقت نہیں ہوئی۔ کورٹ
میں کسی قدر مسافت تھا۔ نزدیک ہی ایک جگہ پر ایک گروہ سفید رنگ کے ابھرے ہوئے کالروں والے
آدمیوں کا بیٹھا تھا۔ جو آسانی سے پہچانے جاسکتے تھے کہ جرمن لوگ ہیں۔

انڈرے اپنی خوش نصیبی کو کوشش سے بہتر جانتا تھا اور اُس کے کان موسیقی سے
بڑھ کر اس کی آواز کی طرف لگے ہوئے تھے۔ کہ اتنے میں ایک عام حرکت سی معین ہوئی۔
جس نے اس کے خیالات کو جو موہوم تصاویر کے کالے بادلوں میں پرواز کر رہے تھے۔ زمین کی طرف
دم بھر کے لئے واپس بلا لیا۔ یعنی پیرس کی جمہوری سلطنت کے دستہ فوج کا باجا شروع ہو گیا۔

اچانک وہ کیا دیکھتا ہے۔ کہ وہ وردی جس کو وہ بچپن میں خوب جانتا تھا۔ اس کے سامنے
موجود ہے۔ اور وہ تین رنگ کا جھنڈا جو تمام دنیا کے گرد فرانس کی شہرت اور آزادی کا آوازہ
بلند کرنے کے لئے پھر چکا ہے۔ اُس کے پیش نظر ہے۔ اِن کے دیکھتے ہی وہ سب باتیں جنہیں
وہ اپنے ذہن میں بھلا بیٹھا تھا سرعت سے اس کے دماغ میں پھر گئیں۔

سب لوگ سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ایک سکوت کا عالم تھا۔ صرف ایک آواز اس
سکوت میں مخل تھی اور وہ ایک جرمن کی تھی۔ جو اپنے رفیقوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے طنز
آمیزی سے ہنس رہا تھا۔ انڈرے نے سمجھا کہ وہ فرانسیسوں کے قومی جھنڈے کی ہنسی
اُڑا رہا ہے۔ اُس نے بے اختیار۔ بے سوچے سمجھے۔ پکار کر کہا "شش ہش" اور کہنے کے
بعد خود اپنے آپ پر متحیر ہوا۔

باجے کے افسر نے اپنی چھڑی اٹھائی۔ نقارے پر چوٹ پڑی۔ زنگولے بجنے لگے۔ اور موسیقی کا غیرفانی راگ کمرے میں گونج اٹھا۔ سارا زمانہ اِس لَے کو پہچانتا ہے۔ فرانس کے مشہور انقلاب میں یہی آوازہ جنگ تھی۔ جس نے لوگوں کے دل ہلا دیئے تھے۔ اور جب باجا ختم ہوا تو سننے والوں نے بے ساختہ داد دی۔ اور تالیوں پر تالیاں بجیں۔ مگر ایک طرف سے ایک حقارت آمیز سیٹی سنی گئی اور یہ اسی جرمن نے بجائی۔ جسے انڈہامے خوش رہنے کو کہہ چکا تھا۔ اِس پر فرانسیسی نوجوان بے قابو ہو گیا۔ اُسے سب کچھ بھول گیا۔ نہ یہ خیال رہا کہ اُس کی آرزوئیں کیا کیا ہیں۔ نہ یہ کہ وہ کس کے ساتھ ہے۔ یا کہاں ہے۔ غرض سب خیالات جو ابھی اِس کے دماغ میں سمارہے تھے کافور ہو گئے۔ اُسے یاد نہ رہا کہ باپ کے خط کا جواب ابھی ابھی وہ کیا لکھ رہا تھا۔ حُبِ وطن کی کیا تحقیر کی تھی۔ اور اہلِ امریکا میں شامل ہونے کا اُس کا کتنا پکا ارادہ تھا۔ یہ سب اس وقت نگاہ سے غائب تھا۔ صرف ایک چیز اُسے نظر آتی تھی اور وہ یہ کہ اُس جرمن نے فرانس کی بے عزتی کی ہے۔ اور جیسے کوئی اپنی ماں کی بے عزتی کے انتقام کے لئے جھنجھلا کے اُٹھتا ہے۔ اِس طرح وہ تندی کے ساتھ اُس گستاخ جرمن کی طرف بڑھا اور جا کر اُسے گلے سے پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ذرا حواس قائم ہوئے۔ تو اُس نے اپنے جیب سے اپنے نام کا ایک کارڈ نکالا اور اُسے اپنے حریف کو دینا چاہا۔ مگر جرمن نے اُسے لینے کے لئے ہاتھ نہ بڑھایا۔ گلا گھونٹنے سے وہ پتھر کی طرح ہو گیا تھا اور اُسے اب اِس فرانسیسی سے ڈوئل[۱] لڑنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ بُت بنا ہوا اُس کے منہ کو تک رہا تھا۔ حقارت کے ساتھ حریف کی طرف کارڈ پھینک کر فرانسیسی اُدھر کو مڑا جہاں اُس نے دونوں خواتین کو چھوڑا تھا۔ تاکہ اُن سے معذرت چاہے کہ اُسے جوش نے اِس فعل پر مجبور کیا۔ مگر اُن کی جگہ خالی تھی۔ وہ اِس بکھیڑے کی اُلجھن کے خوف سے اور اُس کی اِس حرکت سے ناراض ہو کر چل دی تھیں۔

---

[۱] ڈوئل یعنی دو آدمیوں کی لڑائی۔ فرانس اور بعض دیگر ممالک یورپ کی قدیم رسم۔ جس میں کئی جھگڑے باہمی رقابت کے اس طریق سے فیصلہ ہوتے تھے اور قانون اس رسم کو روا رکھتا تھا۔ موجودہ قوانین بہت کچھ ترمیم میں لا چکے ہیں۔

۳

ان دو امریکن عورتوں نے جو سلوک اُس سے کیا اُسے دیکھ کر اینڈریو کو شہزادہ امیر البحر
نپولین کے متعلق ایک روایت یاد آئی۔ جب نپولین تباہ ہوا تھا تو اُس کے کسی بے تکلف دوست نے
اُسے لکھ بھیجا تھا۔ "مائی لارڈ۔ انگلستان واپس آجائیے۔ اپنے ملک کی عورتوں کے تبسم کی کوئی چیز
برابری نہیں کرسکتی"۔ وہ اس بے پروائی سے خیر سگالی کا اظہار ہرگز نہ کرتیں۔ اور جس چیز نے
اُسے اسی قدر رنج پہنچایا تھا۔ اُس کا اُن پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ اس سے اینڈریو کو معلوم ہوا کہ
فرانس اور امریکا صرف بلحاظ جغرافیہ ہی جدا نہیں بلکہ دونوں کے خیالات و عادات میں بھی فرق ہے
جو کسی طرح مٹ نہیں سکتا۔

جیسے سورج کے اثر کے سامنے دھند اور غبار کے بادل دم بھر میں چھٹ کر بکھر جاتے ہیں
اور مطلع صاف ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اُس کے خیالات کے بادل آناً فاناً بکھر گئے اور فرانس کی تصویر
اُس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ ہر عشق کی یہ عجیب خاصیت ہے۔ کہ اُسے کبھی کبھی انسان مُردہ سمجھ
بیٹھتا ہے۔ مگر اس کی چنگاری راکھ کے نیچے چھپی پڑی ہوتی ہے اور اُسے بھڑکانے کے لئے
ایک پھونک کافی ہوتی ہے۔

وہی نوجوان جو اپنے آپ کو صرف کامیابی کا شائق سمجھتا تھا اور جس کی نظر میں تھوڑی دیر پہلے
روپے کے سوا کوئی معبود نہ تھا اب اپنی اصلیت کو صفائی سے سمجھنے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ جس جھنڈے
سے اب وہ اپنا کچھ واسطہ نہیں سمجھتا تھا۔ اُس کی خاطر ابھی ڈُوآل لڑنے پر آمادہ تھا اور اپنی
جان کو خطرے میں ڈالنے کو تیار تھا۔ موسیقی کے راگ کی آواز نے اُسے زمانۂ انقلابِ
فرانس کے سپاہیوں کا سا جوش دیدیا تھا اور خونِ حمیت اس کی رگوں میں حرکت کرنے لگا
تھا۔ کیا تو وہ باپ کے غریبانہ گانوں کو حقارت سے دیکھ رہا تھا اور اُس کے جوش کے جواز
کا قائل نہ تھا اور کیا ابھی ایک جرمن کی ایک ادنیٰ سی حرکت سے کہ وہ سیٹی بجا کر فرانس کے

باپ والوں کی تحقیر جتاتا تھا۔ اُس پر حملہ کر بیٹھا۔ کیونکہ یہ تحقیر اُسے اس مبارک سرزمین کی تحقیر محسوس ہوئی۔

نمائش گاہ سے نکل کر وہ اپنے گھر آیا۔ آتے ہی میز پر وہ خط دیکھا۔ جسے وہ ناتمام چھوڑ گیا تھا۔ اُس کو پھاڑ ڈالا۔ اور کہنے لگا:۔

پیارے باپ! فرانس کے شریف گوزنکسر خدمت گذار! تو حق پر ہے۔ میں اگلے جہاز میں خط کے جواب میں خود تیری خدمت میں پہنچتا ہوں۔ اپنا بازو تیرے حوالے کرتا ہوں۔ اور اپنے وطن کے خادموں کے درمیان جگہ دیئے جانے کی درخواست کرتا ہوں۔"

عبد القادر

خالق باری ایسٹ اینڈ ویسٹ

یہ کتاب امیر خسرو کی شہرۂ آفاق تصنیف کے نمونے پر لکھی گئی ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ بجائے فارسی کی تعلیم کے اس کا منشا انگریزی سکھانا ہے۔ لیکن ہماری رائے میں یہ تصنیف کچھ زیادہ سودمند نہیں کیونکہ کسی مناسب اسلوب پر نہیں لکھی گئی۔ اور اکثر بندش و قوافی کی ضرورتوں کے آگے صحتِ تلفظ و معنی کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

قیمت ـــــــــــ ۶ر

افضل المطابع پریس مرادآباد سے مل سکتی ہے

تعلیم عامّہ کا ایک ذریعہ

میرے خیال میں ہندوستان کی تعلیم عامّہ کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ کتب کا ایک
معقول سلسلہ بطور نصاب تیار ہو۔ اور اس نصاب کا ترجمہ ہندوستان کی سب زبانوں میں کیا جائے
ترجمے کی غرض ملحوظ رکھنے سے نصاب کے بنانے میں بھی مدد ملیگی۔ اس سے نصاب میں سادگی
اور صحت آجائیگی اور اس طرح وہ انگریزی دان لوگوں کے لئے بھی اور کتابوں سے زیادہ مفید
ہوگا۔ لیکن اس کا اصلی مقصد محض ان لوگوں کی خدمت ہو جو صرف مشرقی زبانیں جانتے ہیں۔ ہم
خود مشرقی جو مشرقی رہنا چاہتا ہے ہماری خاص توجہ کا مستحق ہے۔ فرض کیجئے کوئی شخص زباندانی کی
قوت کم رکھتا ہے اور بہت سی زبانیں حاصل نہیں کرسکتا۔ تو کیا یہ درست ہوگا کہ وہ ان خزائن علمی کے
جو اس تعجب خیز زمانے میں جس میں ہم پیدا ہوئے ہیں آیندہ نسلوں کے لئے ایک وراثت ہیں۔
محروم رہ جائے۔ میری دانست میں ایسا ہرگز نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ ان خزانوں سے مالا مال ہونے
کا حق ہر ذی عقل انسان کو پیدا ہوتے ہی حاصل ہوتا ہے۔ علاوہ بریں بہت سی انگریزی درسی
کتابوں کی عبارت اتنی مشکل اور پیچیدہ ہے کہ انگریزی جاننے والے بھی بسا اوقات آرزو رکھتے
ہیں کہ وہ زیادہ سہل اور صاف ہوں۔ کئی مشہور کتابیں جو علم کی کان سمجھی جاتی ہیں۔ ایسی ہیں
کہ ان سے طالب علم کو سوتا نکالنا جس کی تلاش میں وہ محنت کر رہا ہے۔ بہت دشوار ہوتا ہے
لکھنے والے تصنیف کے وقت طالب علموں کی مشکلات اور ضروریات پر کم نظر رکھتے ہیں۔ وہ اپنا
شوق پورا کرتے ہیں اور اپنے علم کی نمود چاہتے ہیں۔ یا تو کسی اپنی پسند کے مسئلے کو ثابت کرنے
کے لئے ادھر ادھر سے مفید مطالب واقعات جمع کرتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ محض اظہار حق
کردیں اور بس۔ اور یا اصل بحث چھوڑ کر جزوی امور میں پڑ جاتے ہیں۔ پھر جزئیات میں ضروری اور

غیر ضروری کی تمیز بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ اگر ضروری اور غیر ضروری تفصیل میں لوگ فرق کرنے لگے تو بہت کچھ بہتری ہو جائے۔ مگر ایسا کم ہوتا ہے اور واقعات اور سوانح اپنی قدر کے موافق ترتیب پاتے ہوئے کم نظر آتے ہیں۔ اگر ایک باب بسبیلِ اعادہ لکھا جایا کرے۔ جس میں تمام مسئلہ مسایل جو کتاب میں ہیں۔ اور جو نتایج اس کے مطالعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ درج ہوں۔ تو طلبہ کے لئے کیسی آسانی ہو۔ اگر ہر باب کی فہرستِ مضامین و مطالب اس کے شروع میں بالالتزام دیجائے اور حواشی پر مطالب کا حوالہ ہو تو بھی کتابیں زیادہ مفید بن جائیں۔ بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن کے ساتھ انڈکس نہیں ہوتا۔ اچھا ہو اگر تعلیمی کتب کے چھاپنے والے کوئی کتاب جو بغیر انڈکس کے ہو چھاپنی منظور نہ کریں۔ اب خواہ مصنف خود انڈکس ساتھ لگائے یا اس کی خاطر کوئی اور واقف کار آدمی چھاپنے والوں کی طرف سے اُسے تیار کرے۔

اگر ہندوستان کے تعلیمی محکموں کے لئے اس قسم کی مفید کتب درسی کا ایک سلسلہ تیار کرنے کی کوشش کیجائے تو صرف مؤلفوں سے کام نہیں چلیگا۔ ایسی کتابوں کے تیار کرنے والوں میں علاوہ اپنے خاص مضامین کی واقفیت کے ایک اور جوہر کا ہونا ضروری ہے۔ اور وہی شانہ ہوتا ہے یعنی یہ کہ مبتدیوں کے لئے مضمون کو قابلِ فہم بنا سکیں۔ اس کے ساتھ زبان کی سلاست کے لئے اس سے بھی زیادہ قابلیت درکار ہے۔ الفاظ ایسے لکھیں جن سے مطلب پوری طرح ادا ہو اور اس کے ساتھ ہی وہ سادگی اور اختصار کی خوبی رکھتے ہوں۔ تاکہ مقررہ حجم کے اندر کتاب تیار کر سکیں۔

مجھے اس فن میں تھوڑا سا تجربہ ہے۔ اگرچہ میں اس قسم کا کام محض شوقیہ کر رہا ہوں۔ لیکن چونکہ میری دلی آرزو ہے کہ علوم جدیدہ کا خزانہ ہندوستان کے ہر طالبِ صادق کے لئے کھل جائے۔ اس واسطے میں اپنے تجربے سے اس وقت کا جو پیش آئی ہے۔ بیان کر دیتا ہوں۔ کیونکہ شاید اس سے کوئی ایسا شخص جو مطلوبہ قابلیتیں رکھتے ہو فایدہ اٹھا سکے اور اس کام کو ایسی طرح سرانجام کر سکے جیسا کہ چاہئے۔

ہندوستان کا حق میری رائے میں سائنس کی دنیا پر اوروں سے مقدم ہے۔ اگر یہ سچ ہو
کہ آریہ نسل ہی نوع انسان کی ایسی شاخ ہے جس سے شائستگی پھیلی۔ تو ظاہر ہے کہ وہ شائستگی
پہلے ہندوستان کی سرزمین میں ہی ترقی پذیر ہوئی ہوگی۔ اس خاندان کی یورپ والی شاخ نے
یونان اور روما کے تمدن کے بقایا کو سمیٹ کر اپنا بنایا جس سے موجودہ زمانے کی شائستگی کا ظہور
ہوا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ بحری فنون انہوں نے ایک ہی نسل سے سیکھے۔ اور انہی فنون
کی بدولت کم از کم دو ہزار سال کی جدائی کے بعد مدت سے بچھڑی ہوئی شاخیں پھر ایک دوسرے
سے ملیں۔ پس ہر ذہین ہندوستانی طالب علم نہ صرف یہ چاہے گا کہ آریہ نسل کی تاریخ میں اپنے ملک کے
صحیح درجہ کو معلوم کرنے کے لئے اسے انسانی تاریخ کے موٹے موٹے واقعات معلوم ہوں۔ بلکہ وہ یہ
دریافت کرنے کی خواہش کریگا۔ کہ اس سے پہلے کیا تھا۔ اور ممکن ہے کہ اس ٹوہ میں وہ یہ بھی
جاننا چاہے کہ اس سیارے پر جس کا نام زمین ہے۔ ذی حس زندگی کا آغاز سائنس والوں کے
نزدیک کب سے اور کیونکر ہوا۔

گذشتہ چالیس پچاس برس میں چند نئے علوم کی ترقی اور پرانے علوم کے متعلق نئی نئی دریافتوں
سے انسان کی تاریخ کے بعض تاریک گوشوں پر روشنی پڑی ہے اور اس روشنی سے یہ بھی اندازہ
لگایا گیا ہے۔ کہ آفتابِ تاریخ کے طلوع سے پیشتر زمین کی حالت کیا تھی۔ زمانۂ قبل تاریخ پر مورخانہ
تحقیقات کے اطلاق کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے مسئلے جو آج تک یقینی اور ثابت شدہ سمجھے جاتے
تھے موہوم اور مشتبہ ہوگئے ہیں۔ اور پہلے ہی کسی مسئلے کی بابت عقائد قائم کر لینے کے خراب نتائج
واضح ہوگئے ہیں۔ اب اتنی بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ ہر قسم کی تحقیقات کے لئے دل مثل
لوحِ سادہ کے ہونا چاہئے۔ اور ابتدا میں اسی صفت کے موجود نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض معروضات
واقعات کے رتبے پر مانی گئیں۔

ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ ان نئے مسائل اور طریقوں کی اشاعت سے کیا فائدہ۔ جب

ان کا اثر منفی ہے۔ کوئی سی چیز یقینی طور پر انسان کو دیتا نہیں۔ بلکہ بعض پرانے خیالات کی نفی کرتا ہے لیکن جس قسم کی کتابوں کی ہم آرزو رکھتے ہیں۔ اُن کے لئے یہ اصول قرار دیا جاسکتا ہے کہ تمام وہ واقعات جو قیاسی مسائل کے ناپیدا کنار سمندر سے مضبوط چٹانوں کی طرح اُبھرے کھڑے ہوں۔ اُن میں جمع کئے جاویں اور ایسے واقعات ابھی اتنے کم ہیں۔ کہ اُن کو یکجا کرنا بہت مشکل نہ ہوگا اور علاوہ بریں ہمارا اصلی مقصود تو اُن کتابوں میں تاریخی زمانے کی معلومات کا جمع کرنا ہے اور اس صیغے میں سب سے بڑی دقت جو لکھنے والے کو پیش آتی ہے۔ وہ انتخابِ واقعات ہے۔ اور اس کی سخت ضرورت ہے۔ تاریخ اب بھی دلچسپ مضمون سمجھا جاتا ہے۔ لیکن تاریخ کی دلچسپی اور بھی زیادہ ہو جائے اگر اُس میں ایسے واقعات بیان کے لئے منتخب کئے جاویں۔ جن کا پائدار اثر دُنیا کی تاریخ پر پڑا ہے۔ یا جن کی وجہ سے کوئی بڑی دریافت ہوئی ہو یا کوئی بڑا اصول سیاست ایسا ہے جس نے بنی آدم کی حالت میں کوئی نمایاں تغیر پیدا کیا۔ مثلاً علمِ تاریخ میں ایسی کتاب کو جسے عام فہم ہر دلعزیز اور مفید بنانا ہو۔ لڑائیوں اور محاصروں۔ ناموں اور تاریخوں۔ شجرۂ نسب اور خاندانی سلسلوں سے پُر کرنا ضروری نہیں۔ سوائے اس حالت کے کہ اِن میں سے کسی کا کوئی اثر اہم پولیٹکل واقعہ پر پڑا ہو۔ کیونکہ ان کی وجہ سے طالب علم کی طبیعت تاریخ کے مطالعہ سے اُکتا جاتی ہے۔ اِسی طرح بعض اوقات چھوٹے چھوٹے واقعات جو کُتبِ تاریخ میں عموماً نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ ایسی کتاب میں قابلِ اندراج ہو سکتے ہیں۔ اگر اُن کا تعلق کسی ایسی تحریک سے ہو۔ جس سے نسلِ انسانی کی فلاح و بہبود متصوّر تھی۔

انسانی زندگی کی ابتدائی تاریخ کے مطالعہ میں جو علم سب سے پہلے کارآمد ہے وُہ علم طبقات الارض ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر طالب علم اس سائنس سے گہری واقفیت حاصل کرے۔ لیکن اس کے ابتدائی مسائل پر جن سے ذی حس زندگی کے مختلف درجوں کا مختلف زمانوں میں پتہ چلتا ہے۔ حاوی ہونا ہر ایک کے لئے ضروری ہے۔ یہی علم ہے جو بتا سکتا ہے کہ کس طرح اوائل میں صرف طبقۂ اسفل

کی مخلوقات سے رُوئے زمین پر تھا۔ اور وہ بتدریج بڑھتے بڑھتے دودھ پلانے والے جانوروں تک
پہنچی اور کس طرح یہ متواتر ارتقا کا سلسلہ آخر انسان تک پہنچا۔ مگر کہاں ہے ایسی کتاب جو ان مختلف
ازمنہ کے حالات پر پورا زور دے کہ جو عام تحقیق کرنے والے کو اس بیان میں دلچسپی ہے۔ اور
اُن جزوی اختلافات سے جو خاص ماہرانِ فن کے سوا ہر کسی کو تھکا دینے والی ہیں۔ پرہیز کرے۔
جتنی کتابیں عموماً اس فن پر لکھی گئی ہیں۔ سب ایسی ہیں کہ عام شائق علم ان سے فوراً اُکتا جائے۔
لیکن اگر کتاب نے اس کے دلچسپ حصے پہلے پیش کیا جائے۔ جس سے شوق بڑھ جائے تو کئی
طالب علم تکمیل کی غرض سے خود بخود جزئیات اور تفصیلات کو دیکھیں گے۔ اور وہ اس علم کی بنیاد
کو مضبوط بنانا چاہیں گے جس کے مطالعہ میں ایک رغبت ان میں پیدا ہو گئی ہے۔ گویا وہ آسان کتاب
علوم و فنون کے دسترخوان پر بیٹھنے والے کو پہلے ان کے ایک گھونٹ کا کام دیگی۔ جس سے زیادہ
مقوی مگر دیر ہضم کھانوں کے لئے اس کی بھوک تیز ہو جائے۔ موجودہ صورت میں اس علم کی
اصطلاحات تک قابلِ اصلاح ہیں۔ اور ان سے بعض دفعہ غلط مفہوم ممکن ہے اور بعض دفعہ اصل
مفہوم نہیں نکلتا۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس کے لئے انٹرنیشنل[۵] کانفرنس علما کی جمع کرنا مفید ہو سکتا ہے
اصطلاحات کے ذکر سے ایک اور علم کی اصطلاحوں کا خیال آگیا۔ ازمنہ قدیمہ کی تاریخ کے
طلبہ جانتے ہیں کہ پرانے لکھنے والوں نے مختلف زمانوں کو مختلف خصوصیات سے نام دیا ہے
مثلاً تانبے کا زمانہ۔ پیتل کا زمانہ۔ لوہے کا زمانہ۔ لیکن اس پر اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی تاریخیں
ایسی مقرر نہیں جن کے اندر یہ خصوصیت دنیا بھر پر صادق آسکے۔ اسی طرح انسان کی تمدن کے
زمانوں پر غور کرتے ہوئے اسے زمانہ شکار۔ زمانہ زراعت۔ یا زمانہ حرفت میں تقسیم کر دیتے ہیں
مگر ان اصطلاحات کو بدل دینا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ ہاں طالب علم کو چاہئے کہ یہ اچھی طرح جان لے
کہ ان تعریفوں کو مطلق تعریفیں نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ یہ ماننا چاہئے کہ یہ محدود رقبوں سے متعلق ہیں

[۵] جس میں مختلف اقوامِ عالم شریک ہوں یا اُن کے تمام مقام موجود ہوں۔

اور ہر حصۂ دُنیا کے لئے مختلف ہو سکتی ہیں۔

ان سب دلچسپ تحقیقاتوں پر عام فہم اور سلیس کتابوں کی ضرورت نہیں۔ اور اگر تعلیمی محکموں کی باقاعدہ کوشش اس کے لئے ابھی تیار نہ ہوا ور اس کے بیحد فوائد کو وہ نہ دیکھ سکیں تو خود اہلِ ملک خصوصاً اُردو دان جماعت کو چاہئیے کہ قابل آدمی اس ضرورت کو پُورا کرنے کے لئے مہیا کریں +

سی۔ ڈبلیو۔ وہٹس (سابق سول سرجن)
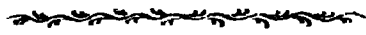
لیل و نہار حضرت طالب کے اس ڈرامے سے ہم اپنے ناظرین کو روشناس پیشتر کرا چکے ہیں۔ ۲۸۔ اکتوبر کی شب کو ہمیں پہلی مرتبہ اس ڈرامے کو سٹیج پر دیکھنے کا موقع ملا۔ لیل و نہار علمی حیثیت سے اعلےٰ پایہ کے ناٹکوں میں شمار ہونے کے قابل ہے اور اس کے مصنف کو اس پر بجا ناز ہو سکتا ہے گفتگو بالعموم چست برجستہ۔ بے تکلف اور بامحاورہ ہے۔ فقرے فقرے کی دلفریبی سامع کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اور اپنی مافوق التوقع انوکھے پن کی وجہ سے دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ عامیانہ اور پیش پا افتادہ ظرافت کو چھوڑ کر ندرت و جدت سے کام لیا گیا ہے۔ فرسودہ فقرات لیل و نہار میں نام کو بھی نہیں۔ اور یہ بات بدرجہ غایت قابلِ داد ہے کہ ان علمی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ڈرامہ میں وہ سب باتیں بھی موجود ہیں۔ جو ڈرامے کو سٹیج پر کامیاب بنانے میں مدد دیتی ہیں۔ لیل و نہار کا ہر ایک باب دلچسپ تغیروں اور سنسنی پیدا کرنے والے نظاروں سے پُر ہے۔ متانت و ظرافت کو پہلو بہ پہلو اس طرح نباہا ہے کہ دونوں کی آمیزش سے ایک عجیب لُطف پیدا ہو گیا ہے۔ جس خوبی کا یہ ڈراما تھا اسی خوبی سے اسے سٹیج پر بھی لایا گیا۔ مسٹر بالی والا نے اس کھیل کی تیاری میں بہت محنت اور روپیہ صرف کیا ہے۔ سینری نہایت قیمتی اور عمدہ ہے اور اس عمدگی کے ساتھ اس قدر صحیح ہے کہ نقل پر اصل کا دھوکہ ہوتا ہے۔ علےٰ ہذا القیاس لباس بھی مناسب موقع ہونے کے علاوہ نہایت شاندار اور خوشنما تھے۔ پارٹس کے دینے میں بھی ذوقِ سلیم سے کام لیا گیا ہے۔ اور ہر ایک ایکٹر کو وہی پارٹ ملا ہے جس کے لئے وہ موزون تھا۔ مسٹر رستم سیٹھنی بوالا نے ڈرامے کے ہیرو فیروز کا مشکل پارٹ نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا اور یہ کہنا کافی تعریف ہے کہ انہوں نے مسٹر ہرمزجی تانترا کے ایکٹنگ کا نمونہ دکھا دیا۔ مسٹر بالی والا نے اشرف کے بھیس میں حسبِ معمول داد ظرافت دی۔ زنانہ پارٹ میں سوسن (مس خورشید) اور دل افروز کا گانا خصوصیت سے پسند کیا گیا +

کتاب

تمام معلوم دنیا پر (سوائے وحشی اقوام کے) کتابوں کی حکمرانی ہے۔ (والٹیر)

خدا جانے لکھے ہوئے حروف میں کیا جادو ہے کہ ہمیشہ سے انسان کے دل میں ان کی توقیر ہے اور گو اس توقیر کی صورت زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتی جاتی ہے لیکن اس کی اصلیت پر زمانہ کوئی اثرِ مخالف نہیں ڈال سکا۔ کتاب کیا ہے لکھے ہوئے حروف کا ایک بڑا مجموعہ۔ یہ حروف کیا ہیں؟ آوازیں۔ آوازیں کیا ہیں؟ انسان کے خیال کی صورتیں۔ اور انسان کا خیال ہی وہ جوہر ہے جس کی قدر لازم ہے۔ خاص کر اس حالت میں کہ انسانی زمانے کے چیدہ افراد کا خیال ہو۔ جو سب بہترین کتب میں ملتا ہے۔ اس لئے آدمی ہمیشہ تربیت کے لئے کتب کی طرف دوڑتا رہا ہے اور تمام دنیا کے داناؤں نے کتب بینی کو مہذب انسان کا بہترین مشغلہ قرار دیا ہے۔ پرانے بزرگوں کے اقوال تو کتب بینی کی تائید میں مشہور ہی ہیں۔

ان لوگوں نے عمریں اس شوق کی نذر کر دیں اور پھر یہ آرزو دل میں لیے گئے کہ کاش اب عمر اور ہوتی تو اس پر کچھ اور پڑھتے۔ دیکھنے کے قابل یہ امر ہے کہ موجودہ زمانے میں بھی جب کہ دنیا کی رفتار تیز ہے مصارفِ زندگی کی شدت نے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ کتاب کے شیدائی موجود ہیں جو اس خاموش دلآرام کے عشق میں ایسے ہی مست ہیں جیسے پہلے زمانے کے لوگ جنکو فرصتیں زیادہ تھیں۔ معروفیت کی گرم بازاری شاید اور کہیں اس درجے پر نہیں جتنی ان دنوں مغربی دنیا میں ہے مگر لطف یہ ہے کہ کتاب کے قدردان بھی وہیں زیادہ ہیں۔ جو زمانہ طالب علمی کی کتب بینی پر اکتفا نہیں کرتے اور باوجود اہم ذمہ داریوں کے شوقِ علم تازہ رکھتے ہیں اور اپنی مثال اور نصیحت دونوں سے دوسروں کو اس شوق کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔

مثلاً مسٹر بالفور باوجود عہدہ وزارتِ انگلستان کی سخت ذمہ داریوں اور پارلیمنٹ کی
مصروفیتوں کے طبقۂ فضلا میں نہایت وقعت اور اعتبار رکھتا ہے۔ وہ وہ کیسا ہی کیوں نہ مصروف ہو مطالعہ
کے لئے وقت ضرور نکال لیتا ہے اور علم کے بڑھانے کی فکر سے غافل نہیں ہوتا۔ مسٹر بالفور کے
خیالات کتاب کے متعلق اس کی مندرجہ ذیل رائے سے معلوم ہو سکتے ہیں:۔

میری یہ قطعی رائے ہے کہ عام تشویق کے لئے علم ادب کے لطف پر زور دینا اس کے نفع پر زور
دینے سے زیادہ مفید ہے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ تمام اس قسم کے لطف انسان کی اخلاقی اور روحانی
ترقی میں مدد ہوتے ہیں مگر ان کی دلچسپی آدھی رہ جاتی ہے اگر ہم ہر وقت ان فوائد پر نظر رکھیں۔ انجام
کار حاصل ہونگے۔ مثلاً اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ قدرت کے خوبصورت مناظر ہماری اخلاقی
اور روحانی ترقی کے لئے ایسے ہی مفید ہیں جیسے علم ادب کی دلچسپیاں۔ لیکن جب ہم قدرتی نظاروں
سے لطف لیتے ہیں تو ہم یوں نہیں کہتے کہ میں فلاں پہاڑی کی چوٹی پر چڑھنے لگا ہوں تاکہ میری روح
کو غذا ملے۔ بلکہ اس وقت جو تفریح اس سے حاصل ہوتی ہے اسی کا خیال زیادہ تر آتا ہے۔ ہم صرف
یہی کہتے ہیں۔ میں نظارے کو جاتا ہوں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ علم ادب کے متعلق بھی یہی سادہ اور
قدرتی طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ ہر وقت علم کے لئے کوئی نہ کوئی انعام ڈھونڈھنے کی عادت (حالانکہ
علم خود اپنا انعام ہے) خواہ وہ انعام مادی صورت اختیار کرے یا محض اخلاقی ترقی سے تعبیر کیا جائے
ایک ایسی عادت ہے جس سے مجھے اتفاق نہیں۔ اگرچہ ہمارا مروجہ سلسلہ تعلیم اس عادت کو پیدا کرتا اور بڑھاتا
ہے۔ آپ یہ نہ خیال فرماویں کہ میں ناممکنات کی آرزو رکھتا ہوں یا امتحانوں کے خلاف ہوں نہیں میں
امتحانوں کو موقوف نہ کروں اگر مجھے ایسا کرنے کا اختیار بھی ہو۔ لیکن یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا
کہ بعض اوقات مجھے بے اختیار یہ آرزو ہوتی ہے کہ کاش آسمان نے کوئی یا دنیا علم موجودہ نسلِ انسانی کے
لئے جو کثرتِ تعلیم کی ستم رسیدہ ہے۔ ایسا رکھا ہوتا جس میں رٹانے والے مدرس اور اتالیق کا قدم نہ گیا ہو
اور جہاں طالب علم اپنے شوقِ جستجو میں آوارہ گردی کر سکے۔ بغیر اس کے کہ ہر خوبصورت درخت یا پھول

پر ایک لیبل لگا ہوا دیکھے اور ہر شکل حل شدہ پانے ہر کرنے کی پیمائش ہو چکی ہو۔ اور ہر موڑ پر ایک راہبر کھڑا ہو جس کا فرض منصبی یہ ہو کہ مسافر کو ایک پامال رستے کا پتہ بتا دے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آجکل علم کے شائق کے لئے بہت سی آسانیاں ہیں۔ ہر شخص کے لئے خواہ وہ بالکل طلب علم کے لئے وقت نہ بھی ہو۔ ممکن ہے کہ صرف اوقات فرصت میں ہی معلومات عامہ حاصل کرے۔ قوانین قدرت۔ حالات تاریخ کے متعلق جو مفید ذخیرہ علمی ہر وقت اس کے لئے دلچسپ ہوگا اور اس کے سوا اسے موقع ہوگا کہ گذشتہ زمانے کے قابل ترین لوگوں میں سے جسے چاہے اپنا رفیق بنا لے۔ یہ تمام حقوق جو انگریز اسے مل سکتے ہیں اور اگر ہم کتاب کے حسن اور علم کے دل دادہ ہیں تو یہ سب کچھ ہمیں میسر ہو سکتا ہے۔ اور جسکو یہ خوش قسمتی حاصل ہے اسے سرد و گرم زمانہ سے بے پروائی ہے۔ دنیا ہمارے موافق ہو یا مخالف ہو۔ دنیا ترقی کے پروں پر اڑتی ہوئی آرام و عافیت کے موعودہ زمانے کی طرف جائے یا لاتحل عقدوں اور لاعلاج مصیبتوں سے پریشانی لائے لیکن جب تک ہمیں اچھی صحت اور اچھا کتب خانہ میسر ہے دنیا بے لطف نہیں ہو سکتی"۔

امریکہ کا مشہور مصنف ایمرسن کس زور سے کتب بینی کے لطف کو بیان کرتا ہے:۔

" ذرا غور تو کرو چھوٹے سے چھوٹے کتب خانے میں کیا نعمت تمہارے لئے رکھی ہے۔ دنیا میں جتنے آدمی ایک ہزار برس میں دانائی اور خوشگوئی میں ممتاز گذرے ہیں۔ انہوں نے اپنے علم و دانش کے بہترین نتائج مرتب کر کے تمہارے سامنے رکھدیئے ہیں۔ اگر وہ جیتے ہوتے تو انکی صحبت ہمیں کہاں نصیب ہوتی۔ وہ عموماً چھپے رہتے تھے۔ تنہائی پسند تھے ملتے جلتے نہ تھے کام میں خلل گوارا نہیں کرتے تھے کہیں آداب مجلس اُن سے ہمکلامی کا مانع تھا کہیں وہ خود کسی سے کلام کرتے ہوئے رکتے تھے۔ مگر یہاں اُن کے وہ خیال جو وہ اپنے گہرے سے گہرے دوست سے بھی شاید ہی کہتے آئینہ وار تمہارے روبرو روشن الفاظ میں رکھے ہیں۔ حالانکہ تم نہ صرف

دوسرے زمانے میں ہو بلکہ اجنبی ہو ان فوائد کے لئے جو اعلیٰ عقلی عمل کا نتیجہ ہیں۔ ہم کتابوں کے ممنون ہیں۔ یہانتک کہ میرا خیال ہے کہ روحِ غیر فانی کا احساس ہمیں کتابوں ہی کی بدولت ہوا ہو"

کتاب پڑھتے ہوئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ جواہر عقلی کی ایک کان تک رسائی ہوگئی ہے اور جتنے جواہر سمیٹے جاسکیں سمیٹ لینے چاہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں جو کتاب سے سرسری آشنائی پر قناعت کر لیتے ہیں مگر پھر وہ اس کی آشنائی سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس باب میں سر آرتھر ہیلپس کی رائے بہت توجہ کے قابل ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

پڑھنے کے متعلق ایک اور پہلو ہے جو باوجودیکہ بدیہی ہے لیکن بہت اختیار کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ پڑھنے کے اثنا میں ہمیں عمدہ عمدہ خیالات کا جو عمدہ الفاظ میں ظاہر کئے گئے ہوں ایک معقول ذخیرہ اپنے دل میں جمع کرتے جانا چاہیئے۔ تاکہ وہ ہر وقت ہمارے پاس ایک زندہ گنجینۂ علم کے طور پر رہے اور اس سے ہم مختلف اوقات میں اور انقلابات کے موقعوں پر اطمینان و ہمدردی حاصل کرسکیں یا اُسے اپنا رہنما بنا سکیں۔ ہر کتاب میں جو پڑھنے کے قابل ہو عموماً کچھ نہ کچھ ایسا موجود ہوتا ہے جو صحت اور درستی کے ساتھ یاد رکھنے کے قابل بھی ہو۔ جس شخص کا دل اپنے ملک کے عمدہ ترین اقوال کی دولت سے مالا مال ہے وہ دوسروں سے زیادہ مستغنی اور زیادہ آزاد رہتا ہے۔ اس کو کوچہ و بازار میں چلتے پھرتے زیادہ مسرت حاصل ہوتی ہے۔ بہ نسبت اس کے جسے اس چیز سے حصہ نہیں ملا کیونکہ داناؤں کے مشاہدے اور تجربے نے اس میں اپنے طور پر مشاہدے اور تجربے کی قوت پیدا کر دی ہے"

انگلستان کے نامور ہیئت دان ہرشل کا قول ہے کہ جس کسی میں آپ کتاب کا شوق پیدا کردیں اُسے آپ تمام اقوامِ دنیا کا ہم قوم اور تمام ازمنہ کا ہمعصر بنا دیتے ہیں"

ڈاکٹر ڈاہوس لکھتا ہے "مجھے ایک علمی حرم درکار ہے جہاں میری منظورِ نظر حسن والیاں

میری فرصت اور مرضی کی منتظر رہیں۔ میری نادر نادر کتابیں۔ میرے خوش قلم نسخے جن میں سے کئی میرے
لئے دلیلہ کا حکم رکھیں اور میرا سر اپنی گود میں رکھ کے مجھے راحت پہنچائیں۔ مجھے خزانے ہوں جنکی
کسی اور کو خبر نہ ہو۔ غرض کتابوں کا میں عاشق ہوں اور وہی میرے معشوق ہیں۔ اس عشق کی
وجہ معقول ہو یا نہ ہو اس سے مجھے کچھ جھگڑا نہیں یہی کافی ہے کہ میں ان پر مرتا ہوں اور ان کا
فدائی ہوں گا تا وقتیکہ موت کا ہاتھ مجھے اُن سے جدا نہ کر دے۔

لارڈ میکالے کا شوق کتاب ملاحظہ ہو ایک دوست کو لکھتا ہے:۔

"مجھ میں علم کی تشنگی اب تک باقی ہے مختلف زبانوں اور مختلف اقوام کے بڑے بڑے
مصنفوں سے ملاقات کا جذبہ وہی ہے۔ اپنے گرد و پیش جو کچھ موجود ہو اس سے غافل ہو کر
ماضی یا مستقبل یا خیالی دنیا میں محو ہو جانے کی قوت بدستور ہے بلکہ کتابیں میرے لئے سب چیزوں
کی جو بچی ہوئی باقی ہیں اگر اس وقت مجھے اختیار دیا جائے کہ اپنے لئے طریق زیست انتخاب کروں
تو میں ان بڑے کتب خانوں میں سے کسی میں جو میں نے اور تم نے اکٹھے دیکھے تھے جا مشغول
اور وہیں کا ہو رہوں اور کوئی لمحہ بیداری میں ایسا نہ گزارا جاوے جس میں میرے سامنے کتاب نہ ہو
(یعنی نیند جب آنکھ بند کر دے تو لاچاری ہے)"۔

خیر یہ درجہ تو استغراق کا ہے اور اتنا شوق نہ ہر کسی کو نصیب ہو اور نہ ہر کسی کے موافق آ سکتا ہے
اس کے علاوہ معمولی قوت کے آدمیوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ جو کچھ پڑھیں اس کے ہضم کرنے
اور اسے اپنا بنا لینے کے لئے بھی انہیں وقت ملے۔ ورنہ پڑھنا بیکار چلا جاتا ہے مسٹر جان مورلے
جو اس وقت نہ صرف مدبرانِ انگلستان کی صفِ اول میں ہیں بلکہ تحریر اور تقریر میں جابجا بلند پایہ ہیں اور
میدانِ تصنیف میں اس کا حریف مشکل سے مل سکتا ہے اس بارے میں نہایت قابل قدر نصیحت کرتے ہیں

"علم ہیچ ہے اگر آپ اسے اپنا نہ بنا لیں اور یہ قابلیت نہ حاصل کر لیں کہ موقع پر درست حالت
میں مستحضر ہو۔ گوئٹے سچ کہتا تھا کہ علم آخر اتنا ہی ہمارا ہے جتنا ہم استعمال کر سکیں۔ اور مطالعہ کا نتیجہ

جو عملی طور پر باقی رہتا ہے وُہ اسی قدر ہے اِس لئے یہ مفید ہے کہ اپنے مطالعہ کیا ہم اس مقصد کو ملحوظ رکھیں۔ کوئی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ کس مضمون کے متعلق خیالات اس کے ذہن نے پُوری طرح اخذ کر لئے ہیں جب تک وہ انہیں اپنے الفاظ میں کاغذ پر لکھ کر نہ دیکھ لے۔ جب کبھی کوئی اچھی کتاب پڑھو تو بہت مفید ہوگا کہ جہاں تک یاد ہو بیٹھ کر اس کا خلاصہ اپنے طور پر تیار کر لو اس سے بہتر ایک اور ترکیب ہے اگر کوئی ذرا زیادہ محنت برداشت کرنے پر آمادہ ہو یعنی وہ کام کرے جو لارڈ سٹڈیفورڈ، گبن اور وبسٹر کرتے تھے وُہ پہلے کتاب کا نام مضمون اور ابواب دیکھ کر قلم اُٹھا لیتے تھے اور اپنے ذہن سے لکھنے کی کوشش کرتے تھے کہ اس میں کیا کیا مسائل ہونگے اور ان کے متعلق کیا رائے ہوگی۔ کس قسم کی اطلاع بہم پہنچائی گئی ہوگی۔ اس قسم کی مشق سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھتے وقت صرف آنکھ ہی صفحہ پر عبور نہیں کرتی جاتی بلکہ جو نیا علم حاصل ہو اس کا مقابلہ پہلی معلومات سے ہوتا جاتا ہے اور دونوں معلومات اپنی اپنی جگہ دماغ میں لیتی جاتی ہیں۔

اچھی کتاب کو دو دفعہ پڑھنا ہمیشہ مفید ہوتا ہے۔ اِس احتیاط سے غرض یہ ہوتی ہے کہ اخذ کرتے وقت کوئی چیز گر نہ گئی ہو کسی مسئلے کو غلط طور پر نہ سمجھ لیا ہو یا اس کے غلط معنے نہ لگا لئے ہوں اگر مضمون زیادہ دقیق ہے تو ایک دفعہ پڑھنے کے بعد کچھ وقفہ کر کے دوبارہ پڑھنا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ اس کی مثال خسائندے کی ہے۔ مصفا عرق حاصل کرنے کے لئے کچھ دیر اسے دل میں بھگو رکھنے کی ضرورت ہے۔ جو چیز پہلے مبہم اور پیچیدہ معلوم ہوتی تھی وُہ تھوڑی دیر غور و فکر کے بعد صاف ہو جاتی ہے جو دوائیاں بھگوتے وقت پانی کو گدلا سا کر دیتی تھیں ان سے نتھر ہوا زلال نکل آتا ہے۔"

کتابوں کی تعریف میں مشاہیرِ عہد کی شیوا بیانی کے مزے لیتے ہُوئے اس زمانے میں کتابوں کی کثرت کا خیال بھی ضرور آتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان دنوں اس شوق کے ساتھ احتیاط کی ضرورت پیدا ہو گئی ہے عُمدہ نظرِ انتخاب درکار ہے ورنہ نہ تو کتاب کا پُورا فائدہ

ملتا ہے اور نہ بہترین کتابوں سے واقفیت ہوتی ہے - حالانکہ وقت اور روپیہ بیدریغ کتاب کی
نذر ہو چلتا ہے -

شوپن ہور مشہور جرمن فلسفی کیا خوب کہتا ہے :- کتابیں خریدنا بہت اچھا ہوتا ہو-
اگر آدمی اُن کے پڑھنے کے لئے وقت بھی خرید سکتا - آجکل اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ کتاب
کے خریدنے کو غلطی سے اُنکے علم کی تحصیل سمجھ لیتے ہیں :

کتاب کا شوق ہو اس شوق کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھانے کی لیاقت اور ہمت او
اچھی کتابیں چننے کا سلیقہ ہو تو کتب خانہ ایک بہشت جاودانی ہو جیسا کہ مسٹر جان لیبک نے
جن کی نظر انتخاب کی شہرت ہے کہا ہے :" کتب خانے کو اگر ہم اس کا ہم درست استعمال
کریں تو روئے زمین پر سچ مچ کا فردوس بنا سکتے ہیں ایسا باغ عدن جس میں وہ ایک
رکاوٹ بھی نہ ہو جو اصل باغ عدن میں تھی - کیونکہ یہاں ہمیں ہر میوہ کھانے کی اجازت ہو خصوصًا
درخت علم کا پھل - جس کے کھانے کی بدولت کہتے ہیں ہماری مادر اولین کو بہشت سے
نکلنا پڑا تھا "

اکرام

شہد کی مکھی کے حالات :- یہ کتاب پنجاب ریلیجس بک سائٹی کے مفید معلومات کے سلسلے میں ایک
قابل قدر اضافہ ہے - اس کتاب میں شہد کی مکھیوں کا تاریخی بیان ان کے اقسام و مختلف نام ان کے کام
ترکیب جسمانی ان کے جسمانی اور دماغی قوا ان کے جذبات اور ولولے اور جو مفید سبق انکی زندگی سے
لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں اور ان کے مفصل حالات باتصویر درج ہیں - چھپائی عمدہ کاغذ ولایتی حجم ۲۲ صفحہ
بقیمت ۸ ؍ اسسٹنٹ سیکرٹری پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی **لاہور** سے
مل سکتی ہے -

موتی

ہائے! میرا موتی! شاہزادیوں کی زینت کے قابل۔ خالص سونے میں نزاکت سے جڑا ہوا جس کا ثانی میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں مشرقی سمندروں میں نہ تھا۔ میرا موتی۔ گول۔ بے بہا۔ طرح دار جس کو میں سب جواہرات پر فوقیت دیتا تھا۔ افسوس وہ نادر موتی مجھ سے باغ میں گھاس پر گر پڑا اور گرتے ہی زمین اُسکو نگل گئی۔ صد افسوس میری محنت کی کمائی لُٹ گئی۔ اور میں اُس کے غم میں کُڑھ رہا ہوں۔

اُس دن سے میرا یہ معمول ہو گیا کہ میں موتی کے گم ہو جانے کے مقام پر منڈلایا کرتا تھا۔ اور اس کی جستجو میں جو غموں کو مجھ سے دُور رکھتا سرگردان رہتا تھا۔

ایک دن یہ سانحہ دلگداز میرے دِل کے ٹکڑے کر رہا تھا اور میرے سینے میں غم کی آگ بھڑکا رہا تھا۔ کہ اچانک ایک رسیلا راگ میرے کانوں میں پہنچا۔ جس کی آواز پہلے کبھی میرے کان نے نہ سُنی تھی۔

راگ کا سُنائی دینا تھا کہ مختلف خیالات کا لشکر میرے دِل پر ٹوٹ پڑا اور اس نے میرے خاک میں ملے ہوئے موتی کو یاد دلا دیا۔ اور میں کہنے لگا:۔ او زمین! تو نے میری خوشی کا سامان غارت کر دیا۔ اور بے مثل موتی کو نگل لیا۔ مگر یاد رکھ جہاں وہ خزینہ پنہاں ہے وہاں خوشبودار جھاڑیاں سایہ کرینگی۔ اور اُن جھاڑیوں پر سفید۔ نیلے۔ پیلے پھول کھلیں گے۔ اور آفتاب کی روشنی میں مثل چاندی سونے کے چمکینگے۔ میوے اور پھول اُس کی نواح میں ہرگز نہیں مُرجھائینگے۔ جب ایک مُردہ بیج سے اس قدر اناج پیدا ہوتا ہے کہ زمیندار اپنے گھر بھر لیتے ہیں۔ تو غور کر کہ اس بیش قیمت بیج سے کیا کیا نہ پیدا ہوگا۔ اچھوں کے نتیجے اچھے ہی ہوتے ہیں۔

میرے موتی سے میرے خیال میں خوشبودار پھول پیدا ہونگے۔

اِسی طرح ایک زمانہ گذر گیا۔ ایک دن مَیں باغ میں تھا۔ اگست کا مہینہ تھا۔ فصل کٹ رہی تھی۔ جونہی میں اپنے موتی کے گم ہو جانے کی جگہ پہنچا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں خوشبودار جھاڑیاں کھڑی ہیں اور جس قدر وہ خوبصورت تھیں اُسی قدر اُن سے خوشبو کی لپٹیں آتی تھیں۔ تب مجھے خیال آیا کہ یہ سب میرے موتی کی کرامات ہے۔

مَیں صرف نظارہ تھا کہ غم و فکر کا بوجھ ہوا اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ ایک آواز آئی کہ صبر کر صبر۔ کہاں مَیں تو موتی کی یاد میں دیوانہ تھا۔ مجھ پر بیہوشی طاری ہوگئی اور غش کھا کر میں گھاس کے ہرے ہرے بچھونے پر گر پڑا۔ گرتے ہی میرا دماغ خوشبو سے معطر ہوگیا۔ اور مَیں ایک خواب دیکھنے لگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میری روح پرواز کر گئی اور میرا جسم خاکی اس ڈھیر پر پڑا رہ گیا۔ میری روح ہر چیز الٰہی کے معلوم کرنے میں مشغول تھی کہ میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر جا چڑھا۔ سامنے سبز جنگل نمودار تھا جس میں گرد و چیتا نیں تھیں ان حیوانوں سے ایک طرح کی مہک پیدا ہوتی تھی جس کا کوئی انسان اندازہ نہیں لگا سکتا کیونکہ آدمی نے کبھی اس سے آدھی خوبصورت چیز بھی نہیں دیکھی۔

پہاڑیوں کی چوٹیاں بلور کی تھیں۔ درختوں کا رنگ نیلگوں تھا۔ ٹہنیوں پر گھنے پتے نُور کی بنی چاندنی کی طرح چمک رہے تھے۔ ہر بادل نے اُنکی چمک کو دوبالا کر دیا تھا۔ وہاں کی کنکریاں موتیوں سے نسبت رکھتی تھیں اور آفتاب اُنکی ضو سے شرماتا تھا۔

اِن عجیب اور خوبصورت پہاڑیوں کے نظارے میں مَیں اپنا غم و فکر بھول گیا۔ وہاں کے میوے بھوک کو دو چند کرنے والے تھے۔ مختلف رنگوں کے پرندے جھنڈوں میں اُڑ رہے تھے۔ کوئی شاعر اُنکی خوشی کا اندازہ نہیں بتلا سکتا۔ اُن کے پروں میں سے باجے کی آواز آتی تھی اور وہ باجہ ہر ایک کو مست کرتا تھا۔

اِسی مستی میں مَیں آگے بڑھتا چلا گیا۔ اور بلند پہاڑیوں پر بلا دقت چڑھ گیا۔ جس قدر اس جنگل

میں آگے کو بڑھتا تھا۔ میری حیرانگی زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ آخر میں ایک دریا کے کنارے پر پہنچا۔ اس کے کنارے مصالحہ کے درختوں سے سجے ہوئے تھے جن کی مہک سے باغ کو تازگی بخشتی تھی۔ دریا کی کیفیت میں کیا بیان کروں اُس کے بہنے سے ایک راگ پیدا ہوتا تھا۔ اس کی تہ میں چمکیلے سنگریزے تھے جو چمک دمک میں ستاروں سے مشابہ تھے۔ اور ہر ایک سنگریزہ جو اُس ندی کے تہ میں تھا۔ زمرد۔ ہیرے اور لعل سے مشابہت رکھتا تھا۔ اور اُنکی چمک اس قدر تھی کہ دریا تختۂ روشنی بنا ہوا تھا۔

(١١) سبز میدانوں۔ دریاؤں۔ جنگلوں۔ گھاٹیوں اور سبز پہاڑیوں کے نور نے میرے تن میں نئی رُوح پھونک دی اور میرے دردِ دل کو گھٹا دیا۔ میرے غموں کو مجھ سے دُور ہٹا دیا۔ اور میری تکلیفوں کو رفع کر دیا دریا کے کنارے کنارے میں خوش خوش پھر رہا تھا۔ اور باغ باغ ہو رہا تھا۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا میرا غنچۂ دِل کھلا جاتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ الوان نعمت وہاں تھے جنکے بیان سے میں قاصر ہوں۔ کیونکہ آدمی جو خاک کا بنا ہوا ہے اُس نعمتِ عظمے کا دسواں حصہ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ ان نظاروں اور دلچسپیوں نے مجھے کامل یقین دلا دیا کہ دریا کے اس پار بہشت واقع ہے۔ میں نے خیال کیا کہ یہ ندی جادو سے بھری ہوئی ہے۔

ندی کے پرے کنارے پر میری نظر جمی رہی اور بہت دیر تک میں اُسی حالت میں رہا۔ اگرچہ وہ جگہ بھی جہاں میں اسوقت تھا انتخابِ روزگار تھی مگر دریا کے پار اس سے لاکھ گنے زیادہ خوبصورت اور دل کو لبھانے والے نظارے تھے۔ میں ٹھہر گیا۔ اِدھر اُدھر نظر ڈالی کہ کہیں پایاب پانی مل جائے تو اُس پار چلا جاؤں۔ مگر جوں جوں آگے قدم اُٹھاتا تھا راستہ کٹھن ہوتا جاتا تھا مگر میرا حوصلہ بڑھا ہوا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ کوئی خطرہ مجھے اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتا میں نے پانی کے دوسرے کنارے پر پہاڑ کی بلورین چوٹی کے سائے میں ایک خوش وضع خوبصورت لڑکی کو دیکھا۔ اس کی پوشاک سرتاپا نورانی تھی۔

خالص سونے کی طرح وہ نور پہاڑی کے دامن میں چمک رہا تھا۔ اور میری نظر دیر تک اس نظارے سے ہٹ نہ سکی۔ یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ میں اسے پہچانتا ہوں۔ اور ڈر بھی لگتا تھا کہ کہیں یہ دھوکا ہی نہ ہو۔ شوق نے مجبور کیا کہ نام لیکر پکاروں مگر حیرانگی میرے دل پر ایسی غالب آئی کہ یہ جرأت نہ ہو سکی۔ وہ ایسی جگہ بیٹھی تھی کہ دل اس جگہ کے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے اپنا خوبصورت چہرہ اوپر کو اٹھایا۔ میری نگاہ کا اُسکی نگاہ سے ملنا تھا کہ میرا دل کانپ اُٹھا۔ میری آنکھ خیرہ ہوگئی اور زیادہ ٹھہرنا میرے لئے خوف کا باعث معلوم ہوا۔ میرا مُنہ بند تھا اور میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اسی اثنا میں وہ کانِ خوبی اپنی شاہانہ پوشاک میں ملبوس اُٹھی۔ اسکی یہ پوشاک موتیوں سے لدی ہوئی تھی اور اُن بے بہا موتیوں کو دیکھنا عجب لطف رکھتا تھا۔ میں نے کبھی ایسے موتی نہیں دیکھے تھے۔ اُس کے کُرتے کی آستینیں چوڑی تھیں اور ان کے حلقوں پر دوہری موتیوں کی جھالر لٹکتی تھی۔ اس کے سر پر موتیوں کا تاج تھا اور سوائے موتی کے اور کسی طرح کا زیور اُسکی زینت میں دخل نہیں رکھتا تھا۔

انجام کار خوش نصیبی سے وہ پہاڑی کے دامن سے دریا کی طرف خراماں ہوئی۔ میں اس کے نظارے میں محو تھا۔ اس نے ایک دلربا انداز سے جس میں زنانہ عفت اور حیا جلوہ گر تھے۔ میری طرف دیکھا اور اپنے تاج کو سر سے اُٹھا کر اس نے مجھے سلام کیا۔ تب تو میری بھی ہمت بندھ گئی اور میں یوں گویا ہوا۔ "اے موتی! موتیوں سے بھرپور۔ موتیوں کی کان۔ کیا تو میرا گم شدہ موتی ہے؟ ہائے جب سے تو اس باغ میں غائب ہوا تھا میرے لئے کھانا پینا حرام ہوگیا۔ دُنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ اور ہر وقت تیرے فراق میں آنکھوں سے آنسوؤں کا تار جاری رہتا تھا۔

اے میرے پیارے موتی!! انصاف تو کر کہ میں یوں تیرے فراق میں بے قرار رہوں

اور تو سیر بہشت کے مزے اڑائے"۔ اس سوال سے وہ پری زاد کسی قدر برہم ہوئی اور جواب دیا کہ گذشتہ ماجرے کے دہرانے سے کیا حاصل۔ کیا آپ کے لئے یہ کافی خوشی نہیں کہ آپ کا موتی ایسے باغ میں جو خوشی اور عیش کا وطن ہے (ہمیشہ کے لئے متمکن ہو گیا ہے) اور اگر آپ واقعی اپنے موتی سے اس قدر محبت رکھتے ہیں تو اس سے بہتر جگہ اس کی رہائش کے لئے اور کونسی چاہتے ہیں۔

آپ کے موتی کی مثال ایک گلاب کے پھول کی ہے جو قدرت کے حکم سے کبھی مرجھاتا ہے اور کبھی کھلتا ہے۔ کبھی زمین میں چھپ جاتا ہے اور کبھی رنگ بو لیا زمین سے نکلتا اور آنکھوں کو نئی بخشتا ہے۔ جس کا نام آپ مرجھانا، گرنا اور گم ہو جانا رکھتے ہیں وہ صرف تبدیلِ مکان ہے۔ پھر اس کا غم کیا۔ آپ کا موتی یہاں پہنچکر ایک بے بہا در ہو گیا ہے۔ آپ خواہ مخواہ ناشکری کرتے ہیں۔ کہ تقدیر نے آپ کے موتی کو آپ سے جدا کر دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے موتی سے پوری محبت نہیں ہے۔

جب وہ موتیوں کی پتلی جسکی ملاقات خود موتی کے ملنے سے کم نہ تھی اور جس کے الفاظ موتیوں سے گراں قیمت تھے۔ اپنی تقریر ختم کر چکی۔ تو میں نے کہا "اے بابرکت موتی میں معافی کا خواستگار ہوں۔ تو نے میرا غم غلط کر دیا۔ میں خیال کیا کرتا تھا۔ کہ میرا موتی بیجان ہو گیا ہے مگر اب تو میں نے اپنے موتی کو خوش نصیبی سے پالیا ہے اور اب میں اس کو اچھی طرح حفاظت سے رکھونگا۔ اور اس کے ساتھ اپنی زندگی جو غموں اور فکروں کا شکار ہو رہی تھی۔ اس گلشن بے خار میں مزے سے گذارونگا۔ اور اس جنابِ باری کا شکریہ ادا کرتا رہونگا۔ جس نے میرے موتی کو مجھ سے ملا دیا ہے۔ مگر میں اس کنارے پر ہوں اور تو اس کنارے پر ہے۔ ہائے کیا اچھا ہوتا کہ دریا کی لہریں ہمارے درمیان نہ ہوتیں اور میں اور تم ایک جگہ ہوتے"۔ تب اس نے کہا کہ "اے گرفتارِ محبت! عقل سے کام لے۔ تیری تقریر میں تین باتیں ایسی ہیں۔ جنہیں سنکر مجھے ہنسی آتی

ہنسی آئی۔ تو نے اوّل تو یہ کہا کہ گم شدہ موتی کو پا لیا ہے۔ دوسرے میرے ساتھ رہنے کی آرزو ظاہر کی اور تیسرے اس ندی کے پار ہو کے میرے پاس آ جانا ہے۔ یہ پہلی بات غلط ہے اور دوسری۔ دونوں ناممکن۔ پہلے اسے آپ ہی موتی کی آب اور صفائی پر اگراہ ہے اس کی ہمنشینی کا دم بھرنا نہیں اس جوہری کو بیوقوف سمجھتی ہوں جو اپنے آویزہ سے ریا بھلو رہا کھے جوہری آب و تاب پہچاننے سے بہت دور حقیقت کے پہچاننے کی قوت میں کمی

(ترجمہ) **بشیر احمد** (از لندن)

لے کے دل وہ چھیڑ سے کچھ کہہ گیا　　رنجشوں کا زخم جی میں رہ گیا

جوش اُلفت تھا کہ دل سے لو مگر　　عاقبت دونوں ہو کر بہ گیا

چاند سے چہرے پہ کیوں ڈالی نقاب　　چاند یہ کیسا گہن میں گہہ گیا

اس قدر گردش میں تھا میرا غبار　　ساتھ پھر کر آسماں رہ رہ گیا

گالیاں بھی مجھ کو کیا ان بھی تم نے دیں　　اور دینے کے لئے کیا رہ گیا

مجھ کو جو سننا تھا میں نے سن لیا　　اُس کو جو کہنا تھا منہ پر کہہ گیا

ہائے میری خستگی و ماندگی　　بڑھ گیا سب قافلہ میں رہ گیا

اور ناصح کو کڑی میں نے کہی　　ایک جب چپکا ہوئی وہ سہہ گیا

جب سے وہ رہنے لگے ہیں بے نقاب　　روز و شب کا نورِ مہر و مہ گیا

عاشقوں سے عشق چھپتا ہے کہیں　　پھوٹ کر جب رووے دریا بہ گیا

داغؔ سے اُٹھا نہ اک رشکِ رقیب　　جو ستم سہنے کے تھے وہ سہہ گیا

داغ (فصیح الملک)

جوناگڈھ کی سرسری سیر

اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ جس شے کی طرف دل مائل ہوتا ہے اُس کے حصول میں ضرور کسی نہ کسی قسم کی رُکاوٹیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اور اُن رکاوٹوں کا پیدا ہوجانا لُطف سے خالی بھی نہیں کیونکہ جس دن سے ایک چیز کی خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے اُسی دن سے اس چیز کے حاصل ہوجانے تک درمیانی زمانے کا ہر ایک دن انتظار میں کٹتا ہے اور یہ انتظار اُس چیز کی قدر دو بالا کردیتا ہے۔ پھر وُہ انتظار کتنا ہی طُول کیوں نہ کھینچے شوق میں کمی نہیں ہونے پاتی بلکہ وہ شوق روز بروز بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور عجب مزہ دیتا ہے۔ مگر جہاں اُس چیز پر دسترس ہوگئی۔ تھوڑی مدت میں اس سے سیری ہوجاتی ہے اور پھر وہ آرزو۔ وہ ولولہ باقی نہیں رہتا جو اس کے ملنے سے پہلے تھا۔

جو مزہ انتظار میں پایا
نہ کبھی وصلِ یار میں پایا

جوناگڈھ کے شوقِ دید میں میری بھی یہی کیفیت تھی۔ جب سے کاٹھیاواڑ میں قدم رکھا اُسی دن سے اس شہر کے دیکھنے کا شوق دل میں جاگزین ہوا۔ ایک تو پُرانا تاریخی شہر دُوسرے کاٹھیاواڑی ریاستوں میں درجہ اوّل کی ریاست کا پائے تخت اور سب سے بڑھ کر دلبستگی کی وجہ یہ کہ ریاستِ اسلامی۔ چھ برس تک تو یہ آرزو دل کی دل ہی میں رہی لیکن کوئی موقعہ اس عروسِ کاٹھیاواڑی کے دیکھنے کا ہاتھ نہ آیا۔ میری کاٹھیاواڑی زندگی کے پہلے برس کے اندر ہی اندر البتہ اس شہر کے بالکل قریب سے ریل پہ دوچار دفعہ میرا گُذر ہوا۔ اور اس شہر کی جو جھلک اُسوقت دُور سے نظر آئی اُس نے شوقِ دید کو میرے دِل میں اَور گدگدا دیا لیکن چند روز قیام کرکے اس شہر کے دیکھنے کا اتفاق مجھے گذشتہ ماہ جُون ہی میں ہوا۔

آٹھویں جون پنجشنبہ کی شام کو سات بجے جام نگر سے ریل پر سوار ہوا اور کوئی دس بجے ہڑولا جنکشن پر پہنچا۔ رات بھر یہاں ٹھہرنا پڑا۔ کیونکہ ریل یہاں بدلتی ہے ویٹنگ روم (دار الانتظار) مسافروں سے بھرا ہوا تھا لیکن صبح جانے والی ٹرین سٹیشن پر کھڑی تھی۔ اس میں بستر لگا کر سو رہا۔ صبح دس بجے ریل روانہ ہوئی تو اسی ٹرین کے (کمپارٹمنٹ) میں جس میں میں بیٹھا ہوا تھا دو مرہٹے بھی آ بیٹھے۔ یہ بہاؤالدین کالج کے پروفیسر تھے۔ دونوں گریجویٹ تھے اس لئے اُن کی علمی لیاقت تو اعلیٰ درجے ہی کی ہونی چاہئے لیکن ظاہری صورت ایسی نہیں تھی کہ جس سے طلباء مرعوب یا گرویدہ ہو سکیں۔ میرا مشاہدہ دو گھنٹے کا تھا اس لئے اُن کے اخلاق و اطوار کے متعلق میں زیادہ وضاحت سے بحث نہیں کر سکتا۔ جو کچھ میری نگاہ ظاہر بین نے دیکھا میں نے لکھ دیا۔ جیتلسر پر ریل پھر بدلنی پڑی۔ ہمارے مرہٹے ساتھی کسی اور ڈبے میں جا بیٹھے اور اب کے ایک گوانیز صاحب کا ساتھ ہوا جو بہاؤالدین کالج کے فزکس کے پروفیسر تھے۔ چونکہ دسویں جون کو گرمیوں کی تعطیل کے بعد بہاؤالدین کالج کھلنے والا تھا۔ اس لئے یہ پروفیسر اپنے گھروں سے لوٹ رہے تھے۔ سہ پہر کو میں جوناگڈھ پہنچ گیا اور سٹیشن کے قریب ہی سرکاری بنگلے میں قیام کیا۔

جیسا کہ ریاستوں میں قاعدہ ہوا کرتا ہے کہ وقتاً فوقتاً ترسیلِ تحائف سے باہمی ربط و اتحاد کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مہاراجہ صاحب جام نگر نے بھی مجھے چند تحائف دیکر نواب صاحب جوناگڈھ کی خدمت میں مزاج پُرسی کے لئے بھیجا تھا جو خدمت مجھے سپرد ہوئی تھی اُس کے بجا لانے کے لئے کچھ زیادہ وقت درکار نہیں تھا لیکن ریاستوں کا یہ بھی دستور ہے کہ ایسے مہمان کو جلد رخصت نہیں کر دیتے اس لئے جوناگڈھ میں اٹھارہ دن ٹھہرنے کا مجھے موقعہ ملا اور اس اثنا میں قریباً کُل قابلِ دید مقامات کی میں نے سیر کی۔ مراسم مہمان نوازی بآئین شائستہ ادا کئے گئے اور مجھے بڑا آرام ملا۔

ملک کاٹھیاواڑ زیادہ تر مسطح ہے اور اس ملک میں پہاڑ بہت کم ہیں۔ پہاڑیوں کے جو دو چار

چھوٹے چھوٹے سلسلے اس ملک میں ہیں اُن میں گرنار سب سے زیادہ بلند اور زیادہ مشہور ہے
اسی سلسلے کے غرب میں جوناگڈھ واقع ہے اور دامنِ کوہ میں آباد ہونے کی وجہ سے اس شہر
کا منظر زیادہ خوشنما بن گیا ہے۔ ریل جوناگڈھ کی مغربی حد کے قریب سے گذرتی ہے اور شہر
کا مجموعی نظارہ بھی ریل ہی سے خوب نظر آتا ہے۔ اسٹیشن کے مقابل نصف دائرے کی
شکل میں ایک عمارت بنی ہوئی ہے جو بہاؤالدین بلڈنگ کہلاتی ہے۔ اس عمارت کے
وسط میں شہر کا خوبصورت داخلہ ہے اور اس داخلے پر ایک چار رخی گھڑی لگی ہوئی ہے
داخلے سے جنوباً شمالاً فصیلِ شہر چلی گئی ہے۔ جو بہت پرانی نہیں دکھائی دیتی۔ فصیل مضبوط
ہے نہ خوبصورت۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ فصیل غنیم کے مقابلے کے لئے نہیں بنائی گئی بلکہ
اہلِ شہر کو چوروں۔ ڈاکوؤں اور درندوں سے محفوظ رکھنے کے لئے بنی ہے۔ نہ گولی اور
تیر چلانے کے لئے اس میں عمودی تنگ رخنے بنے ہوئے ہیں۔ نہ کنگرے ہیں۔ بعد
کی متواتر مرمتوں نے اس فصیل کی یہ ظاہری صورت بنا دی ہے ورنہ فی الحقیقت گجرات[1] کے
سلطان محمود بیگڑے نے ۱۴۷۲ء میں پہلے پہل اس کو تعمیر کرایا تھا۔ اور فوجدار میرزا عیسیٰ
ترخان کے زمانے (۱۶۳۳ء سے ۱۶۴۲ء تک) میں از سرِ نو اس کی مرمت ہوئی تھی۔ داخلے
کی داہنی جانب شہر پناہ کے اندر نوابانِ سلف کے مقبرے اور جامع مسجد ہے۔ مسجد اور مقبروں
کے چھوٹے بڑے گنبدوں اور مختلف الوضع مناروں کے مجموعے نے کھجور اور ناریل اور قسم قسم
کے درختوں کے جھنڈ میں ایک عجیب اور دلفریب مشرقی نظارہ پیدا کر دیا ہے جس کے دیکھنے
سے سیری نہیں ہوتی۔ ان مقبروں کے پیچھے شہر کے پختہ مکانات نظر آتے ہیں۔ اور زمین
ڈھلوان ہونے کی وجہ سے ہر عقبی مکان اگلے مکان سے بلند تر نظر آتا ہے۔ نگاہ ان مکانوں
کے زینے کو جب ختم کر لیتی ہے تو دربار اور محلسرا کی عالیشان عمارتوں پر جا کر ٹھہرتی ہے اور

[1] بمبئی گزیٹیر جلد ہشتم مطبوعہ ۱۸۸۴ء صفحہ ۴۰۰ و صفحہ ۵۰۱ ۔

ان عمارتوں کی پشت پر کہسار کی بلند چوٹیاں نظر آ جاتی ہیں۔

یہ بیان نوشہر کے اس عام نظارے کا ہے جو بیرون شہر سے دکھائی دیتا ہے لیکن جب شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس نظارے کی دلفریبی بہت کچھ کم ہو جاتی ہے۔ راستے تنگ اور پیچیدہ ہیں۔ مکانات گو پختہ ہیں مگر موافق عادت کے ایسے مکان شاذ ہیں جن میں دو منزلوں کا یہ فن تعمیر رکھتا ہو۔ تاہم ان تنگ اور پیچیدہ گلیوں میں ایک مشرقی وضع کی بے ترتیبی ہے جو ان میں گشت لگانے والے کے دل پر ایک خاص اثر کرتی ہے۔

بیچ بازار کے عین سامنے ہلالی یا نصف دائرے کی شکل میں پختہ دکانوں کی ایک قطار بنی ہوئی ہے۔ جو نہایت ہی بھلی دکھائی دیتی ہے۔ اور اس قطار کے دونوں سروں پر دو پختہ محرابیں بنی ہیں۔ ان محرابوں سے نکل کر شمال اور جنوب کو ایک راستہ چلا گیا ہے جس پر تھوڑے فاصلے تک دورویہ دکانیں ہیں۔ یہی یہاں کا بازار ہے اور شام سے کچھ پہلے اس بازار میں ایک چکر لگائیں تو یہاں کے باشندوں کے ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں کی مختلف صورتیں ایک ہی نگاہ میں نظر آ جاتی ہیں۔ بعض بلند بالا اشخاص ایسے نظر آتے ہیں جن کے سینے چوڑے، بازو بھرے بھرے اور مضبوط ہوتے ہیں اور ان کے ہر عضو میں مردانہ تناسب پایا جاتا ہے۔ ان کے سنجیدہ چہروں سے جلال برستا ہے اور ان کی چال سے استقلال نمایاں ہوتا ہے۔ لباس بھی ان کا سادہ اور سپاہیانہ ہوتا ہے اور اس میں کوئی چیز نمائشی نہیں ہوتی۔ ہاں ایک شمشیر خوش غلاف گلے میں حمائل ہوتی ہے۔ یہ صورتیں یادگار ہیں اس شجیع افغانی اور بہادر بابی[1] نسل کی جس نے اس ملک میں ریاست کی بنیاد ڈالی۔ کثرت ان رنگیلے اور سجیلے نوجوانوں کی ہوتی ہے جن کی ہر طرز سے زنانہ پن اور ہر ادا سے عیش پرستی ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے انگرکھے

---

[1] یہ نسبت اس مذہبی فرقے کی طرف منسوب نہیں ہے جو ایران میں موجود ہے۔ شاہان دہلی کی ڈیوڑھی کی پاسبانی یا بوابی غالباً اس کی وجہ تسمیہ ہے ۱۲

باریک ململ کے ہوتے ہیں جن کے چاک کمر تک کٹے ہوتے ہیں اور دامن پھریروں کی طرح آگے
پیچھے اُڑ کر جسم کے حصّہ زیریں کی بے ستری کرتے ہیں۔ اُن کی رانیں اور پنڈلیاں تنگ دہری
کے چوڑی دار چُست اور پھنسے ہُوئے پاجامے میں محبوس ہوتی ہیں۔ سر پر شوخ رنگ کی پگڑی ہوتی
ہے۔ انگے کے بند زریں یا اطلسی صدری کے دکھانے کے لیے کھلے رکھے جاتے ہیں
سر پر پٹے یا انگریزی طرز کے آنگے کے بال ہوئے تو پٹیاں جمائی جاتی ہیں ورنہ بالوں کا ایک
گچھا تو ضرور پیشانی پر پگڑی سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ ہونٹھ پان کی سُرخی سے لال۔ آنکھوں
میں سُرمے کی تحریر۔ گلے میں سونے کی کنٹھی۔ پانوں میں چاندی کی بیڑی یا توڑا۔ یہ بھی انہیں
بابیوں کی دوغلی اولاد ہے جو کاٹھیاواڑی ادنی قوموں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے اور انکے
ننگ و ناموس کو برباد کرنے والی ہے۔ ان کے علاوہ ہندوؤں میں ناگر۔ برہمن۔ بنئے بقال
مُسلمانوں میں عرب۔ پنجابی۔ وغیرہم بہت سی قوموں کے افراد دکھائی دیتے ہیں جن کے
بیان سے مضمون میں طوالت پیدا کرنے کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

جوناگڈھ کی خصوصیتوں میں ایک یہ خصوصیت دیکھی کہ شاہراہوں پر بخلاف اور کاٹھیاواڑی
شہروں کے عورتیں بہت کم نظر آئیں۔ اگر کہیں دیکھی بھی گئیں تو یا وہ عورتیں دیکھی گئیں جن کی
شکستہ حالی ظاہر کرتی تھی کہ وہ بہت ہی غریب ہیں اور سودے سلف کے لئے بمجبوری باہر نکلی
ہیں یا وہ چڑیل شکل بازاری عورتیں جن کے لئے جوناگڈھ بدنام ہے۔ نہیں معلوم وہ کیسے
گندہ مزاج۔ دیو سیرت اشخاص ہونگے جو ان کریہ منظر غلیظ عورتوں کو پسند کرتے ہیں۔
ہندو عورتیں بھی باہر نکلتی ہوئی کم دیکھی گئیں یا اگر کوئی نکلتی بھی ہے تو کسی معزز شخص کی گاڑی
سامنے سے آتی دیکھ کر فوراً گھونگھٹ نکال پیٹھ پھیر کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور جب تک وہ
گاڑی نکل نہیں جاتی ہے آگے نہیں چلتیں۔ اس ظاہری پردے کی سخت پابندی کی دو
وجہیں ہونی چاہئیں۔ ایک تو اسلامی ریاست کا پُرانا رواج۔ دوسرے بد اطوار اشخاص کی

کثرت سے ننگ و ناموس کے غیر محفوظ ہونے کا خوف ۔

مردوں کا لباس ضمناً پہلے بیان ہو چکا ہے ۔ عورتیں تنگ مہری کا پاجامہ اور "پشواز"[1] پہنتی ہیں اور سر پر دوپٹہ یا اوڑھنی اوڑھتی ہیں۔ بعض پشواز کے عوض کرتی پہنتی ہیں۔ امیروں کی لڑکیوں کو قبا بھی پہنائی جاتی ہے ۔

یہاں کا سکہ "کوری" ہے جو چونی کے برابر چاندی کا ایک سکہ ہے ۔

قدامت کے لحاظ سے جو مقامات تاریخی دلچسپی رکھتے ہیں ان میں کوہ گرنار اول درجے پر ہے۔

ایک روز علی الصباح ہم ٹٹوؤں پر سوار ہو کر گرنار دیکھنے کے لئے اپنی قیام گاہ سے نکلے ۔ جس بنگلے میں میں ٹھہرا ہوا تھا اسی میں ایک یوروپین سوداگر بھی مقیم تھا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ میں گرنار دیکھنے کے لئے جاتا ہوں تو وہ بھی ساتھ چلنے پر آمادہ ہوا اور چونکہ وہ ایک زندہ دل شخص تھا اس کی رفاقت نے تنہائی کی بے لطفی کو بھی دور کر دیا ۔ ایک ہندو صاحب بھی بطور رہبر کے ہمراہ تھے اور ملازموں کو ملا کر ہم چھ آدمیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت بن گئی تھی ۔ شہر کے مشرقی دروازے سے باہر نکلتے ہی چپے چپے پر بعض مندر یا تالاب ۔ یا پل یا کنڈ ایسے ملتے ہیں کہ جن کے ساتھ ضرور کوئی نہ کوئی تاریخی واقعہ منسوب ہے بلکہ بعض مقامات ایسے بھی ہیں جن کے متعلق تاریخی زمانے سے پیشتر کے قصے اور فسانے مشہور ہیں ۔ شہر سے وہ مقام جہاں سے پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوتی ہے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر ہے اور جو سڑک اس فاصلے کو طے کرتی ہے وہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں کے درمیان لہراتی ہوئی ایک پرجلال کوہستانی منظر سے گذرتی ہے اور اس قدرتی منظر کو بعض پرانے کھنڈروں اور گرنار سے نکلی ہوئی ندی پر بنے ہوئے پختہ پل نے زیادہ دلکش بنا دیا ہے ۔ اثنائے راہ میں ایک نو تعمیر پختہ حجرہ بھی ملتا ہے جس میں قدیم زمانے کی سنگین تختیاں رکھی ہوئی ہیں ۔ ان تختیوں پر اشوکا وغیرہ کے کتبے کندہ ہیں ۔ ہندوؤں کا مرگھٹ بھی

[1] یہاں گھگرے یا لہنگے کو کہتے ہیں ۱۲

اسی راستے پر ہے۔ جب ہم گھر سے نکلے تھے تو ابر کی وجہ سے گرنار نظروں سے بالکل غائب تھا۔ اگر ہم نے اس کو اگلے دن اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیا ہوتا تو اس کے اس قدر قریب موجود ہونے کے کبھی قائل نہ ہوتے۔ جوں جوں ہم پہاڑ سے نزدیک ہوتے گئے کہر کا پردہ آہستہ آہستہ اُٹھتا گیا اور جب اس کے دامن میں پہنچے تو گرنار اپنی پوری عظمت و جلال میں دکھائی دینے لگا۔

ابتدائے فراز سے قُلّہ کوہ تک پُختہ زینے بنے ہوئے ہیں اور شاید کل ہندوستان میں یہی ایک اکیلا مقام ہے جہاں ۳۶۶۶ فیٹ کی بلندی پُختہ زینوں کے ذریعہ طے کی جاتی ہو۔ ہمارے لئے ریاست کی جانب سے ڈولیوں اور کُرسیوں کا پہلے ہی سے انتظام کر دیا گیا تھا اس لئے چڑھائی میں نہ ہم تھکے اور نہ ہمیں کسی قسم کی تکلیف محسوس ہوئی لیکن پہاڑ پر بغیر زینوں کے پا پیادہ چڑھنے کا جو لطف ہے وہ ہمیں میسّر نہیں ہوا۔ اکثر پہاڑوں میں نصف بلندی یا کچھ زیادہ طے کرنے کے بعد ایک مسطح مقام ملتا ہے جو کمر کوہ کہلاتا ہے۔ گرنار میں یہ مقام منتہائے بلندی سے اس قدر قریب ہے کہ اس کو سینۂ کوہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اسی مقام پر جینیوں کے متعدد مندر ہیں جن کے وسط میں بائیسویں ترتھنکار۔ نمی ناتھ کا بڑا مندر ہے۔ حسن تعمیر کے لحاظ سے ان میں کوئی خصوصیت نہیں ہے اور ستون اور چھت وغیرہ پر جو نقش و نگار کندہ کئے گئے ہیں وہ بھی چونکہ پتھر نرم استعمال کیا گیا ہے استداد زمانہ اور حوادثات موسم سے شکستہ و ریختہ ہو گئے ہیں اور پھر چونے کی استر کاری و تلعی نے ان کو اور بھی بدنما بنا دیا ہے۔ نمی ناتھ کے مندر کے ارد گرد پُختہ صحن ہے اور اس صحن کے حاشیے پر ایک جالیدار غلام گردش بنی ہوئی ہے۔ اس غلام گردش میں سنگ سفید کے بہت سارے بُت رکھے ہوئے ہیں۔ ہر بُت کی آنکھوں میں نگینے جڑے ہیں اور پیشانی پر بھی ایک ایک نگینہ لگا ہے۔ ایک بُت ایک تہ خانے میں بٹھایا ہوا ہے۔ اس تہ خانے میں گھی کے چراغ جلا کر اُترتے ہیں۔ تہ خانہ نہایت تنگ و تاریک ہے اس لئے بند ہوا اور چراغوں کی بُو سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ ہم ان مندروں کی سیر کر ہی رہے تھے کہ پوجا کا وقت آن پہنچا اور نمی ناتھ کے مندر میں پجاری جمع

ہونے شروع ہوئے۔ کل پجاریوں کا لباس یکساں اور یک رنگ تھا۔ ایک دھوتی کمر میں بندھی ہوئی تھی اور ایک چادر کندھوں پر اس طرح لپیٹی تھی کہ اس کا ایک سرا چہرہ کے حصہ زیریں کو ڈھنکے ہوئے تھا تاکہ ناک اور منہ کے راستے اجرام ہوائی داخل ہوکر بلاک۔ جو جیں۔ ہر دھوتی اور چادر کا رنگ زعفرانی یا زرد تھا۔ پجاری تو سب کے سب دھیان گیان میں مشغول خاموش تھے لیکن ایک شخص جو معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھا پجاریوں کے درمیان کھڑا ہو بہ آواز بلند چیخ رہا تھا "پہلی پوجا کے ـــ چودہ آنے"۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں ہر روز ہر پوجا کا نیلام ہوتا ہے اور سب سے زیادہ بولی بولنے والے پجاری کو ہی پوجا کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ گو اس طریقے سے مندروں کے سرمایہ میں ایک مستقل اضافہ ہوتا ہے لیکن مندر کو منڈی بنانا اور وہاں عبادت کی تجارت کرنا میرے خیال میں نہایت نامناسب ہے۔

ان مندروں سے جانب شمال تھوڑے سے فاصلے پر ایک بہت بڑی مدور چٹان ہے جو بھیرو جپ یا بھیرو جو کہلاتی ہے۔ اگلے زمانے کے خوش اعتقاد ہندو اس چٹان سے گر کر خودکشی کرنے کو ذریعہ نجات سمجھتے تھے مگر اب اس کلجگ کے زمانے میں اس دروازے سے سرگباشی ہونا کوئی پسند نہیں کرتا۔

اس مقام کی سیر کرنے کے بعد ہم پہاڑ کی پہلی چوٹی پر گئے جہاں انبا ماتا کا مندر ہے۔ اس چوٹی سے شہر اور نواح شہر کا سرسری نظارہ بہت صاف دکھائی دیتا ہے۔ جانب مشرق ایک ہی خط مستقیم میں دو اور چوٹیاں ہیں اور ان پر پہنچنے کے لئے بھی زینے بنے ہوئے ہیں۔ ایک چوٹی سے دوسری چوٹی پر جانے کے لئے کچھ زینے اتر کر پھر چڑھنا پڑتا ہے۔ درمیانی چوٹی جو گورکھ ناتھ کہلاتی ہے۔ تمام چوٹیوں سے زیادہ اونچی ہے اور اس پر بھی ایک مندر بنا ہوا ہے۔ ہم یہاں تک آئے لیکن اس سے آگے تیسری چوٹی پر نہیں گئے۔ کیونکہ درمیانی نشیب و فراز بھی دشوار گذار تھا اور مندر کے سوائے اور کوئی چیز بھی وہاں دیکھنے کے قابل نہیں تھی۔ ہمیں امید تھی کہ ان چوٹیوں پر

محراب کے تین محرابیں بنی ہیں۔ اور ان محرابوں کی نقاشی میں زنجیروں سے لٹکتے گھنٹے کندہ ہیں جو مندروں کے نقشے کی ایک خصوصیت ہے۔ محرابوں کی انتہائی بلندی پر بعض ٹوٹی ہوئی چھوٹی چھوٹی تصویروں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔

مسجد کے پہلو میں دو توپیں پڑی ہیں۔ جن میں ایک بہت بڑی ہے اور نیلم توپ کہلاتی ہے۔ یہ توپ طول میں سترہ فیٹ ہے اور اس کے پچھلے حصہ کا محیط ساڑھے سات فیٹ اور منہ کا قطر ساڑھے نو انچ ہے۔ ترک اس توپ کو ڈیو[1] میں چھوڑ گئے تھے اور بحکم سلطان بہادر شاہ ملک ایاز نے اس کو جونا گڈہ پہنچایا تھا۔ اس کی پشت پر خوشخط اور صاف ابھرے ہوئے حرفوں میں بخط نسخ ایک طغرا بنا ہے جس میں لکھا ہے کہ اس توپ کا بنانے والا سلطان سلیمان بن سلیم کے عہد میں محمد حمزہ نام ایک شخص تھا۔

اس قلعے میں دو کنوئیں بھی بہت عمیق ہیں اور پانی کی سطح بھی ان میں بہت نیچی ہے۔ ایک میں اترنے کے لئے جو زینے بنے ہیں وہ عجیب ہیں۔ کنوئیں کے منہہ سے جب اندر جھانکیں تو ایک سیدھی چار دیواری کھڑی نظر آتی ہے لیکن اس چار دیواری کے گرداگرد پہاڑی کاٹ کر زینے بنائے گئے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کنوئیں کی چار دیواری میں دریچے بھی بنا دیئے گئے ہیں تاکہ زینوں پر روشنی اور ہوا پہنچے مگر دریچے اس غرض کو پورا نہیں کرتے۔ ہاں زینوں سے اترنے والا دریچوں سے سر نکال کر سطح آب یا آسمان کو دیکھ سکتا ہے۔

فی الحال اس قلعے کے اندر بہت بڑے پختہ حوض تیار ہو رہے ہیں جو میٹھے پانی کے خزانوں کا کام دینگے اور نالوں کے ذریعے یہاں سے شہر میں پانی پہنچایا گیا ہے۔

زمانہ حال کی عمارات عامہ کا بیان اگر تفصیل کے ساتھ علیحدہ علیحدہ لکھا جائے تو مضمون بہت لمبا ہو جائیگا اس لئے ان کے متعلق چند اشارے کرنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

---

[1] ڈیو ایک جزیرہ ہے جو جنوب میں ساحل کاٹھیاواڑ کے قریب واقع ہے اور پرتگیزوں کے قبضے میں ہے ۱۲

بہاؤالدین کالج کی عمارت بڑی عالیشان ہے اور اس کا ہال نہایت وسیع ہے۔ کل علاقہ بھی میں اس ہال کی وسعت کے کھنے والے ہال بہت کم ہونگے اور کاٹھیا واڑ میں تو ایسا ہی ایک بھی نہیں۔ کالج کے متعلق جو بورڈنگ ہوس ہے اُسکے کمروں کی قطاریں بھی خوبصورت بنی ہیں۔ کمروں کی دونوں جانب برآمدہ ہے اور ہر کمرے میں ضروری فرنیچر میز۔ کرسی۔ پلنگ۔ الماری وغیرہ بھی مہیّا ہے۔ کاٹھیا واڑ میں جھولے کا بہت رواج ہے اس وجہ سے طلباء کی آسائش کے لئے ہر کمرے کے ساتھ برآمدے میں ایک ایک جھولا بھی لٹکتا ہے۔ پروفیسروں کے لئے بھی چھوٹے چھوٹے بنگلے بنے ہوئے ہیں اور پرنسپل صاحب کا بنگلہ تو بہت ہی اچھا ہے۔ بنگلوں اور کمروں کے سامنے چمن بھی آراستہ کئے جا رہے ہیں۔

یہاں کا جیلخانہ بھی قابل دید ہے۔ بیرونی دیوار جو بہت بلند ہے شکل مربع بنی ہوئی ہے۔ اس چار دیواری کے اندر تھوڑی سی کھلی جگہ چھوڑکر ایک ہشت پہلو احاطہ ہے۔ اس احاطے کی اندرونی جانب چھوٹے فراخ کمرے بنے ہوئے ہیں جن کے سامنے لوہے کی مضبوط سلاخوں کے جنگلے لگے ہیں اور برآمدہ بھی ہے۔ اس جگہ دن کے وقت قیدیوں کو علیحدہ علیحدہ مقفل کر دیا جاتا ہے اور وہ اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ کوئی دری یا تولیہ بنتا ہے۔ کوئی چکی پیستا ہے۔ کوئی کھانا پکاتا ہے۔ غرض کل کام قیدی اپنے ہاتھوں سے ہی کرتے ہیں۔ اس ہشت پہلو احاطے کے اندر اور تھوڑی کھلی جگہ چھوڑکر دوسرا ایک ایسا ہی ہشت پہلو احاطہ ہے جس میں رات کو قیدی سونے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ بالکل بیچوں بیچ میں ایک منارہ نما برج بنا ہوا ہے۔ اس برج میں داخل ہونے کے لئے جیل خانے کے اندر کوئی دروازہ نہیں ہے بلکہ جیلخانے کے باہر اس کا داخلہ ہے اور سرنگ کے ذریعہ اس برج تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہ اہتمام اس غرض سے کیا گیا ہے کہ اگر کسی وقت قیدی باغی ہوجائیں تو باہر سے فوج سرنگ کے راستے برج پر پہنچکر ان کو زیر کرسکے۔ مجرموں کو۔ خود انہیں کے قول کے مطابق۔ یہاں سوائے قید کے اور کوئی تکلیف نہیں ہے۔

ہر قسم کا آرام ہے۔ کھانا بھی اچھا ملتا ہے۔ تمام احاطوں میں خوشبودار پھولوں اور رنگ برنگ کے پتوں کے پودے لگے ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے حیرت میں ڈالا وہ یہاں کی صفائی تھی۔ زمین پر کہیں ایک تنکا بھی پڑا ہوا نظر نہیں آیا۔ قیدیوں کے جسم اور کپڑے بھی صاف ستھرے تھے۔ قیدیوں کے چہروں پر وہ کرنگی اور وحشیانہ پن بھی نہیں پایا جاتا تھا جو بالعموم جرائم پیشہ اشخاص کی شکلوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر قیدی کو اپنے مذہب کے طور پر عبادت کرنے کی تاکید ہے۔ بعض مسلمان قیدیوں کو میں نے تلاوت قرآن میں مشغول دیکھا۔ معلوم ہوتا ہے داروغہ جیلخانہ بڑا ادب آموز شخص ہے کیونکہ ہر ایک کام بڑی باقاعدگی سے انجام پاتا ہے اور قیدی ہم کو آتا دیکھ کر فوراً ایک طرف ہٹ جاتے تھے اور نہایت ادب سے سلام کرتے تھے۔ باہر کے پھاٹک پر تو سنتریوں کا پہرہ ہے ورنہ جیلخانے کے اندر جو کیدار اور منشی وغیرہ بھی سب کے سب نیک چلن قیدی ہی ہیں۔

کالج اور جیلخانے کے علاوہ۔ بہادر خاں ہائی اسکول۔ مہابت مدرسہ۔ کتب خانہ۔ میوزیم۔ جذامیوں کا دارالامان۔ محلات۔ مقبرے۔ مسجدیں۔ بہت ساری عمارتیں قابل دیکھنے کے ہیں جن کے بیان کو بخوف طوالتِ مضمون قلم انداز کرنا پڑتا ہے۔ ہاں۔ مہابت مدرسے کے متعلق۔ جو صرف مسلمان طلبا کے لئے مخصوص ہے۔ میں یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ریاست کو جیسی توجہ اس مدرسے کی طرف ہونی چاہئے ویسی نہیں ہے۔ تنخواہیں کم ہونے کی وجہ سے طبقہ معلمین تشفی بخش نہیں ہے لیکن ریاست ہی پر الزام لگانا بھی بجا نہیں۔ مسلمان رعایا بھی اپنی اولاد کو اس مدرسے میں بھیجنے سے غافل اور بے پروا ہے۔

شہر کے ایک مغربی دروازے سے۔ جو منتھلی دروازہ کہلاتا ہے۔ ایک ترچھی سڑک عیدگاہ کو چلی گئی ہے اور پھر عیدگاہ سے مڑکر جنوب کی طرف سیدھی چلی جاتی ہے۔ یہ سڑک جوناگڈھ کی بہترین تفریح گاہ ہے۔ کل سڑک کوئی دو میل تک باغات کے ایک سلسلے میں ہو کر گذرتی ہے۔ کہیں بڑے بڑے

سایہ دار درخت ہیں۔ کہیں دو باغوں کے درمیان کھیت لہلہاتے ہوتے ہیں۔ گرمیوں میں شام کو
جب گاڑی اس سڑک سے گذرتی ہے تو وہاں کی خنکی اور تر و تازگی سے دل کی کلی کھل جاتی ہے۔
میں روزانہ اس سڑک پر سیر کے لیے ضرور جاتا تھا۔ اس سڑک پر جو پہلا باغ آتا ہے وہ سردار باغ کہلاتا
ہے۔ یہ باغ بہت پرانا ہے جس کو سردار خاں فوجدار سوبہ نے [illegible] مطابق [illegible] میں
بنوایا تھا۔ یہاں گیر کے ایالدار شیروں کی ایک بڑی تعداد حجرات میں مقید ہے اور دیگر حیوانات
مثلاً لاما وغیرہ بھی جمع کئے گئے ہیں۔ باغات کا سلسلہ موتی باغ پر ختم ہوتا ہے جس سے نکل کر پریوں کے
تالاؤ پر پہنچتے ہیں۔ یہ تالاب بہت بڑا ہے اور پختہ بنا ہوا ہے لیکن اب خشک ہوگیا ہے۔ کہتے
ہیں اگلے زمانے میں پریاں اس تالاب میں نہایا کرتی تھیں جس سے اس کو پریوں کا تالاؤ کہتے
ہیں۔ حقیقت میں یہ مقام نہایت پُرفضا اور دلکشا ہے اور پریاں یہاں نہاتی ہوں یا نہ نہاتی ہوں
مگر مشرقی بامذاق طبیعتوں نے اس کو یہ نام دیکر یہاں کی مناظر فطرت کی قدردانی و نزاکت پسندی
کا ثبوت دیدیا ہے۔ افسوس ہے کہ جوناگڈھی اس سڑک کی سیر سے لطف نہیں اٹھاتے۔ ان کو
تو بس بازار میں حلوائیوں اور بھٹیاروں کی کثیف دکانوں کا دھواں ہی زیادہ مرغوب ہے
انہیں دکانوں کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔

حضور نواب صاحب کی خدمت میں باریابی کا شرف شب جمعہ کو حاصل ہوتا ہے کیونکہ اس شب کو
حضور گویا ایک چھوٹا سا دربار منعقد فرماتے ہیں اور جمعہ کے روز تمام دفاتر میں تعطیل رہتی ہے۔ یہاں
یہ کہدینا مناسب ہے کہ جوناگڈھ میں دن رات اور رات دن ہے۔ ملاقات و بازدید۔ ضیافت و مہمانداری
کھیل تماشے، ناچ رنگ۔ سب کچھ رات ہی کو ہوتا ہے۔ میرے زمانہ قیام میں دو جمعہ کی راتیں
واقع ہوئیں اور دونوں راتوں کو میں شرفِ باریابی سے ممتاز و سرفراز کیا گیا۔ سرِ شام ہی سے کوئی
دو گھنٹے تک تو حضور عام عرضداروں کی عرضیاں سنتے اور ان کے متعلق احکام صادر فرماتے
رہے۔ ٹھیک نو بجے میری طلبی ہوئی۔ متعدد سپاہی ننگی تلواریں لئے پہرہ دے رہے تھے

چوبدار سنہری روپہلی عصا لئے کھڑے تھے۔ نشست فرشی تھی۔ حضورِ معدوح مسند پر رونق افروز تھے۔ دائیں بائیں عہدہ دار و مصاحبینِ خاص براتب بیٹھے ہوئے تھے۔ جس وقت میں مسند کے روبرو پہنچا حضور ایک مصاحب سے گفتگو میں مصروف تھے۔ چوبدار کی صدا "سلام پہ نگاہ ہے مہربان ـــــ سلام" نے حضور کو میری طرف متوجہ کیا۔ آداب بجا لا کر میں نے تسلیم کیے ہوئے نذر پیش کی۔ حضور نے نذر قبول فرمائی اور بیٹھنے کی اجازت دی۔ دیر تک از راہِ ذرّہ نوازی تفتیشِ حالات فرماتے رہے اور نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے ◆

عبدالحافظ باعکظہ

ضروری اطلاع

ہمارے پاس اکثر خطوط ایسے آئے ہیں جن میں کسی پرچے کے نہ پہنچنے کی شکایت ہوتی ہے۔ اور عموماً اس شکایت کا باعث دفترِ مخزن کی بدنظمی قرار دیجاتی ہے۔ ناظرین ہماری اس دلشکنی کا اندازہ نہیں کر سکتے جو اس قسم کی شکایتوں سے محسوس ہوتی ہے۔ ہم اپنے ناظرین کو یقین دلاتے ہیں کہ یہاں رسالے کی روانگی میں ہر طرح سے احتیاط کیجاتی ہے۔ اور یہ کبھی ممکن نہیں کہ کسی صاحب کے نام رسالہ بھیجنے میں فروگذاشت ہو جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وقت اہالیانِ ڈاک کی غفلت سے رسالہ نہ پہنچے۔ اس کے انسداد کے لئے ایک دفعہ یہاں لاہور کے انسپکٹر صاحب نے ڈاک خانے میں خود بیٹھکر ہمارے رجسٹر کے ساتھ ہر پیکٹ کا مقابلہ کیا۔ مگر پھر بھی اس شکایت کا انسداد نہ ہو سکا شکایتیں برابر آئیں۔ اگر ناظرین مفصلہ ذیل امور محوظِ خاطر رکھیں تو اس قسم کی شکایتوں کے پیدا ہونے کا امکان کم ہو جاتے۔

(۱) تبدیلی مقام و پتہ سے ہر وقت دفتر ہذا کو مطلع فرماتے رہا کریں ◆

(۲) خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر رجسٹر اور مفصل پتہ تحریر فرمایا کریں ◆

(۳) اپنی ڈاک کے انتظام کا بھی خیال رکھیں ◆

(۴) جب رسالہ نہ پہنچے تو فوراً دفتر ہذا میں اطلاع دیں ◆

خاکسار مینجر

فنِ شاعری

(۴)

شاعری کے مذاقِ مخصوص یا امتیازی

کوئی شخص اپنی طبیعت یا مذاق ممتاز کو الگ نہیں کر سکتا۔ جو ہر ایک شخص کی طبیعت میں موجود ہے۔ ہر طبیعت ایک خاص مذاق یا ایک جداگانہ امتیاز رکھتی ہے۔ گو ہر طبیعت میں مختلف مذاق ہوتے ہیں لیکن اُن سب میں سے ایک مذاق مقابلتاً خصوصیت رکھتا ہے۔ اس خاص یا ممتاز مذاق کی جو خصوصیت ہوتی ہے وہ گو کسی وقت یا کبھی کبھی تصنع اور لطائف الحیل سے مخفی رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ اس کا شائبہ پڑ ہی جاتا ہے۔

بعض لوگوں کا یہ مقولہ ہے۔ کہ ممتاز یا خاص مذاق بدل سکتا ہے۔ اور اس میں وہ خصوصیت نہیں رہتی جس سے وہ ممتاز یا مختص ہوتا ہے۔ اُدھر واقعاتِ مختلفہ یہ ثابت کرتے ہیں۔ کہ خاص میلان یا رجحانِ غالب گو کہ خاص یا بعض اسباب سے دھیما یا مدھم پڑ جائے۔ مگر کالعدم نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس میں ایسی تبدیلی آ سکتی ہے۔ جس سے اس کی خصوصیت بالکل ہی اُڑ جاوے۔

اس بحث میں سب سے اوّل دیکھنا یہ ہے۔ کہ مذاق خاصہ سے مراد کیا ہے۔ یہ ہم مانتے ہیں کہ انسان کی طبیعت چند اور مختلف مذاق بھی رکھتی ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ اُن سب میں سے صرف ایک ہی مذاق خصوصیت رکھتا ہے۔ جو مذاق خصوصیت رکھتا ہے۔ دراصل وہ سرآمد اذواق ہوتا ہے۔ اور دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاویگا۔ کہ وہ عین طبیعت ہوتا ہے۔ یا یہ کہ طبیعت اس سے ایسی خصوصیت رکھتی ہے۔ کہ جو دوسروں سے نہیں ہوتی۔ کتنا ہی اسے چھپایا جائے اور کتنا ہی بیچ پردہ ڈالا جائے۔ کبھی نہ کبھی وہ جھلک مار ہی جاتا ہے۔ ایک حکیم کہتا ہے۔ کہ خاص مذاق انسانی زندگی

کا سہارا یا شغلہ ہوتا ہے۔ اور طبیعت . . . . اُسے اپنے ساتھ ہی[۱] لاتی۔ اور ساتھ ہی لیجاتی ہے۔

فلسفہ شاعری کے اعتبار سے شاعرانہ طبائع میں جس قدر خاص مذاق پائے جاتے ہیں۔ وہ مختلف پہلو رکھتے ہیں۔ اور انہیں مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے شاعری کے مدارج یا امتیازیہ مدارج بنتے ہیں اور انہی مختلف اذواق کے لحاظ سے ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم میں شاعری کی تعریف و تشبیب بدلتی ہوتی رہتی ہے۔

ہم مختصراً مندرجہ ذیل اقسام پیش کرتے ہیں:۔

مذاق مشکل پسند۔
" سہل پسند۔
" خاص پسند۔
" عام پسند۔
" باطن پسند۔
" ظاہر پسند۔
" تقلید پسند۔
" آزادی پسند۔
" اصل پسند
" نقل پسند۔
" امن پسند۔
" جنگ پسند۔
" مدح پسند۔
" ہجو پسند۔
" فلسفیانہ
" صوفیانہ
" رندانہ
" عاشقانہ

[۱] یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے آیا۔
" ہم سب مذاق اپنے ساتھ ہی طبعًا لاتے ہیں یا وہ
" عوارض و دیگر خارجی اسباب کا اثر ہیں۔
یہ ایسی طویل اور پیچیدہ بحث ہے جسے فلسفہ اخلاق میں انسانی افعال کی حسن و قبح کی بحث پیچیدہ اور مغلق ہے۔ چونکہ اس بحث کا فن شاعری سے چنداں تعلق نہیں۔ اسواسطے یہاں اس کی نسبت کچھ نہیں کہا جاتا۔ کبھی جداگانہ یہ شق بھی لینگے "

اگرچہ مذاق کے اور مراتب بھی ہونگے۔ مگر بڑی موٹی صورتیں یہی ہیں۔ یا ان کے قریب قریب ہیں۔
ان اقسام میں سے جو مذاق کسی طبیعت پر غالب ہوتا ہے۔ اسی رنگ میں اس کی شاعری بھی ہوتی ہے
میں یہ نہیں کہونگا۔ کہ ایسی طبیعت دوسرے رنگ میں شعر نہیں کہہ سکتی۔
کہہ سکتی ہے۔ لیکن برتری اور فوقیت اسی رنگ میں ہوگی۔ جس کا مذاق غالب ہو۔ اب ہم دیکھتے
ہیں کہ بعض طبیعتیں مشکل پسند ہوتی ہیں۔ اور بعض سہل پسند۔ بعض طبائع میں عاشقانہ مضامین کا
غلبہ ہوتا ہے اور بعض میں شریفانہ و اخلاقی مضامین کا۔ بعض فلسفی زمین میں شائق ہوتی ہیں۔ اور بعض رزم
و بزم میں۔ بعض قدرتی مواد کا چربہ اتارتی ہیں۔ اور بعض نقل پسند۔ بعض کے اشعار میں بالکل نوی
اور آزادی پائی جاتی ہے۔ اور بعض طبائع ہمہ تن قوت میں بھی ایک رنگ دکھا جاتی ہیں۔
بعض سلامت روی سے طبع آزمائی کی عادی ہیں۔ اور بعض باوجود جوش و شیدائی کے بھی
نکتہ چینی پر مائل۔ بعض تقلید پسند اور بعض شیدائے آزادی۔ ایک شاعر طبائع شاعرانہ کی نسبت
مختلف شکاری جانوروں سے دیتا ہے۔ اگر ایک ہی صید گاہ میں مختلف شکاری پرندے چھوڑے
جاویں۔ تو ہر ایک کی جھپٹ اور رخ جداگانہ ہوگا۔

شاعروں کی تشبیب کیوں ہوگئی۔

صرف اس واسطے کہ طبائع کے مذاق میں فرق تھا۔ معمولی اور عام مذاق میں تو شاعر کی طبیعت
قابو میں رہ سکتی ہے لیکن خاص مذاق کی حالت میں طبیعت خودبخود اس مرکز پر جا رہتی ہے۔ جس پر
مذاقیہ گھڑی کی سوئی قائم ہوتی ہے۔ شاعر بہترا زور لگاتا ہے کہ اس دائرے سے نکل جاوے
مگر زور مذاق طوعاً کرہاً اسی خاص دائرے میں لے ہی آتا ہے۔ بیشک فردوسی اور سعدی یا حافظ
اور صائب فارس میں۔ غالب۔ سودا۔ میر۔ درد۔ آزاد۔ حالی۔ امیر مینائی۔ داغ۔ اقبال
ناظر۔ نیرنگ۔ نذیر۔ ریاض۔ حسرت۔ جلال۔ شاد۔ شاطر۔ اکبر۔ شوکت۔ طالب۔ ارشد۔ ناظم
حبیب ہندوستان میں چیدہ شاعروں میں سے ہیں۔ یا یہ کہ لوگوں کی انہیں پر نظر پڑتی ہے۔ اور

ہر شعبہ شاعری میں یہ کام لے نکلتے ہیں۔ مگر اگر غور سے دیکھو تو شہرت انہیں بھی کسی خاص شعبہ میں ہی ہوگی۔ اُن کے کلام سے تاڑنے والے تاڑ جاتے ہونگے۔ کہ ان کی طبائع کا مذاق خاص کونسا ہے۔

سعدی بڑا نامور شاعر اور ہمہ دان گذرا ہے۔ لیکن فردوسی کے مقابلے میں باعتبار رزمیہ شاعری کے نہیں آسکتا اسی طرح فردوسی۔ سعدی کا مقابلہ اس کی اپنی زمین میں نہیں کر سکتا۔ امیر مینائی کے رنگ میں مرحوم داغ مشکل ہی سے بازی لیجا سکتے ہیں۔ اور امیر مرحوم داغ کی زمین میں ذرا جھجک کر ہی قدم رکھینگے۔

ان سب نامورانِ زمان کے دواوین مقابلتاً سامنے رکھکر دیکھو۔

"ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"

یہ جدا بات ہے۔ کہ ایک شاعر طبیعت کے اعلیٰ مذاق کے خلاف دُوسری زمین میں مشق کرتا ہے۔ اور اس میں بھی کچھ نہ کچھ درجہ اور ملکہ پیدا کر لیتا ہے۔ یہ ایک مشق ہے۔ جو اس بحث سے خارج ہے۔

زمانہ اور شاعری۔

جو کچھ ہمارے اردگرد پایا جاتا ہے۔ یا جو کچھ ہم دیکھتے اور سنتے ہیں۔ یہ سب زمانہ یا زمانے کے آثار اور مظاہر ہیں۔ ہر زمانے میں جو جو علوم اور جو جو فنون مروج ہوتے ہیں۔ وُہ زمانہ موجودہ کی زد یا تاثیر سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اور یا یُوں کہئے۔ کہ ایسے تمام علوم و فنون زمانہ موجودہ کے آثار اور مدخلات سے ہی ترکیب اور ترتیب پاتے ہیں۔

ان سب علوم یا فنون میں سے موسیقی اور شاعری کا ایسا فن ہے۔ جس پر موجودہ زمانے کے آثار کا بہت کچھ یا فوری اثر ہوتا ہے۔ اِن دونوں فنون کی گرم بازاری زیادہ تر زمانے کے مقتضیات پر موقوف ہے۔ بعض وقت زمانے کی رفتار اور زمانے کی تقلید بڑے بڑے شاعروں کو بھی مذاق کش بنا دیتی ہے۔ گو ان کا مذاق کچھ اور ہوتا ہے لیکن انہیں زمانے کے مقتضیات کی بدولت مذاق میں تبدیلی کرنی ہی پڑتی ہے۔

کچھ شک نہیں کہ فنِ شاعری ورخصوصاً شاعری کا اعلیٰ زینہ یا معراج اس خالص مذاق پر بہت کچھ موقوف ہے۔ جو طبعاً ہر ایک شاعر رکھتا ہے۔ لیکن مقتضیاتِ زمانہ کا اتباع بھی بعض اوقات سخت لازمی ہوجاتا ہے اور باوجود اس کے بھی شاعر زمانے کے رنگ میں رنگا جاکر اپنے خاص مذاق کی جھلک دے ہی جاتا ہے۔

ایک طرف شاعر طبعی مقتضیات کے مطابق اپنی فرقہ بندی کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف زمانہ بھی انکی جماعت بندی کرتا ہے۔ بعض اوقات شاعروں کے طبعی مذاق بالکل مدھم اور دھیمے پڑجاتے یا زنگ خوردہ ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ زمانے کی پیچ دست برد دنیا کی تحریص، ترغیب اور جدتِ طبائع پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اور اُن انوار اور اشعہ پر ایک حجاب سا آجاتا ہے۔ جو معراجِ شاعری کا زینہ ہیں۔

گو زمانہ اپنے زور سے شاعروں کی جماعت بندی کرتا ہے لیکن شاعر بھی اپنے مخترعات اور موجدات سے زمانے پر بہت کچھ اثر ڈالتے اور اہلِ زمانہ کو ایک خاص مذاق کی طرف لیجاتے ہیں۔ جادو بیان شاعروں کی نظموں اور شاعری نے بعض وقت زمانے کے لوگوں اور موجودات پر ایسا فوری اثر کیا ہے۔ کہ اہلِ زمانہ کی کایا پلٹ دی ہے۔ گو ایک شاعر زمانہ اور اہلِ زمانہ سے سبھی سب کچھ لیتا ہے۔ لیکن جب اس کا معاوضہ دیتا ہے۔ تو اس خوبصورتی سے کہ دونوں میں نور اور ظلمت کی نسبت ہوجاتی ہے۔ ایک کاریگر عام مواد سے ایک ایسی مشین تیار کرتا ہے۔ جو سب کی نظروں میں سودمند اور بھلی معلوم ہوتی ہے۔ یہی حال شاعر کا ہے۔ شاعر عام واقعات خشک سانحات مخفی کیفیات اور کھردرے الفاظ میں جان بخش اثر ڈالتا اور ایک ناموزون اور بھدی صورت کا مبادلہ دلچسپی سے کرتا ہے۔ جب کبھی شاعر زمانہ کی گندی مقتضیات سے دوچار ہوتا ہے تو اسوقت باوجود نفاستِ طبع اور مذاقِ پاکیزہ کے بھی شاعری میں ایسے ایسے ناگفتہ مقامات بھی آجاتے ہیں جو کسی قدر یا بالکل مرکزِ تہذیب سے ہٹے ہوتے ہیں بعض شاعر اس دور

میں جان بوجھ کر شامل ہوتے ہیں - اور بعض طوعاً و کرہاً یہی خوفناک وقت ہے جس سے ایک قوم کے لٹریچر اور علم ادب میں گندی باتوں اور گندہ خیالات کا نشو و نما یا مجموعہ ہونے لگتا ہے - یہی خوفناک منزل ہے - جو ایک قوم یا ایک ملک کے علم و ادب کے راہوں میں مزاحم ہوتی اور اُسے بدنام کرتی ہے

یہ عمل اسواسطے بھی زیادہ ہوتا ہے - کہ شاعرانہ طبیعتیں عام خاص ہی ہوتی ہیں - اور ان خواص میں سے اکثر طبیعتیں ایسی شعر پسند ہوتی ہیں - اور اس بات کی عادی کہ نظم پیشہ لوگوں کا اکثر حصہ انکی طبائع کے موافق ہو - چونکہ شاعروں کا قرب انہیں لوگوں سے ہوتا ہے - اسواسطے بعض اوقات انہیں طوعاً و کرہاً ایسے مقامات سے بھی گذرنا ہی پڑتا ہے - اور رفتہ رفتہ انہیں کے نقش قدم پر عام شاعر بھی اُن میں میں بہت کچھ حصہ لینے لگ جاتے ہیں - جس کا نتیجہ ہوتا ہے - کہ ناسودمند اور بُرے مواد بہت جلد سرزمین شاعری میں نشو و نما پانے اور نظر آنے لگ جاتے ہیں -

ایک جنگجو بادشاہ کے زمانے میں شاعروں کا زور نسبتاً نظم رزمیہ پر کچھ زیادہ ہو جاتا ہے اور ایک عیاش سلطان کے عہد میں گل و بلبل - زلف و خال کی تفسیر پر ہی طبع آزمائی کیجاتی ہے -

جس قوم اور جس ملک میں آزاد منشی اور حق گوئی کا مشرب گوئے سبقت لیجاتا ہے - اس میں شاعروں کی جماعت بافراط اپنے اپنے مذاق کے سرزمین شاعری میں آتی اور مشق کرتی ہے یہی دور - اور یہی زمانہ شاعری کے معراج کا زمانہ اور شہرت کا زینہ ہے - ایسے ہی زمانے میں اعلیٰ پایہ طبعی شاعری پر روشنی پڑتی ہے - اور ایسے ہی زمانے میں ایک شاعر اپنے جواہر طبیعت سے زمانہ اور اہل زمانہ پر روشنی ڈالتا ہے -

باقی آئندہ

کنارِ راوی

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی

پیام سجدے کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو
جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھ کو

سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام
لیے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام

عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا

کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی
منارِ خواب گہِ شہسوارِ چغتائی

فسانۂ ستمِ انقلاب ہے یہ محل
کوئی زمانِ سلف کی کتاب ہے یہ محل

نظارۂ موج کو پھر وجہِ اضطراب ہے کیا؟
یہ کہنہ مشق نوا موزِ پیچ و تاب ہے کیا؟

مقام کیا ہے سرودِ خموش ہے گویا
شجر یہ انجمنِ بے خروش ہے گویا

نمازِ شام کی خاطر یہ اہلِ دل ہیں کھڑے
مری نگاہ میں انسان پابگل ہیں کھڑے

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہوا ہے موج سے ملاح جس کا گرمِ ستیز

سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقۂ حدِ نظر سے دور گئی

جہازِ زندگیِ آدمی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

اقبال

وہ تشنۂ لطفِ زندگی تھا   شوق آبِ بقا کے پیچ میں

وہ بلبلِ خوش بیاں ہے خاموش

ہیں غم سے اڑے ہوئے یہاں ہوش

آج اسکو کہاں سے جا کے لائیں   اٹھ پڑھ کے کسے غزل سنائیں   کس گوشے میں ہم حزیں ڈھونڈیں   جا کے آئے تو آسمان پہ جائیں

ہے کون شفیق ایسا استاد   تصنیف کی جس سے داد پائیں   قسمت سے رہا مآلِ تدبیر   گر کوئی ہو کس طرح بنائیں

ثابت ہوا رنگِ دورِ افلاک   دم بھر میں بلائیں گئیں ہوائیں   انجمن جہاں ہوئے درہم   بیٹھے ہوئے کیا نظر اٹھائیں

آزردہ درد و غم ہیں ان سے   دل کس کو دکھا کے دکھ اٹھائیں   یاد دل ہے ہماری آہ و زاری   ہمت سر چڑھ گئیں گھٹائیں

ہے دل میں کہ روئیں اب بیٹھ   آنکھوں سے جگر کا خون بہائیں

آزردہ اگر یہاں رہیں گے

دکھ درد کسی سے کیا کہیں گے

حالی ہوئی کب کسے تو تقدیر   ہر صورت نقش ایک تحریر   کیا خوب ہر غزل بیان آہ   باتوں میں اثر زبان میں تاثیر

موہوم تھے جو قند و مضامیں   کھینچی قلمِ سخن سے تصویر   مستور ہے جامع المعانی   یزدانی خوش بیان کی تقریر

دعویٰ کو کیا اسی نے باطل   کام آئی نہ مدعی کی تدبیر   دیکھا جو مشاعروں میں بھاگے   اُن کے سامنے سے بے پیر

سیفی تھا ہر ایک فقرہ نثر   مصرعے تھے کھنچے ہوئے کہ شمشیر   وہ رعبِ کلام تھا کہ ہر دل   سن سن کے خموش تھے سخن گیر

کھلتی نہیں بندشِ معانی   عاجز ہے نکتہ رس مشاہیر

دم بھر میں اجڑ گیا چمن آج

خالی ہے سخن سے انجمن آج

خوں گشتہ ہے آرزوئے ناشاد   حسرت ہوئی شاعری کی برباد   کس کس کے غم و الم میں ہیں   کس کس کی کریں خدا سے فریاد

اللہ رے شانِ کبریائی   برباد ہے کوئی کوئی آباد   منظور نہ تھی اسیریِ دہر   پابند تھا کب وہ مردِ آزاد

واللہ کہ شک نہیں یقیں ہے   بیشک وہ طبع تھی خداداد   الفاظ میں رنگ اک نرالا   اشعار میں اک عجیب ایجاد

جس رنگ میں جو کہا ہو استاد | بے شبہ نہیں ہے مثل اُسکا | پائی نہ کسی نے طرز اُستاد | ہاتھ آئے یہ بات کب کسی کو

بھولینگے نہ زندگی میں ہرگز | [illegible] گئے یہ نظم کی یاد

[illegible]

[illegible]

وہ میر سخن وحید و یکتا | وہ ناسخ مصحفی و آتش | [illegible] | [illegible]

وہ سوزِ کلام درد آمیز | [illegible] | [illegible] | [illegible]

خوش طبع انیسِ بزم مضموں | آسودہ [illegible] | [illegible] | سمجھا نہ کسی کو [illegible]

دلدار و حسین و مونسِ خلق | زینت وہ جلسہ جات | جیسے رہے آتش [illegible] | محفل میں مثال شمع [illegible]

صاحب ہیں صمیم [illegible] | جو کچھ [illegible] وہی ہے زیبا

تھا ذات [illegible] ہیں سب غائب
وہ مومن پاک [illegible] غالب

صمیم بلندشہری

رمضان

لو آگیا رمضاں چھپے ہیں ساری رات | یہ دن پھرے ہیں کہ اب دن سے بھی ہے پیاری رات

طلوعِ فجر سے ہے اب غروبِ شمس عزیز | وہ دن گئے دلِ بیمار پر ہے بھاری رات

بدلنے دیتے نہ کافورِ صبح سے یہ مشک | ہوئی نہ اے فلکِ پیر اختیاری رات

کبھی بلا تھی یہی اور اب بڑھاتی ہے | دلوں میں دن کے تصور سے بیقراری رات

ہر ایک دن ہے شبِ عید۔ شام صبحِ اُمید | فلک نے شام نہ ایسی کوئی سنواری رات

وہ مسجدیں وہ تراویح وہ صفیں وہ امام — گذر گیا ہے ہمیشہ جنہاں پہ ساری رات
وہ روشنی کنولوں کی وہ ریزشِ گلِ شمع — تمام رات ... ستارہ ... [illegible]
گذرتے جاتے ہیں روزے بڑھتی جاتی ہے — دلوں کے حوصلے ... [illegible] ... کی رات
عجیب ماہِ مبارک ہے ... کی طرح — کسی کے دن ... [illegible] ... رات
بجا ہے کھینچ کے لاتے جو روزِ عید الفطر — ... روز کی ... [illegible] ... داری رات

آزاد عظیم آبادی

نور دیجور

عالم امکاں عجب دریائے بے پایاں ہے — پھیلا پانی کا ہے ہستی انسان ہے
آدمی کا دل ہے لنگر۔ آب دریا جان ہے — نیک عمل کشتی ہے۔ جس کا ناخدا انسان ہے

دو کنارے اس کے ہیں۔ یہ ایک پکی بات ہے
اک کنارے پر ہے دن۔ اور دوسرے پر رات ہے

ہو رہا ہے ایک پر آئینہ عالم نور کا — ایک کی زلف دوتا میں رنگ ہے دیجور کا
ایک کے رخ پر اجالا ہے چراغ طور کا — ایک گویا منہ تماشا دیدہ ہے دور کا

ایک پر سورج۔ غدارِ حور کا آیا ہوا
ایک پر بادل رخ رنجور کا چھایا ہوا

ایک پشتے پر شگفتہ ہے چمن بے خار کا — ایک ساحل پر ہویدا گھاٹ ہے تلوار کا
ایک کے دامن میں گچھا گوہرِ شاہوار کا — ایک کے سیلاب میں گرداب ہے آزار کا

ایک کی موجوں میں ظاہر آب گوہر صاف صاف

ایک لہروں میں ہے باہر آب بحر صاف صاف

جس کو [illegible] دن بھر اس پر ہے [illegible] ہو ایک
جس [illegible] رت بھر اس پہ کھڑا [illegible] ہو ایک

آفتاب جس سے روشن مکاں ہوتا ہی ایک
آنسوؤں سے شب اندھیری رات میں [illegible] ہو ایک

دن ہے [illegible] کے - لاوارثوں کا [illegible]

سر پہ [illegible] کے مگر آفتاب خدا کی ذات ہے!

طالب بنارسی (از بمبئی)

صدائے قومی

سو چکے خوب بس اے میرے عزیزو جاگو
قافلے والے گئے دور - [illegible] جاگو

اس کا افسوس نہیں چلتا جو تھک کر رہ جائے
حیف اُس پر ہے ذرا چل کے جو اُلٹا پھر آئے

ہاں اُٹھو - تاب و تواں تم میں نہیں کیا باقی؟
ہائے کیا ڈال کے [illegible] دے گیا تم کو ساقی!

اُٹھ کے بیٹھو کہ تمہیں دُور بہت جانا ہے
رات تھوڑی ہے بڑے طول کا افسانہ ہے

تم نہیں وہ کہ شل کل تھی تمہاری ہمت؟
تم نہیں وہ کہ دلوں پر تھی تمہاری شوکت؟

پرچمِ اقبال کا دُنیا میں اُڑایا کس نے؟
ملکداری کا سبق سب کو پڑھایا کس نے؟

کس سے شاداب ہوا گلشنِ صد علم و ہنر؟
کس سے آغاز ہوا بزمِ حقیقت [illegible]؟

کون تھا نام پہ جو جنگ کے جاں دیتا تھا؟
جم کے جو نام نہ ہٹنے کا کبھی لیتا تھا؟

تو چلو اُٹھو کہ دل کش ہے سہانا ہے سماں — سامنے ٹیلے پہ اُترا ہے وہ منزل کا نشاں
اب بھی ہمت جو کرو بات بنی جاتی ہے — سُن لو کانوں سے وہ آوازِ درا آتی ہے

سیّد نذیر حسین

شباب

نہ پُوچھو دوستو تم ہم سے یہ کہ کیا ہے شباب — ترقیوں کے زمانے کا منتہا ہے شباب
شباب کیا ہے؟ اُمنگوں کا دور دورہ ہے — کلیدِ عیش ہے طاقت، وہ قوی ہے شباب
شباب کیا ہے؟ خدا داد ایک قوت ہے — زمانہ قدر کا اور عقل و ہوش کا ہے شباب
یہ کیا ہے؟ غازۂ روئے بتانِ حسن نما — مسرّتوں کے چمن کے لیے صبا ہے شباب
اسی میں ہوتی ہیں پُر زور قوتیں ساری — ہزاروں لاکھوں دواؤں کی ایک دوا ہے شباب
جو اس میں کر لیا۔ وہ کر لیا۔ رہا تو رہا — قوی ہے کام کے لینے کا وقت کیا ہے شباب
اسی کو روتے ہیں ہر وقت یاد کرتے ہیں۔ — عزیز جتنا کرے جائز اور بجا ہے شباب
اسی کو پُوچھتے ہیں اور اسی کو چاہتے ہیں — عجب زمانہ ہے ہر شخص ڈھونڈتا ہے شباب
ادائیں اس کی وہ پیاری کہ کیا کہوں تم سے — ستم ہے۔ قہر ہے۔ آفت ہے اور بلا ہے شباب
اسی کی دل میں ہے قوت نگاہ میں طاقت — جوانو! شکر کرو رحمتِ خدا ہے شباب
تمام قوتیں اسی کے دم کے ساتھ تو ہیں — یہ دل کا جوش ہے اور نور آنکھ کا ہے شباب
شباب کیا ہے؟ پسندیدگی عام کا پاس — تمام زندگی میں ایک خوشنما ہے شباب
شباب مردوں کا حُسن۔ عورتوں کا زیور ہے — مزے کے لوٹنے کا عین وقت کیا ہے شباب

شباب کیا ہے؟ مزے لوٹنے کا [illegible] ہے
تمام عیش پسندوں کا مدعا ہے شباب

بہار باغ جوانی کے لوٹنے والے
اگر ہیں کاہ تو لاریب کہربا ہے شباب

نظر اٹھا کے جسے دیکھا محو دید کیا
پری رخوں کی [illegible] ہے شباب

جنہیں [illegible] سمجھتے ہیں [illegible]
وہ دل ربا ہیں [illegible] دلربا ہے شباب

شباب [illegible] کا مخزن ہے عشق کا [illegible]
[illegible] ہے شباب

یہ عقل [illegible] کرتا ہے [illegible]
[illegible] ہے شباب

کوئی بچائے متاع حجاب کو کیونکر
جہاں میں ایک [illegible] ہے شباب

نہ ہوتا [illegible] گناہ لوگوں سے
گنہگار نہیں [illegible] ہے شباب

جو بات بات میں شرم و حجاب کرتے تھے
حجاب و شرم کو [illegible] ہے شباب

خوش کلیں [illegible] بری اور کریہہ منظر تھیں
حسین آج انہیں کو بنا رہا ہے شباب

جو نشہ اس میں ہے ہرگز نہیں شراب میں وہ
نشہ کی چیزوں میں سب سے بڑھا ہوا ہے شباب

جو تم نہیں تو نہ پوچھے گا بات بھی کوئی
بصد غرور حسینوں سے کہہ رہا ہے شباب

جو اپنے حسن کی قیمت وصول کرتے ہیں
بس ان کے واسطے دنیا میں کیمیا ہے شباب

پھنسا جو دام میں اس کے وہ بچ نہیں سکتا
خدا بچائے بہت ہی بری بلا ہے شباب

بناتا ہے یہی بینا کو محض نابینا
جو لوگ اندھے ہیں ان کے لئے عصا ہے شباب

شباب میں نہیں کچھ نیک و بد نظر آتا
جنون غور سے دیکھو تو دوسرا ہے شباب

ازل میں حسن کی لکھی گئی تھی جو لائف
سنہری حرفوں سے اس میں لکھا ہوا ہے شباب

کہاں ہیں قدر شناسان حسن محبوباں
عروس حجلہ خوبی بنا ہوا ہے شباب

حسین عورتوں ہی پر نہیں ہے کچھ موقوف
کسی کا کیوں نہ ہو دلچسپ خوشنما ہے شباب

یہ ایک قدرتی محرم ہے جو بتوں کے لئے
غضب کا انکو یہ دل کش دکھا رہا ہے شباب

سکھاتا لوگوں کو ہی جو غرور و خود بینی | وہ خود نمائی و نخوت کا آئینہ ہے شباب

رہے شباب کے عالم میں نیک کیا کوئی | ستم ہے دشمن ہر نیک پارسا ہے شباب

جو کام دیتا ہے یہ کوئی دے نہیں سکتا | جہاں میں سب سے زیادہ گراں بہا ہے شباب

یہ جائے پھر کبھی صورت دکھا نہیں سکتا | شمیم گل ہے یہ دو روز کی ہوا ہے شباب

شباب کا ہے حقیقت میں کچھ عجب عالم | جو آفتاب ہے انسان تو ضیا ہے شباب

نہ صرف آدمی کا بلکہ ساری چیزوں کا | عجیب دلکش و دلچسپ دور رہا ہے شباب

شباب کیا ہے؟ یہ ہے ایک خواب راحت انگیز | رہیگا اور کسی کا کبھی رہا ہے شباب

جو ناز کرتے ہیں اس پر وہ سخت احمق ہیں | ہوا ہے صبر دل درد آشنا بہ شباب

غرور کچھ نہیں لازم شباب کے اوپر | یہ چند روزہ ہے اور مختصر بقا ہے شباب

جو بے تکے ہیں اور ان کا شباب ہی کیا ہو | وہ آشنا ہیں کسی سے نہ آشنا ہے شباب

وہ کون ہے جو بڑھاپے میں یہ نہیں کہتا | چھڑا کے ہم کو مصیبت میں چل بسا ہے شباب

بڑھاپا کیا ہی ہو جیتے جی کا ساتھی ہے | وہ بے وفا نہیں جیسا کہ بے وفا ہے شباب

ہمیشہ سب نے کہا اور سب کہیں گے یہی | حباب سے بھی کہیں بڑھ کے بے بقا ہے شباب

یہ اتنی جلد گذرتا ہے کیوں سبب کیا ہے؟ | شب وصال ہے یا روز عیش یا ہے شباب

غلط ہے کوئی گھڑی گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے | بڑھاپا ہے شب غم ہی ورنہ کم ہوا ہے شباب

طویل ہے شب فرقت نہ مختصر شب غم | نہ رنگ رخ کی طرح سے گریز پا ہے شباب

زمانہ عیش کا ہوتا ہے مختصر معلوم | اسی سبب سے یہ کہتے ہیں بے بقا ہے شباب

بہت ہی اچھا ہے جو کچھ نہیں ثبات اسے | جرائم اور معاصی ہی پر فدا ہے شباب

رہے جوانی میں جو متقی و نیک خصال | اسی کا اچھا ہے پیارا ہے خوشنما ہے شباب

متین کر عمل نیک اور قدر شباب | خدا رکھے ابھی تیرے شباب کا ہے شباب

عبد المتین از بھوپال

دنیا کے چمن کے نونہالو | تھوڑی سی پیکر پھلنے والو
قانون خدا جو توڑتے ہیں | جو صداقت سے منہ کو موڑتے ہیں
رہتے ہیں وہ اثر بار ہو کر | پاتے ہیں سزا نہایت سخت مر کر
دنیا کی حیات کا مزا ہی | لاتی ہے عذاب آسمانی
[illegible] | سب نام و نشان مٹا کے چھوڑا
اس میں نہیں نور آسمانی | جس سے ہو سرور جاودانی
جو کچھ ہے وہ [illegible]

اے غافلو بھول کر نہ سونا | انجام سے بے خبر نہ ہونا
غافل نہیں حق کا کارخانہ | [illegible]
قائم نہیں رنج و شادمانی | عبرت کی جگہ ہے دار فانی
دنیا [illegible] | [illegible]
[illegible] | دنیا [illegible]
اللہ [illegible] | [illegible]
گوھر [illegible]

تازہ غزلیں

نہ بیخوابی نہ بدخوابی کوئی تربت کے سونے میں
عجب آرام سے چھپکے پڑے ہیں ایک کونے میں

وہ ایسا کون ہے ڈالے ہلاکت میں جو دل اپنا
میں خود رونا نہیں ناصح مزا ملتا ہے رونے میں

جہاں چاہو میسر ہے نہ میلا ہو نہ بوسیدہ
خدا نے کیا شرف رکھا ہے مٹی کے بچھونے میں

ترے عاشق کو راحت مل چکی لے وائے ناکامی
شبیں کٹتی ہیں بے تابی میں دن کٹتے ہیں رونے میں

خزاں نے کیسے کیسے نخل کو پامال کر ڈالا
مشقت باغباں نے کسقدر کھینچی تھی بونے میں

تلاش دل تو اے ناصح بھلا اک امر آخر ہے
مجھے ہر گفتگو کمبخت کے ہونے نہ ہونے میں

کہاں پھینکا ہے لاکر روح نے اس جسم خاکی کو
یہی ہوتا ہے طاقت سے زیادہ بوجھ ڈھونے میں

در مضموں کو ہر اک گوندھ لے ای شاد مشکل ہے
سلیقہ انتہا کا چاہیے موتی پرونے میں

شاد عظیم آبادی

کیا انہماکیٔ خواہش و بیگانگیٔ دہر — ہوں میں وہ جنس کوئی جسکا خریدار نہیں!

حسن! یہ تیرے کرشمے ہیں کہ یا ابتہجہ شوق — طاقتِ دید نہیں قوتِ گفتار نہیں

سیرِ طوفانِ حوادث نہیں کارِ آساں — بخت پر اپنے ہیں نازاں ہو کہ بیدار نہیں

چاہتے ہو کہ میں پھر کھاؤں فریبِ غمزہ — لب پہ اقرار کہاں ہے اگر انکار نہیں؟

کچھ اگر ہے تو ہے دلجوئی دشمن کا گلہ — ورنہ کچھ شکوۂ بے مہریٔ دلدار نہیں

اثرِ عشوہ سے تیرے ہے عجب حال مرا — شکوہ لب پر ہے مگر رخصتِ اظہار نہیں

درک و ادراک کی ہے ہم کو حقیقت معلوم — کچھ وہی لوگ ہیں ہشیار جو ہشیار نہیں

آنکھ کھلتی ہے دو رنگیٔ جہاں پر سب کی — ورنہ یاں کس کو تمنا ہے سروکار نہیں

ریختے میں ہے مرے رنگِ ظہوری وحشت
ہر کوئی جسکو سمجھ لے یہ وہ اشعار نہیں

رضا علی وحشت (از کلکتہ)

باتوں پہ دل جلوں کی نہ آ اے جان جائیے — بس ہو چکی بہت خفگی۔ مان جائیے

صدقہ ان انکھڑیوں کا ادھر بھی نگاہِ ناز — ہم وہ ہی آشنا تو ہیں پہچان جائیے

بے فائدہ ہے حضرتِ ناصح یہ قیل و قال ق — بندہ نواز بہرِ خدا مان جائیے

سیرت وہ دلپسند کہ دل کیجئے نثار — صورت وہ دلفریب کہ قربان جائیے

اچھا قصور وار جو اب کچھ گلہ کروں — پامال کیجئے مرے ارمان جائیے

سیری تو کچھ نہیں ہوئی دیدار سے مگر — اللہ کے سپرد مری جان جائیے

جھگڑے یہ حسن و عشق کے سب چھوڑیئے رضا — کسبِ کمال کیجئے۔ جاپان جائیے

رضا

اس عرق ماء اللحم کے پینے سے خون کا مقدار جسم انسان
عرق ماء اللحم
عرق ماء اللحم
پتہ: حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکماء
ایڈیٹر رسالہ حافظ صحت لاہور

ELIZABETH ADELAIDE MANNING.

حُرّیت اور آزادی

گذشتہ گرما میں جب مہاراجہ بروداہ انگلستان تشریف رکھتے تھے۔ ایک دن لندن کے ایک مجمع میں وہ بمع مہارانی صاحبہ کے آئے۔ میل جول کا جلسہ تھا اور لوگ بے تکلفی سے اپنے اپنے حلقوں میں باتیں کر رہے تھے۔ مہاراج کے مزاج میں چونکہ بے ساختہ پن انتہا درجے کا ہے۔ اسلئے وہ بھی خلق سے ہر ایک سے باتیں کرنے لگے۔ اور لیڈیاں رانی صاحبہ کی طرف جھکیں۔ اور چونکہ رانی صاحبہ اخلاق کے اعتبار سے اپنے نامور اور ممتاز شوہر سے کچھ کم نہیں۔ اور حسن سیرت و صورت کے ساتھ جوہر شرافت رکھتی ہیں اسلئے اُن کے گرد ایک معقول حلقہ سلامیوں کا ہو گیا۔ اس حلقے میں ایک ہندوستانی بزرگ تھے عمر رسیدہ اور ریاستی لباس پہنے ہوئے۔ کسی بڑی ریاست کے اہلکار تھے۔ مہاراج اُنکی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ آپ کب سے یہاں ہیں۔ اونہوں نے کہا۔ کہ چند ہفتے سے۔ مہاراج نے کہا آپ نے بڑی ہمت کی۔ کہ اس عمر میں اتنے لمبے سفر کا عزم کیا۔ آپ جیسے تجربہ کار لوگوں کا اس ملک میں آنا اور یہاں کے حالات کو دیکھنا مفید ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ اسی شوق

نے اتنی دور کھینچا۔ مہاراج نے سوال کیا۔ آپ کس صیغے سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں
آیا آپ یہاں کی تعلیم گاہیں دیکھ رہے ہیں۔ یا تجارت گاہیں۔ یا صنعتی کارخانے۔ اُنہوں
نے کہا۔ اب میری عمر ان چیزوں کے مفصل طور پر دیکھنے کی نہیں ہے۔ میں سرسری طور پر
بہت سی چیزیں دیکھ رہا ہوں اور جو چیز یہاں کی مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ یہاں
کی لبرٹی ہے۔ مہاراج یہ لفظ ایک بوڑھے ریاستی اہلکار کی زبان سے سُن کر خوش ہوئے اور
مسکرا کر انہیں اپنے ساتھ ایک کونے میں لے گئے۔ اور دیر تک اُن سے باتیں کرتے رہے

اس ایک لفظ میں کیا جادو تھا اسے وہی سمجھ سکتے ہیں۔ جن کے دل میں اسکی قدر
ہے۔ مگر ہم میں کتنے ہیں جو اسکی پوری قدر کرتے ہیں۔ یا کر سکتے ہیں۔ پوری قدر کے یہ
معنی کہ اسے جان و مال سے عزیز سمجھیں۔ جیسے بزرگوں کے قصے سنتے ہیں۔ کہ وہ
مال و جان اولاد سب چیز پر آبرو کو مقدم رکھتے تھے۔ اور چاہے کیسی تکالیف کا سامنا ہو
آبرو پر آنچ نہیں آنے دیتے تھے۔ اُس طرح اس مجموعی آبرو۔ اس قومی عزت۔ اس
ملکی نمود پر جو لبرٹی سے وابستہ ہے مر مٹنے والے ہم میں کہاں ہیں۔ ہمارے ہاں اس
انگریزی لفظ کا ترجمہ عموماً آزادی کیا جاتا ہے۔ مگر انگریزی میں ایک لفظ بھی ہے جسکا ترجمہ
اردو میں "آزادی" ہی ہے۔ یعنی "فری ڈم"۔ گو یہ دونو انگریزی لفظ اصل میں مترادف
ہیں۔ مگر تخریج کے فرق نے ان کے معانی میں ایک باریک سا فرق پیدا کر دیا ہے۔ لبرٹی
لاطینی زبان سے لیا گیا ہے۔ اور فری ڈم سیکسن اصل سے ہے۔ معنی دونو کے وہی
ہیں۔ اور اب بھی بعض اوقات ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو جاتے ہیں۔ لیکن اصطلاح
میں جو لطیف امتیاز ان کے معنوں میں پیدا ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ "فری ڈم" مطلق آزادی
کے لئے چاہے وہ خیالات کی ہو۔ عادات کی ہو۔ اطوار کی ہو۔ ذاتی ہو۔ یا ایک جماعت کی
ہو۔ استعمال ہوتا ہے۔ اور لبرٹی ملکی آزادی کے معنوں میں زیادہ مستعمل ہے۔ ہمارے ہاں

اکثر ان دونوں الفاظ کے لئے ایک ہی ترجمہ ہونے سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی لبرٹی کے خاص مفہوم کے لئے ایک خاص لفظ قرار دیں۔
اور میرے خیال میں اس مفہوم کو عربی لفظ 'حرّیت' سے بہتر کوئی لفظ ادا نہیں کرتا۔ اور چونکہ
'حرّیت' پہلے سے ہی ہمارے ہاں مروّج بھی ہے۔ اس لئے اسکے زیادہ استعمال میں کوئی
رکاوٹ نہیں۔ مصر کے عربی اخبارات میں یہ لفظ بہت مستعمل ہے۔ گو وہاں عموماً حمیت قومی
یا ملکی کے معنوں میں آتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھیں تو مفہوم ہر حال وہی رہتا ہے۔
کیونکہ حمیت قومی یا ملکی لبرٹی کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور اگر کسی تعلق سے ہو بھی جائے
تو پنپنے نہیں پاتی۔ حمیت قومی ایک پودا ہے جو حرّیت کی سرزمین میں اگتا ہے۔ حرّیت کے
پانی سے سرسبز ہوتا ہے۔ اور حرّیت کی ہوا اسے راس آتی ہے۔ اور جگہ جہاں بھی جائے
تو وہ کیاری سوکھ جاتی ہے۔ حمیت کے گیت گانا۔ حمیت حمیت پکارنا اور چیز ہے اور حمیت
کا عملی ثبوت دینا اور چیز۔ اور یہ عملی ثبوت ہی وہ شے ہے۔ جو اس حصہ دنیا میں جو حرّیت کی نعمت
سے محروم ہو۔ ناممکن ہے۔

ہندوستان میں گو آزادی کا شوق عام ہوتا جاتا ہے۔ اور ایک روز افزوں جماعت
اسکی خواہاں ہے۔ تاہم یہ بھی ایک امر واقعہ ہے۔ جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ آزادی کے
مخالف بھی ہم میں بکثرت موجود ہیں۔ جو اسکے نام سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ کچھ بہت عرصہ
نہیں ہوا۔ کہ اخبارات اور رسائل میں بعض ثقہ اور سلامت رو حضرات آزادی کے شوق کے
خلاف مضمون لکھ رہے تھے۔ اور آزادی کے دلدادہ اپنے رنگ کے اخبارات میں انہیں
صلواتیں سنا رہے تھے۔ اور اب بھی یہ مباحثہ وقتاً فوقتاً تازہ ہوتا رہتا ہے۔ مگر اسکی وجہ یہی ہے
کہ دونو فریق اس لفظ کے مفہوم پر متفق ہو کر بحث شروع نہیں کرتے۔ اختلاف کرنے والوں
کے ذہن میں آزادی "مادر پدر آزادی" کے قریب قریب معنی رکھتی ہے۔ اور چونکہ آزادی سینہ

مزاج ہی کبھی کبھی اپنی مشق گھر ہی سے شروع کرتی ہیں - اور باہر نیوں کی زیادتی کی وجہ سے سکوت پر مجبور ہوکر سارا زور گھر کی چاردیواری کے اندر "آزادی" "آزادی" کی پکار پر ڈالتی ہیں - اس لئے پرانے طریقوں اور رسوم کے دلدادہ گھبرا کر زمانے کو کوسنے لگتے ہیں - اور اس صدی کو برا کہتے ہیں - جس نے یہ تاثیر نوجوانوں میں پیدا کر دی - اور نہایت درد کے ساتھ یہ اشعار پڑھتے ہیں ؎

این چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم — آسماں را ہمہ پر فتنہ و شر می بینم

دختراں را ہمہ جنگ است و جدل با مادر — پسراں را ہمہ بدخواہ پدر می بینم

یہ زمانے کے گلے شکوے تو ہمیشہ سے چلے آئے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے - ان کا جھگڑا چکانا تو ہمارا مقصود نہیں - ہمیں تو بحث اس سے ہے - کہ یہ غلط فہمی جو لفظ آزادی سے پیدا ہوئی ہے - اس کا خاتمہ ہو جائے - اور آزادی کی کم از کم ایک صفت ایسی ہو جسکے متعلق متفقہ رائے یہ ہو - کہ حاصل کرنے کے لائق چیز ہے - اور پھر اسکے حصول کے لئے متفقہ کوشش ہو اور یہ وہ حقیقت ہے جسے ہم نے ابھی حریت کے نام سے پکارا ہے - کوئی معقول آدمی اسکی ضرورت سے انکار نہیں کر سکتا - اور قوموں کی تاریخ اس بات پر دلالت کرتی ہے - کہ قوموں اور ملکوں کے بننے اور بگڑنے کا دارومدار اس پر ہے -

یوں تو یورپ کے اکثر حصے اس دولت سے مالامال ہیں - مگر انگلستان اور فرانس کو اس پر خصوصیت سے ناز ہے - نئی دنیا میں ریاستہائے متحدہ کا یہ دعوے ہے - کہ انکی جمہوری حکومت سب سے نمایاں مثال لبرٹی کی ہے اور ادہر ایشیا میں اب جاپان نے لبرٹی کا جھنڈا بلند کیا ہے - فرانس کی حریت نے جس زمانے میں زور پکڑا - اس نے تو ملک میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا - اسی انقلاب میں وہاں قدیم شاہی کی بیخ و بنیاد اکھڑ گئی اور اسکی جگہہ موجودہ ری پبلک یعنی جمہوری حکومت قائم ہوئی - جسکے نشان پر یہ الفاظ

جلی حروف میں لکھے ہیں۔ "لبرٹی۔ اکالٹی فراٹرنٹی" ان تینوں حروف کا ترجمہ ہے۔
"حریت۔ مساوات۔ برادری یعنی ہر فرانسیسی آزاد ہے۔ سب اہل برابر ہیں۔
اور سب اہل بھائی ہیں۔ یہ نشان جس پر فرانس اس وقت نازاں ہے۔ دنیا میں
سب سے پہلے عرب میں اسلام کے آتے ہی بلند ہوا تھا مگر افسوس کہ بعد میں اس کا بہت
تھوڑا حصہ باقی رہا۔ اور اب صرف ایک تاریخی واقعہ کا تذکرہ رکھتا ہے۔ انگلستان کا یہ قول
ہے۔ کہ اسکی سرزمین پر قدم رکھتے ہی غلامی کی بیڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہ قول تو اس زمانے
میں رائج ہوا تھا۔ جب انگلستان نے غلامی اپنی حکومت میں قطعاً ممنوع کر دی تھی۔ اور
پہلے کسی دوسرے ملک سے اگر کسی کا غلام بھاگ کر انگلستان میں پناہ لیتا تھا تو وہ آزاد
سمجھا جاتا تھا۔ اور واپس نہیں دیا جاتا تھا۔ گو اب غلامی اُن پرانے معنوں میں قریب قریب
فسانہ رہ گئی ہے۔ سوائے اسکے کہ کانگو کی ریاست کے یورپین انتظام میں اہل ملک پر
زمانۂ غلامی کے سے ظلم سے یورپ کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہیں۔ لیکن انگلستان کے
متعلق یہ قول اب تک صحیح ہے۔ کیونکہ غلامی کی دوسری صورتیں جو دنیا کے بعض حصوں میں
اب تک انسان کی جان کا وبال بنی ہوئی ہیں۔ اُن کے ستم رسیدے جو انگلستان میں
آ پناہ لیں۔ فوراً اُن حالات سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ یہاں کوئی انہیں یاد نہیں دلاتا۔
کہ وہ مغلوب ہیں۔ ہر شخص اپنے گھر میں بادشاہ ہے۔ در کوچہ و بازار میں میلے تماشے
میں گلگشت باغ میں ریل کی سواری میں کھانے پینے کے کمروں میں اُسکے ساتھ
وہی سلوک ہوتا ہے جو انگلستان کے کسی معزز باشندے کے ساتھ۔ اس سلوک سے
وہ زنجیریں جن سے وہ جکڑا ہوا تھا۔ خودبخود ٹوٹنے لگتی ہیں اور کچھ عرصے اس آب و ہوا
میں جینے کے بعد وہ اپنے دل و دماغ کو آزاد پاتا ہے۔ اور حریت کے خواب دیکھنے لگتا
ہے۔ مگر حریت مہنگے داموں بکتی ہے۔ اس عارضی طور پر اس کا مزا چکھنے کو جب ہزاروں

روپے چاہئیں۔ تو مستقل طور پر اس صحت بخش و مفرح آب و ہوا میں جینے کے لئے تو لہو پانی ایک کرنا ہوگا۔

غرض جب مزاج میں پیدا ہو جائے۔ تو ایک عجیب رنگ لاتی ہے۔ نہ صرف اپنی قیود بھاری ہونے لگتی ہیں۔ بلکہ دوسروں کے جکڑ بند توڑنے کو جی چاہتا ہے۔ انگلستان میں جو تحریکیں وقتاً فوقتاً کارخانوں میں مزدوروں کی نوکری کے گھنٹے کم کرانے کے لئے۔ گھروں میں نوکروں کو اتوار کو آدھی تعطیل دلوا دینے کے لئے۔ مدرسوں کے لڑکے لڑکیوں کو کھلی ہوا میں رہنے کے موقع پیدا کرنے کے واسطے ہوتی رہتی ہیں وہ اس شوق کی مثالیں ہیں۔ ہے تو خفیف سی بات مگر نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ لیڈیاں اور صاحبان جو کتے پالنے کے شوقین ہیں۔ اگر اپنے بڑے بڑے اور تند کتوں کو جو عموماً بے زنجیر رکھنے مشکل ہیں۔ ٹہلانے باہر نکلیں۔ تو اُن کی زنجیر کھول دیتے ہیں۔ ایک کوڑا ہوتا ہے۔ جس سے ایک کنڈا سا لگا ہوتا ہے وہ ہاتھ میں احتیاطاً رکھ لیتے ہیں۔ کہ اگر کتا کچھ شرارت کرنے لگے تو پٹے سے اٹکا کر کوڑے کو زنجیر بنا لیں۔ مگر کتا بھی اپنی آزادی کی قدر کرتا ہے۔ اور اس اعتبار پر ناز کرتا ہوا کہ اسے بازار میں مالک یا مالکہ کے ساتھ ساتھ بے زنجیر چلنے کی اجازت دی گئی ہے۔ بہت احتیاط سے چلتا ہے۔ کہ کہیں کوڑا زنجیر نہ بن جائے۔ اہل امریکا میں یہ شوق اس حد کو پہنچا ہے کہ انہیں انگلستان بھی مقید معلوم ہوتا ہے۔ میں اڈنبرا میں تھا۔ کہ ایک دن اتوار کو ایک بڑی چوراسپہ گاڑی میں جس میں ادہر کے قابل سیر مقامات میں بیس بیس پچیس پچیس سافروں کو لاد کے سیر کرانے لے جاتے ہیں۔ مجھے اتفاق سے تین چار امریکن لیڈیاں مل گئیں۔ جو محض سیاحت کے لئے برطانیہ کی سیر کر رہی تھیں۔ جیسا کہ ہزاروں امریکن کرتے ہیں اپنے بزرگوں کا وطن۔ اپنی تاریخ کا مرکز۔ انگریزی زبان کے بڑے بڑے مصنفوں کا

طر - انہیں برطانیہ سے خاص دلچسپی کیوں نہ ہو - برطانیہ کو دیکھنے یوں آتے ہیں جیسے
کوئی حج یا تبرک کے لئے آئے - اُن لیڈیوں سے گفتگو ہوئی - کہنے لگیں ہمارے ہاں
تاریخی دلچسپی کے ایسے سامان نہیں ہیں - جیسے اس ملک والے کہتے ہیں - لیکن
پھر بھی ہمارا ملک دیکھنے کے قابل ہے اور ہم اُس پر فخر کرتے ہیں - میں نے کہا آپ کا فخر
بجا ہے - یہاں والے اگر تاریخ کی بوسیدہ ہڈیوں پر اترا سکتے ہیں تو آپ کا ملک ایک
تاریخ جاری ہے جو اس وقت تک بن رہی ہے - یہاں والوں کو ناز ہے کہ ان کے بڑوں
نے یہ کچھ کیا تھا - آپ اب وہ باتیں کر رہے ہیں - جن کو آئندہ نسلیں تعجب سے دیکھیں
گی اور جن سے آئندہ تاریخ بنے گی - امریکہ نے تھوڑے سے زمانے میں جو کچھ کیا ہے
وہ اسی کا حصہ تھا " اپنے ملک کی تعریف کسے نہیں بھاتی - میرے اس خیال کے
اظہار سے وہ بہت خوش ہوئیں - اور باقی راستے میں جابجا اپنے خیالات سے مستفید
کرتی گئیں - ایک خوبصورت پُرانا مکان راستے میں پڑا جو کسی امیر کا ملک تھا - اور اسکے گرد
ایک آراستہ باغ تھا اور باغ کے گرد ایک چاردیواری تھی جسکی دیواریں خاصی بلند تھیں - کہنے لگیں "مکان بہت عمدہ باغ
بہت اچھا مگر دیواریں بہت خراب" میں نے کہا - کہ پُرانے زمانے کی یادگاریں "، کہنے لگیں "ہمیں ان سے
وحشت ہے - ہم کھلی زندگی بسر کرتے ہیں - اب تو مکان کے گرد جنگلے تک کی رسم مٹتی جاتی ہے -
آگے تھوڑی دور چل کر چند پھٹے کپڑوں والے لڑکے نظر آئے جو گاڑی کے ساتھ ساتھ
پیسہ مانگنے کے لئے دوڑتے تھے - برطانیہ کا قانون کسی کو ایسا کرنے کی اجازت تو
نہیں دیتا - لیکن بیرونجات میں کہیں نہ کہیں افلاس لوگوں کو مجبور کر ہی دیتا ہے اور مثالیں
چونکہ کہیں کہیں ملتی ہیں - اس لئے قانون بھی تعرض کم کرتا ہے - اُن لڑکوں کو دیکھ کر
ایک امریکن لیڈی بولی "یہاں قدم قدم پر اس بات کا ثبوت ملتا ہے - کہ یہاں حکومت
لوگوں کی اپنی نہیں - نہ صرف ان غریب لڑکوں میں بلکہ عام طور پر غریب لوگوں کے چلنے

پھر نے بات چیت ہر چیز میں یہ نظر آتا ہے کہ یہ ملک شاہی جز حکومت کے ماتحت ہے۔
میں یہ سن کر متعجب ہوا۔ اور میں نے اُن سے کہا کہ آپ کی نگاہ میں اس ملک کو لبرٹی نہیں
ملتی۔ اور ہم اگر ان کی حالت میں ہوں تو گویا بالکل بہشت میں پہونچ جائیں۔ اُسنے کہا۔
خدا ہو۔ تو کیا آپ ان سے بھی بدتر حالت میں ہیں۔ میرا خیال تھا۔ کہ انگریزی حکومت
سب جگہ یکساں ہے۔ کم از کم اکثر یہی سنتے ہیں۔ کہ انگلستان نے ہندوستان کو
تمام وہ فوائد اور حقوق جو خود اسے حاصل ہیں دے رکھے ہیں"۔ میں نے کہا۔ "جب
آپ سکاٹلنڈ کے باشندوں کی صورت سے اُن کی حالت کا اندازہ کر سکتی ہیں۔ تو

میری صورت میری حالت کا پتا دیتی ہے

اس کا بھی اندازہ کر لیجئے۔ مگر صحیح اندازہ جب ہو سکتا ہے۔ جب آپ مجھے ہندوستان
میں دیکھیں۔

ان امریکا والوں کے خیالات سے تو ہمارے ہاں کیا انگلستان میں بھی کئی لوگ گھبراتے
ہیں اور کہتے ہیں کہ اتنی آزادی ہمیں مطلق نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جتنی مطلوب اور
ضروری ہے۔ اتنی بھی ملے تو کیونکر ملے۔ حریت کا خیال دلوں میں پیدا ہو تو کیونکر ہو۔
ہندوستان میں کئی دل سوختہ اس وقت ایسے ہیں کہ وہ اپنے ملک سے قطعی مایوس
ہیں۔ اُن میں ایک میرے دوست ہیں۔ جو ان دنوں واپس وطن گئے ہوئے ہیں۔
یہاں تھے تو اُن سے بحث رہتی تھی اور وہاں ہیں تو خطوں میں وہی بحث چلتی رہتی ہے۔
اتفاق سے وہ زن و فرزند و علائق سے اب تک خالی ہیں۔ اس لئے وہ اکثر خواب
لیتے ہیں۔ کہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کدھر جائے گا۔ یہ تو
فرمایئے۔ کہیں آپ کی قدر بھی ہے۔ ذرا جنوبی افریقہ میں آسٹریلیا میں تشریف لے جا کر
تو دیکھئے۔ حریت کے تمغے کے بغیر کون پوچھتا ہے۔ آپ کے بھائیوں کی جو تواضع ہو رہی ہے

وہ سارے زمانے کو معلوم ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ایران یا روم کو جا بسائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کی تحقیر وہاں بھی رفاقت کرے گی۔ جب تک اپنے ملک کی عزت نہ بناؤ گے باہر کہیں عزت نہ ہوگی۔ انہوں نے مجھے خط میں لکھا "ہندوستان جہنم ہے"۔ میں نے جواب عرض کیا کہ "اسے جنت بنائیے"۔ اور مجھ سے پوچھئے تو میں اسے باہمہ نقائص آب و ہوا۔ اور باہمہ مصائب ارضی و سماوی جن کا کچھ [illegible] سکتے ہے۔ وہ نشاط بنی ہوا ہے جنت سمجھتا ہوں۔ آپ معلوم نہیں وہ اپنے ذاتی علائق کی محبت سے یا قدرتی الفت وطن بہرحال ہندوستان جو کچھ ہے ہمارا ہے۔ اور ہم اُسکے ہیں۔ جو عزت ہم اُس سے جدا ہو کر حاصل کرنا چاہیں۔ جو آرام ہم اُس سے بھاگ کر ڈھونڈیں۔ وہ اول تو ملنے کا نہیں۔ اور اگر ملا تو اُس کا لطف نہیں آسکے گا۔ عزت وہی جو وطن کی عزت کے ساتھ ہو۔ اور وطن کی عزت اہلِ وطن میں حریت کے پیدا ہونے پر منحصر ہے اور وہ جب ہی پیدا ہوگی۔ کہ ہر ہمدردِ وطن اُسے اپنی عزت اپنی آبرو اپنے نفع سے بڑھ کر عزیز رکھے۔ اُس صورت میں ہندوستان "فری انگلینڈ" (آزاد انگلستان) کا ایک معزز حصہ اور سلطنت برطانیہ کا ایک رکن رکین ہوگا اور اسکے بغیر اسکے دامان دولت کے وابستگان میں باوجود بہترین ہونے کے کمترین ہے

عبدالقادر

آگاہ ہوئے ہیں جو میرے زخم جگر سے	اب آنکھ چُراتے ہیں وہ اپنی بھی نظر سے
دم لیکے چلا جاؤں گا میخانہ ہے نزدیک	اے شیخ بہت دور ہے مسجد مرے گھر سے
میری نہ بجھی پیاس تو جھنجھلا کے سرِ بزم	ساقی نے سبو کھینچ کے مارا مرے سر سے
نقشِ قدمِ یار کی مٹی نہ ہو برباد	تر رکھتے ہیں اسواسطے ہم دیدۂ تر سے
کعبے سے نکلکر رہے بت دل میں کیسے	اللہ کے گھر میں گئے اللہ کے گھر سے
سے داغ مصیبت ہے حیاتِ ابدی بھی	اس رنج کو پوچھے کوئی الیاس و خضر سے (شیخ [illegible])

کثرتِ ازدواج

کارخانۂ قدرت کے گورکھ دھندوں پر نظر ڈالنے سے چشمِ دنیا بعض ایسے رنگ برنگ کے جلوے دیکھتی ہے کہ عقلِ سلیم لاکھ سر پٹکا کرے یہ اسرار نہاں کبھی سمجھ میں نہیں آتے!! بڑے بڑے حکما جو شعاعِ بصر تک کی تہ کو پہونچ گئے اس قدرتی چکر کے گرد عمر بھر گھومے مگر کچھ بھی پتہ نہ لگا اور یوں ہی ٹکریں مارتے مارتے نذرِ قضا ہو گئے۔

یہ باغیچۂ دنیا انواع و اقسام کی گلکاریوں سے لہلہا رہا ہے اور جہاں تک نظر پہنچتی ہے ہر ذرہ اور صنعت بذرہ ایک صانعِ حقیقی کا پتہ دے رہی ہے! کہیں حسن و عشق کی رنگینیاں گدگدی تانیں لے رہی ہیں اور کہیں رنج و غم کے ناگ پھن اٹھا اٹھا کر ڈس رہے ہیں!!!

اس نظامِ عالم کے ایک گوشہ میں حیات و بقاءِ حیات کا بھی ڈھیر لگ رہا ہے جس کو دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے۔

"جسکے کرشمے یہ کچھ ہیں وہ خود کیا کچھ ہوگا"

طبقۂ اعلیٰ کے جدِ اعظم یعنی حیوان کے طرزِ معاشرت پر ریویو کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن اسباب کے علاوہ جو باعتبارِ طبعیات حیاتِ حیوانی کے واسطے ضروری ہیں فطرت نے ایک مادہ ہر ذی روح کی طبیعت میں مامتا کا بھی ودیعت کیا ہے اور یہ وہ جوش ہے جس پر ہر آدمی اور ہر جانور اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہے!!!

(بقاءِ حیات) (جانور) کبوتروں کا بچوں کو بھراتا بندریا کا مردہ بچے تک کو کلیجے سے لگائے رکھنا چڑیا کا نہایت محنت اُٹھا کر ایک چاول چگنا اور گھونسلے میں لیجا کر بچے کے پیٹ

میں پہونچانا! یہ نیچرل طلسمات ہو قواعد و انتظامات ایسے ضابطہ و نافذ ہیں کہ جب تک نقطۂ عالم میں ذرۂ حیات باقی ہے ان میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

بالعموماً زلفت اشرف المخلوقات و ارذل المخلوقات میں ذہنی قویٰ معدوم ہو رہے ہے تجربہ شاہد ہے کہ جس محبت سے سکندر کی ماں اپنے بچہ کو دودھ پلا رہی ہے اور جوش محبت میں بھینچ رہی ہے اُسی طرح ایک کتیا بھی پھون کر کے گھاسے پڑی ہے بچے دودھ پی رہے ہیں اور چاٹ رہی ہے!!!

(انسان) چھوٹے چھوٹے ماں باپ جو ابھی خود بچے ہیں کس سرگرمی سے بچے کے واسطے اسباب آسائش فراہم کرنے میں ساعی ہیں! تیرہ چودہ برس کی لڑکی گھنٹوں اور پہروں دن دن بھر اور رات رات بھر بچے کو کندھے سے لگائے سلتی ہے! پندرہ سولہ برس کا لڑکا دو بجے رات کے ڈاکٹر کے ہاں سے دوا لانے کو دوڑا جاتا ہے اور دروازہ میں گھستے ہی پوچھتا ہے! کچھ کمی ہوئی؟

(حیات) (جانور) سرخاب اور سارس کی بابت سنا ہے کہ اگر کسی وجہ سے جوڑے میں مفارقت ہو جائے تو پھر نر کو غیر مادہ اور مادہ کو غیر نر سے انس نہیں ہوتا! خدا معلوم یہ مقولہ کہاں تک درست ہے مگر اتنا تو آنکھ سے دیکھا ہے کہ نر سرخاب کے مرجانے پر آفت زدہ مادہ نے گھنٹوں وہیں چکر لگائے ہیں جہاں نر مرا پڑا تھا!!! بئے کا گھونسلا مشاہدۂ عینی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھولے بھالے جانور کس طرح اپنی زندگی بسر کرتے ہیں اور کس سرگرمی سے نوزائیدہ مہمان کا استقبال کرتے ہیں!! کبوتروں کا انڈے دینے سے پہلے تنکے فراہم کرنا فاختہ کا مئی جون کے مہینوں میں دوپہر کے وقت مکان کی تلاش میں پھرنا! چڑے چڑیا کا اخلاص! گلہری کا گودڑ! یہ تمام مشاہدات ان جانوروں کے تعلقات باہمی اور اُن کے انس و محبت کی وہ تصویریں ہیں جو بشب

درحیات و بقاء حیات کا سبق دے رہے ہیں!

(انسان) دو اجنبی شخص جنہوں نے پہلے کبھی ایک دوسرے کی شکل بھی نہ دیکھی تھی صرف میاں بیوی ہوجانے سے ایسے ایک دوسرے کے ہمدرد و خیرخواہ ہوگئے کہ اب اس دنیا میں شاید کوئی تیسرا ایسا خیرخواہ میسر نہ ہو!! کیسی جانفشانی اور محنت سے دونوں مل کر زندگی کو پُربہار بنانے کی کوشش کر رہے ہیں! میاں محنت سے سخت مصیبت اٹھا کر بیوی بچوں کے واسطے رزق فراہم کرتا ہے اور بیوی مشکل سے مشکل کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتی ہے! اگر انکی دم صرف فریقین کا وہ خاص تعلق ہے جو اس سے پہلے نہ تھا تو تجربہ واضح طور پر بتا رہا ہے کہ یہی تعلق ناجائز ہونے کی حالت میں ہرگز وہ نتیجہ نہیں پیدا کرتا جو تعلق جائز نے کیا! آخر یہ کیوں؟ اسوجہ سے کہ خاوند یہ یقین رکھتا ہے کہ بیوی کی آئندہ تمام خوشیوں کا انحصار مجھ پر ہے اور بیوی اچھی طرح سمجھتی ہے کہ میاں کی تمام زندگی کا دار و مدار مجھ پر!!!

ہم دونوں سلوک و محبت سے زندگی بسر کریں جو کچھ ہو اُس پر قناعت کریں آئندہ نسلیں بڑہیں ہمارا نام چلے اور ہم بچوں کو راحت پہونچانے میں کوتاہی نہ کریں -

(نتیجہ) میاں بیوی کی آئندہ زندگی پر نظر ڈال لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران عمر میں مرد پر ایسا وقت بھی آئے گا کہ عورت اُسکی ایک نہایت زبردست خواہش کے پورا کرنے سے مجبور ہو!

اسی وجہ پر (جس میں کثرت اولاد بھی ملحوظ ہے) کثرت ازدواج کا افشا ہے جو عدل حقیقی پر مشروط ہے!!!

اتلاف عدل حقیقی ذیل کے خط سے معلوم ہوگا جو ایک تحصیلدار کی بیاہتا بی بی اپنے خاوند کو لکھ رہی ہے مبالغہ فی الاصل سہی! تبدیلی الفاظ سہی! سب کچھ

سہی! مگر اس کا کیا جواب ہے!

تا نبا شد چیزکے مردم نہ گویند چیزہا؟ (خوعبدالرشید)

اللہ اللہ! ایک وہ زمانہ تھا کہ انتیسویں دن ڈھائی سو روپیہ ہاتھ میں آتے تھے ایک یہ وقت ہے کہ آج پانچ مہینے بعد احمد کی ساس پچاس روپیہ سے کر آئیں! عیش و آرام تو تمام ہو ہی چکا تھا خدا کا شکر ہے کہ تمھاری زندگی ہی میں فاقوں کی بھی نوبت پہونچ گئی! چار بچے ایک مہری[1] دو بکریاں ایک بیگم[2] اٹھ دم۔ دس روپیہ مہینہ میں کس کس کیا پڑا! بچا کھچا پردیس کی بات شہر کا خرچ کال کا زور، نہ بھینس کی لات نہ عزیزوں کا ساتھ جو بھی کروں یا بھیک مانگوں! میں بچاری عورت ذات پیسوں پکاؤں پالوں کماؤں کیا کروں کیا نہ کروں بے بل پیٹ بھر کب تک جیے گا اور یہ پہاڑ سی عمر کس کے کاٹے کٹے گی! یہ مانو یہ بچھیا ناک پان زردہ عطر تیل سب چھوٹا ایک روکھی روٹی رہ گئی تھی سو اسے بھی لالے پڑ گئے! خدا سے ڈرو اور مرنے کو مرنا سمجھو گھوڑوں کو ڈھائی ڈھائی تین تین سیر دانہ دو اور بچوں کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہو! تمھارے پاس بوریوں کی بوریاں بھری ہوں اور بچے ایک ایک مٹھی چنوں کو ترسیں۔

ممانی جان[3] (اللہ اُن کو جنت نصیب کرے) آج کو زندہ ہوتیں تو تمھاری مجال تھی کہ تم سوکن لاتے اور میری ہی چھاتی پر مونگ دلواتے! ایک کا یہ سہاگ کہ روپیہ پیسہ عیش عشرت کپڑا لتہ جتنا پاتا وہ وہ سب موجود دوسری کو یہ آگ لگی کہ کس کا چین اور کہاں کا آرام کیسا گہنا اور کس کا کپڑا دو دو اور تین تین وقت کے کڑاکے! ایک کے صندوقچہ میں بھری ہوئی عطر کی شیشیاں ہوں اور دوسرے کے چراغ میں جلانے کا تیل بھی نہ ہو! غضب خدا کا برس کا برس دن تہوار کا زور اور تحصیلدار کی اولاد ایسی ناشاد و نامراد کہ دھی

[1] چھوکری ۱۲ [2] دودا ۱۲ [3] ساس ۱۲

کی گنگنا بھی میسر نہ ہوں! چھ برس کی بچی اچھی تقدیر لیکر آئی نہ دھیلے کی مہندی نہ دمڑی کا رنگ نہ ڈھنگ کا چیتھڑا نہ پاؤں میں لیترا! تم تو ایسے پلٹے گویا جان پہچان ہی نہ تھی خدا کی شان ہے یا وہ آن بان کہ ناک پر مکھی نہ بیٹھے یا یہ بے غیرتی کہ کان پر جوں بھی نہ چلے

اودھر حمیدہ ماشاء اللہ چار برس میں کہیں کی کہیں ہو پہنچ گئی! اودھر سعیدہ برابر سے اٹھتی چلی آ رہی ہے یہ تیرہ میرے سر کائے تو سر کٹتے نہیں جیدہری ہر فری آنکھ بند کرنے کی دیر ہے کیسے برس اور مہینے لڑکی کی بیل اور گدھی کی بیل گھنٹوں میں بڑھتی ہے یہ چار پہاڑ اور میں اکیلی خدا ہی بیڑا پار کرے تو ہو۔

جیسی میری ہستی پلید ہوئی خدا نہ کرے کہ دشمن کی بھی ہو! جاڑوں کی پہاڑ سی راتیں آنکھوں میں کٹ جاتی ہیں چین اور آرام تو الگ رہا پلک سے پلک جھپکانی حرام ہے پلنگ پر لیٹی اور جگر بند ہے جدھر دیکھتی ہوں اللہ ہی اللہ نظر آتا ہے بنگلے میں آٹا نہیں انگیٹھی میں کپڑا نہیں پاؤں میں جوتی نہیں سر پر دوپٹہ نہیں! خانہ داری کی مصیبت تو خدا ہی کا ڈر ہر وقت کی کوفت آئے دن کی بیماری ماری کا تقاضا نا کبیرا کی فضیحتی خدا کی قسم جان اجیرن ہو گئی! سوت نے مجھے موت کا مزہ چکھا ریا اب تو یہ دعا ہے کہ خدا مجھکو اٹھا لے تم بیٹھے عیش کرنا نہ میں ہوں گی نہ کھٹکوں گی! بیس بائیس برس دنیا کی بہار دیکھ لی خدا گواہ ہے خیر! اب زندگی سے بیزار ہوں!!! تمنے اپنی زندگی سنواری اور میری بربادی اپنا گھر بنایا اور میرا اُجاڑا! خوش رہو آباد رہو۔

یہ چلّے کا جاڑا کہ دانت سے دانت بجیں اور گھر بھر میں کسی کے بدن پر نئی روئی کا کپڑا نہ ہو! جو شخص ماشاء اللہ تیس سو روپیہ مہینہ کمائے اُسکے بچے لحاف کو ترسیں ذرا انصاف کرو دونو لڑکیاں ایک پرانے لحاف میں سردی بسر کریں کیوں ایسی بیدردی پر کمر باندھی ہے۔ صنوبر[1] کی مامائیں تک بیمک کی رضائیاں اوڑھیں اور حمیدہ سعیدہ سوں سوں کرتی پھریں!

[1] دوسری بیوی ۱۲

گنہگار ہوں تو میں ہوں خطاوار ہوں تو میں ہوں بُری ہوں تو میں ہوں بدصورت ہوں تو میں کٹر ہوں تو میں پھوہڑ ہوں تو میں بیزار ہو تو مجھ سے ہو بچے کمائی کے حقدار کیوں نہ رہے !!!
کیا خدا کی شان ہے حمیدہ[1] بھر بھر پٹیاں دودھ کی لٹا ہے جا میدہ و پیے کے کھلونے لائے اور تو ڑے اور سعیدہ کو او بالی دال بھی میسر نہ ہو۔

جن ہاتھوں سے سیکڑوں ہزاروں روپے اُٹھائے آج وہ ہاتھ ایک ایک پیسہ کو محتاج ہیں تمھاری کمائی میں ہمارا اتنا حق نہ رہا کہ پسائی کا پیسہ تو میسر ہوتا! جس چکی کے ذرے بخاریں میں نے چار چار برس اُسنے آج وہ دو آنوں کے واسطے صبح سے شام تک آٹھوں کا تیل نکالتی ہے جب ایک بیل پوری ہوتی ہے! مجھکو کیا معلوم تھا کہ میرے معصوم یہ دن دیکھیں گے اور قسمت یہ مصیبت دکھائیگی بائیس برس کی پکائی کھاکر آج چار بجے سے چکی کے آگے بیٹھنا پڑتا ہے! ہائے تقدیر! بھرے گھر سے نکل کر فقیر ہوئی!

جو حالت میری ہوئی الٰہی کسی کی یہ گت نہ ہو فقیروں سے بدتر گھر مُردوں کی سی صورتیں دالان میں اوپلے سائبان میں مٹکے بچہ ننگا چارپائی جھلنگا چبوترے پہ منوں خاک صحن میں سیروں راکھ نہ دری نہ رضائی نہ بچھونا نہ چارپائی برتن ہیں وہ لوہا تکیے ہیں دوچار ! ساری بہار چار پیسہ کی ہے وہی میں ہوں کہ لگن کی میم کا بیگم بیگم کہتے مُنہ خشک ہوتا تھا یا آج سڑی سی بھنگن جو جو مُنہ میں آتا ہے سُنا جاتی ہے !

"ہمیشہ رہے نام اللہ کا"

لاکھہ سو رہا ہو اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا حمیدہ کو دیکھ دیکھ کر روح فنا ہوئی جاتی ہے فاقوں کی ماری ماری مصیبت زدہ دکھیاری دبی دبائی کا وہ ڈیل ڈول نکلا ہے کہ الٰہی توبہ! اسکا گھر بسانا میرا کام ہے؟ ایسی تقدیر پھوٹی کہ دادا دادی نانا نانی چچا چچی ماموں ممانی بڑے اور چھوٹے مرد اور عورت ایک سرے سے سب ہی کو موت آگئی! مفلس خوشحال مالدار کنگال

کوئی بھی نہ رہا ددھیال اور ننہال دونوں ہی کا صفایا ہو گیا اچھے اور بُرے امیر اور غریب حمیدہ
نصیب سے پہلے ہی چل بسے ہمارے کا سارا خاندان مصیبت زدہ بچّی کے آنکھوں کے
سامنے ایک ایک کر کے رخصت ہو گیا پچاس آدمی کے کنبہ میں ایک چھوٹی دادی اور ایک
خالہ فاطمہ دو دم رہ گئے تھے رجب میں اُن کا بھی خاتمہ ہو گیا!!!

گھر کی ایسی خاک اُڑ رہی ہے کہ الٰہی تیری پناہ میرے فقیروں کے گھر میں بھی ڈھنگ
کا بستر ہو گا مگر مجھکو وہ بھی نصیب نہیں! اس گھر سے تو خفیادا کی بیٹی کو دو آنہ کا بیدا بھی
لے جائے تو اُسکا احسان ہے! آخر حمیدہ کا نکاح کرنا یا نہ کرنا؟ امیری نہ ہونے ہی! گہنا نہ ہو
بلا سے۔ عیش نہ ہو خیر! نوکر ہیگا۔ اچھا بُرا خوش مزاج اکھلکھڑ غریب امیر جیسا بھی ہو حمیدہ کی
تقدیر مگر کسی طرح اسکے دو بول ہو جائیں۔

تمھاری امیری تمکو مبارک! میں اپنی فقیری میں بھی خوش ہوں! تمکو خدا نے نئی دولت
دی نئی بیوی دی مال دیا جائداد دی ماما نوکر چاکر گھوڑا گاڑی تم جتنا اوچھلو سب تھوڑا! فقیرنی
بھیک منگی جتنا اترائے سب ٹھیک سیر کی ہنڈیا میں سوا سیر پڑا اوبل پڑی! اسدا کے فاقے
ہمیشہ ننگی بھیک عمر بھر کی مزدوری رات دن کیں صدریاں خیرات پہ گذر زکوٰۃ پہ گھر صدقہ پر عمر
لیتڑا جوتی چیتھڑا موزہ آگیا تو روزی نہیں تو روزہ پہنتی رہی لیریاں سیتی رہی ٹاٹ جنم نہ دیکھا
بوریا سپنے آئی کھاٹ! گھر بھر فقیر! کنبہ بھر محتاج آج بی صنوبر کو یہ دن لگے ہاتھوں میں ٹھوس
کڑے ماتھے پہ جھومر گھر میں مامائیں ڈیوڑھی پہ نوکر آنکھیں پھٹ گئیں!!!

مجھکو نہ فرصت تھی نہ ضرورت تھی نہ جب تھی نہ اب ہے نہ کیا نہ کرسکتی ہوں نہ کروں گی
کہ گھر میں سیکڑوں مہمان اپنے اور پرائے جان پہچان اور انجان اور میٹھی گھنٹوں میاں کے
پیر دباؤں اُسکو تو دل میں گھر کرنا تھا ایسی گھسی کہ سب سے بڑا میاں کو کھونٹے سے باندھ لیا
مجھے کیا خبر تھی کہ یہ سوکن میرا چھین نیکا فکر کر رہی ہے اور یہ رذالی ایک دن گھر والی ہو جائیگی!!!

مجھکو اللہ رکھے اپنے بچوں ہی سے اتنی فرصت نہ تھی کہ تمہاری خدمت کرتی ہاتھ جوڑ کر آتی تو گھٹنوں پاؤں دباتی! لانیوالی مرگئیں مہینوں آئی ہیں اور دنوں منتیں کی ہیں۔ وہ ہوتیں تو رونا ہی کیا تھا اپنا پیٹ کاٹتیں اور بچوں کا پیٹ پالتیں لانے کی لات تھی۔ کنبے کا نباہ کرتیں کبھی نہیں باجرا اور باجرا نہیں بیچ میں سالن نہیں شوربا اور شوربا نہیں دال تازی باسی اچھی بری صبح کو نہیں شام کو اور شام کو نہیں رات کو چوری چھپے بھیک مانگتیں اور ان بچوں کے پیٹ میں ڈالتیں

لاکھ خاک میں مل گئی مگر سارا شہر جانتا ہے کہ پانچ ہزار کا جہیز میکے سے نکلی ہوں تمام بازار کہہ رہا تھا کہ احمد یار کا نصیب کھل گیا! تمنے بڑی دیر بھی کی کہ سب لٹا دیا! میرے برتن تمنے کوڑیوں کے مول بیچ ڈالے ڈیڑھ ڈیڑھ من کے لگن دس دس بارہ روپیہ میں کھو دئیے اور چپکی بیٹھی دیکھا کی! ابکا ہی میں بڑی رفیق تھی خصیمداری میں بڑی دشمن ہوگئی! میرا تین ہزار روپے کا زیور سب مول بیچ میں برابر کیا اگر آج کو وہی میرے پاس ہوتا تو خدا کی قسم مرجاتی اور تمہارے آگے ہاتھ نہ پھیلاتی! سات سو روپیہ کے جھالے ڈیڑھ سو میں کالے کی نانی لے گئیں اور میں نے اف نہ کی!! اماجان اللہ بخشے کیسی کیسی بگڑیں اور سمجھایا کہ دیکھو مرد کا اعتبار نہیں مگر میں نے سب تم پر سے نثار کر دیا اور یہی کہا اماجان زیور کسی کی ذات نہیں رب جسے کہ سنگھار ہوگے کا اور دیا جب اللہ دے گا اور بن جائے گا!! اللہ غنی ہم جان وہاں سے نثار رہے اسکا بدلہ یہ ملا کہ تم ہم سے ایسے بیزار ہوئے کہ صورت تک دیکھنے کے روادار نہیں!!

کہانتک جھینکنا روؤں اور کب تک جھونا چھوڑوں خدا گواہ ہے مرجاتی اور خط نہ لکھتی نعیم کے دو خط لاہور سے آئے یہ بھیجتی ہوں ذرا غور سے پڑھنا!! اللہ اللہ میرا لال میری زندگی میں تمکو وبال ہوگیا اس نے لکھا ہے چار دفعہ اباجان کو چالیس روپیہ کے واسطے لکھ چکا ہوں نہ روپے ہیں نہ جواب! اگر تمہارے پاس اسکی تقدیر کا نہیں ہے تو

تھمد و کہ نام کٹوا لے۔

نعیم کے خط اور حمیدہ کی مجبوری نے اتنا کچھ لکھوا دیا یہ نہ سمجھنا کہ بوی بھیک مانگ رہی ہے شریفوں کی بیٹیاں فاقے کرتی ہیں اور ماں باپ کی لاج رکھتی ہیں الحمد عزت آبرو ستے اُٹھا لے سب کچھ بھر پایا!! اب کچھ کیا چھیڑے گا اور میں بیچاری کس برتے پر بیان کروں کی وہ دل ہی نہ رہا ایک پھپولا ہے کہ ذرا ٹھیس لگی اور بہہ نکلا۔

وہ چمن ہی مٹ گیا جسمیں بہار آنے کو تھی

محمد عبد الراشد

کلام اکبر

چالیس سال سے ہے نئی روشنی کا دور — کیونکر اسے کہوں کہ سراسر فضول ہے
ادنےٰ ایک عرض کروں گا۔ دبی زباں — گو خوشنما بہت ہے۔ مگر بے اصول ہے

اس عہد میں یہی ہے بس داخل نکوئی — مذہب پہ نکتہ چینی۔ ملت کی عیب جوئی
فکرِ اجل نہیں ہے۔ شوقِ عمل نہیں ہے — ناصح بنے ہیں اکثر عامل نہیں ہے کوئی

مقابل کفر کے تھی وہ نمود اسلام کی اکبر — مگر اب انقلاب چرخ سے باقی کہاں کافر
نصاریٰ قبلہ مقصود ہیں ہندو برادر ہیں — زمینِ شعر ہی میں رہ گئی زلفِ بتاں کافر

یہ زینتِ دنیا ہے کہ مٹی پہ ہے مٹی — بچوں کے سوا کون ہوا اسکا متمنی
گوشِ شنوا ہو تو سنو اُسکے ترانے — اس بزم میں اکبر سا نہیں کوئی مغنی

باقی ہیں قومیں تجارت سے عروج — بس یہی اسکے لئے معراج ہے
ہے تجارت واقعی اک سلطنت — زور یوروپ کو اسی کا آج ہے
لفظِ تاجر خود ہے مانے اکبر ثبوت — دیکھ لو تاجر کے سر پر تاج ہے

ہماری زبان کا لٹریچر (یعنی علم ادب)

(۱)

ہماری زبان میں انگریزی لفظ لٹریچر کا ترجمہ علم ادب کیا جاتا ہے۔ میں لٹریچر اور علم ادب کے معانی لکھتا ہوں جب سے پڑھنے والوں کو معلوم ہو جائے گا کہ کہاں تک یہ ترجمہ ٹھیک ہوا

عربی زبان میں ادب کے معنی ہر چیز کی حد نگاہ رکھنے کے ہیں اور علم ادب عبارت اس علم سے ہے جو کلام میں خلل سے نگاہ رکھے اسکی بارہ قسمیں ہیں اور آٹھ اصول جنکی تفصیل یہ ہے۔

(۱) علم لغت (۲) علم صرف (۳) علم اشتقاق (۴) علم نحو (۵) علم معانی (۶) علم بیان (۷) علم عروض (۸) علم قافیہ اور چار فروع ہیں (۱) علم رسم الخط (۲) علم قرض الشعر جسمیں اشعار کے درمیان یہ تمیز کی جائے کہ وہ عیوب سے سالم یا غیر سالم ہیں (۳) علم انشاء نثر خطیب و رسائل (۴) علم محاضرات یعنی تاریخ۔

انگریزی زبان میں لٹریچر کے معنی یہ ہیں کہ تصورات کے معنی علم کی اشاعت کے لئے اصلی واقعات و مستقل خیالات و قلبی احساس تحریکات و انفعال نفسانی و کل نتائج علمیہ بوسیلہ کتب یا اور وسائل سے خلائق کے دلوں اور دماغوں تک پہنچائے جائیں یا یہ کہ کل تصنیفات یا کسی خاص فرع علمی کی تصنیفات جسمیں فصاحت بیان و بلاغت زبان ہوں جیسے کہ اشعار قصص۔ تواریخ۔ تذکرے۔ جواب مضمون (ایسے) ہیں۔ یہ سب ان سائنٹفک کتابوں اور تصنیفات سے جداگانہ ہوں جسمیں سائنس یعنی یقینی اور قطعی محقق علم تحریر ہوتا ہے۔

لٹریچر اور سائنس آپس میں متضاد سمجھے جاتے ہیں گو لٹریچر خود الفاظ کا سائنس ہے۔ علم ادب کی تعریف یہ بھی کی جاتی ہے کہ وہ تقریر کو لکھ کر حیات دوام دیدیتا ہے اب ان معانی کو پڑھنے والے

رجمہ جائیں گے کہ علم ادب اور لٹریچر میں کونسی باتیں ملتی جلتی ہیں۔ میں نے جو علم ادب کے
ع و فروع عربی زبان کے موافق لکھے ہیں ان کا بیان مختصر سا آخر میں کر دوں گا اول لٹریچر کے
ن کے موافق اپنے مضمون کو لکھوں گا مگر اسکا ترجمہ علم ادب کروں گا۔

ہمارے لٹریچر یعنی علم ادب کی زبان

ہماری زبان کا لٹریچر یعنی علم ادب اس زبان میں ہے۔ جسکے بولنے والے انڈیا میں
ن کثرت سے ہیں کہ ہندوستان کی کسی اور مروجہ زبان کے نہیں اسکے تمالی باشندے
جسمیں ہم کلام ہو سکتے ہیں اور ایک دوسرے کی بات چیت کو سمجھ اور سمجھا سکتے ہیں گو لب ولہجہ
الفاظ کی صورت کو ایسا بدل دیتا ہے کہ وہ کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ جاہلوں اور گنواروں کے
منہ میں الفاظ انکی نزع کی حالت میں آجاتے ہیں مگر نہیں مر جاتے جان انکی باقی رہتی ہے۔

ہمارے لٹریچر کی زبان کے نام

مسلمان اس لٹریچر کی زبان کو اُردو زبان اور ہندو ہندی بھاشا کہتے ہیں گورنمنٹ نے
ان دونو ناموں کی جگہ اسکا نام ہندوستانی زبان رکھا ہے جسکا اطلاق دونو پر یکساں ہوتا ہے
ہماری زبان کے ناموں کا مختلف ہونا ایسا ہے جیسے ایک آدمی کے کئی نام ہوتے ہیں
یا عورتوں کا نام میکے میں کچھ ہوتا ہے اور سسرال میں کچھ۔ جیسے کہ کوئی شخص مختلف ناموں
کے ہونے سے اپنی ذات صفات سے غیر نہیں ہو جاتا ایسے ہی ہماری زبان ناموں کے مختلف
ہونے سے ذات صفات میں غیر نہیں ہو جاتی وہ اپنی ذات سے ایک ہی ہوتی ہے۔

جن خطوں میں ہماری زبان لکھی جاتی ہے

ہماری زبان تین خطوں میں لکھی جاتی ہے (۱) فارسی خط میں اکثر (۲) دیوناگری خط میں اکثر
(۳) رومن کیریکٹرز یعنی انگریزی حرفوں میں کمتر جب فارسی خط میں ہماری زبان تحریر ہوتی ہے
تو اسکو اُردو زبان کہتے ہیں اسمیں فارسی عربی الفاظ جنکی تعداد ہندی بھاشا کے الفاظ سے اکثر

کم ہوتی ہے استعمال کئے جاتے ہیں یہ اس خط کا اثر زبان پر ہوتا ہے اور جب ہماری زبان دیوناگری خط میں لکھی جاتی ہے تو اس میں سنسکرت اور ٹھیٹھ ہندی بھاشا کے الفاظ زیادہ اور فارسی عربی کے الفاظ بہت کم مستعمل ہوتے ہیں یہ اس خط کا اثر زبان پر ہوتا ہے ان دونوں خطوں کا اثر نثر میں اتنا الفاظ پر نہیں ہوتا جتنا نظم میں ہوتا ہے نثر میں تو بہت الفاظ مشترک رہتے ہیں مگر نظم میں بہت کم مشترک ہوتے ہیں۔ اردو کے شعرا کو کبھی دوہوں اور چوپائیوں سے ملا کر دیکھو لیکن ان دونوں نقصوں کے افتراق کا حاصل ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص اسی وقت تو انگریزی لباس بالکل پہن لے اور دوسرے وقت میں ہندوستانی لباس پہنے۔ اس تبدیل لباس سے اس شخص کے صفات میں فرق نہیں آجاتا ایسے ہی ان الفاظ کے بدلنے سے اصل زبان کی صفات نہیں بدلتیں وہی اس کے صرف و نحو۔ معانی و بیان عروض و قوافی تشبیہات و استعارات اشارات۔ و استعمالات رہتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں نے ایک ہی گھر میں جنم لیا ہے دونوں ماں جائی بہنیں ہیں جو انکو جدا کرتے ہیں ستم کرتے ہیں ناخنوں سے گوشت جدا کرتے ہیں۔ میرے نزدیک زبان ایک ہی ہے خواہ وہ فارسی خط میں ہو دیوناگری خط میں یا رومن کیریکٹر میں لکھی جائے خط کی تمیز کے لئے میں اوّل کو اردو زبان دوم کو ہندی بھاشا۔ سوم کو ہندوستانی زبان لکھوں گا۔

ہمارے علم ادب کی تقسیم باعتبار مضامین

میں مضامین کے اعتبار سے اپنی زبان کے علم ادب کو سات قسموں میں منقسم کرتا ہوں جنکی تفصیل نیچے لکھی ہے۔

(۱) مسلمانوں کا مذہبی علم ادب جو کل اردو زبان میں ہے شاید ہی کوئی کتاب ہندی بھاشا میں ہو

(۲) ہندوؤں کا مذہبی علم ادب جو زیادہ تر ہندی بھاشا میں اور کمتر اردو زبان میں ہے۔

(۳) عیسائیوں کا مذہبی علم ادب جو کمتر ہندی بھاشا اور زیادہ تر اردو زبان میں ہے۔

(۴) گورنمنٹ نے اور اسکے سررشتہ تعلیم نے جو اُردو زبان و ہندی بھاشا میں نیا علم ادب پیدا کیا ہے۔

(۵) اخبارات اور رسالوں کا علم ادب جو اُردو زبان اور ہندی بھاشا میں ہے۔

(۶) ہمارے شاعروں کا اور مشرقی خیالات کے انشا پردازوں کا علم ادب جو اُردو و ہندی زبانوں میں ہے۔

(۷) قصص و ناٹک کا علم ادب جو اُردو زبان اور ہندی بھاشا میں ہے۔

مذہبی علم ادب کے مقدم ہونے کی وجہ

میں نے مذہبی علم ادب کو اسلیئے مقدم رکھا ہے کہ جیسے انسان نے اپنی اعلیٰ درجہ کی قابلیتوں اور استعدادوں کا کمال اور اپنی عالی دماغی اور روشن ضمیری کے جوہر اس علم ادب میں دکھائے ہیں ایسے کسی اور علم ادب میں نہیں دکھائے انہیں وہ کُتب مقدسہ بھی داخل ہیں جنکو اعتقاداً انسان الہامی مانتا ہے۔ یہ مذہبی علم ادب اور سب قسم کے علم ادب کا جامع ہے اور کل پر محیط اور حاوی ہے اگر شاعر کو تشبیہات و استعارات شاعرانہ اور علم معانی و بیان کے نکات کی تلاش ہو تو وہ ان سب کو اسمیں پائے گا اور انکو جان کر فصیح بیان اور بلیغ زبان ہو جائے گا۔ اگر مورخ کو واقعات عالم کی تاریخ کا تجسس ہو تو اسمیں جسقدر اسکا مصالحہ موجود ہے وہ کسی اور علم ادب میں نہیں وہ اسکے بغیر جانے کے مورخ نہیں ہو سکتا۔ اگر حکیم و فلسفی کو حکمت و فلسفہ و اخلاق کے مسائل کی جستجو ہو تو وہ اسکو سرتاپا ان سے بھرا ہوا مطالعہ کریگا۔

قاعدہ ہے کہ آدمی کسی دوسرے مذہب کی کتاب کو کماحقہ نہیں سمجھ سکتا جب تک اُسی مذہب کا آدمی بن کر نہ مطالعہ کرے۔ مگر یہ سلک وہی شخص اختیار کر سکتا ہے جس کا دل قدرتی طور پر آلائش تعصب سے پاک ہو اور بے تعصب سب مذہبوں میں حق اور سچ کا جویا ہو۔ غرض ایسا شخص ہی مذہب کی کتابوں سے مستفید و مستفیض ہو سکتا

ہے جو شخص اس علم ادب سے بے بہرہ ہے وہ ادیب نہیں ہو سکتا۔

(اول) مسلمانوں کا مذہبی علم ادب

اُردو زبان میں علمائے اسلام نے مذہبی علم ادب کا ایسا بڑا ذخیرہ اور سرمایہ جمع کر دیا ہے کہ صدہا مسلمان بغیر عربی دانی کے دلوی اور مجتہد ہو گئے ہیں۔ قرآن شریف کے متعدد ترجمے اُردو زبان میں ہیں۔ ان سب ترجموں میں شمس العلماء حافظ مولوی نذیر احمد ایل ایل ڈی کا ترجمہ فوقیت رکھتا ہے قرآن شریف کا مطلب جیسا اس ترجمہ سے پڑھنے والوں کی سمجھ میں آتا ہے ایسا کسی اور ترجمہ سے نہیں۔ چنانچہ ان ترجموں کے ساتھ قرآن شریف کی تفسیریں بعض مفصل و مطول ہیں۔ نواب قطب الدین خان نے جامع التفاسیر اول اُردو زبان میں لکھی اور بعد اسکے کئی تفسیریں اور لکھی گئیں غرض سب میں سے زیادہ مشہور تفسیر مولوی عبدالحق صاحب کی ہے۔ غرض بغیر عربی دانی کے قران شریف کے سمجھنے کے لئے اردو زبان میں تفاسیر کافی موجود ہیں۔

قرآن شریف کے ترجموں اور تفاسیر کے بعد احادیث کا حال یہ ہے کہ نواب قطب الدین خان نے مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ چار حصوں میں کیا جو کئی دفعہ مطبوع ہوا اور ہمیشہ چھپتا رہے گا اور اور چھوٹی چھوٹی حدیث کی کتابوں کا ترجمہ بھی انہوں نے کیا جیسے کہ حصن حصین ظفر جلیل چہل حدیث ہیں۔ مولوی وحید الزماں خان ایک عالم ہندوستان سے مکہ شریف کو ہجرت کر گئے تھے۔ وہاں ان سے نواب شاہجہان بیگم صاحبہ والی بھوپال نے صحاح ستہ کا ترجمہ اُردو زبان میں کرایا انہوں نے صحیح ترمذی اور موطا ابن ماجہ و مسلم وغیرہ پانچ کا ترجمہ نہایت اچھا کیا انکا ترجمہ کئی دفعہ چھپ چکا ہے۔ صحیح بخاری کا ترجمہ باقی رہا سو اب وہ ترجمہ ہو کر شایع ہوا ہے پھر تیسیر الوصول فی جامع الاصول جو احادیث کی ایک جامع کتاب ہے

اسکا مولوی محی الدین خان جج حیدرآباد نے اچھا ترجمہ کیا ہے اور بہت سی چھوٹی چھوٹی کتابیں احادیث کی ترجمہ ہوئی ہیں۔ شاید کوئی حدیث باقی رہی ہوگی جسنے اردو زبان کا جامہ نہ پہنا ہو۔

اب قرآن و تفسیر و حدیث کے بعد فقہ و اصول و فرائض کے ترجموں کی کیفیت یہ ہے کہ ہدایہ و شرح وقایہ و در مختار و توضیح و تلویح و سراجی و شریفیہ اور فتاوے عالمگیری یہ سب اردو زبان میں ترجمہ ہوگئے ہیں۔ غرض کوئی فقہ و اصول فقہ کا مسئلہ باقی نہ رہا جو عربی زبان سے اردو زبان میں نقل نہ ہوا ہو۔ علاوہ اسکے اور مشترک کتابیں جیسی کہ احیاء العلوم و کیمیائے سعادت اور بہت سے بزرگوں کے مکتوبات و ملفوظات اور بعض اخلاق کی کتابیں اردو میں ترجمہ ہوگئی ہیں۔ ان کتابوں کے ترجموں نے مذہبی علم ادب کو وسعت میں بہت پھیلا دیا ہے مگر عمق میں کم کر دیا ہے یعنی مذہبی علم کی تو وسعت ہو گئی ہے مگر عمیق کم۔ ان ترجموں نے آپس کے مذہبی فساد و عناد بہت کم کر دئے ہیں۔ ان آپس کے مباحثوں مجادلوں کی کتابوں کی کثرت تصنیف نے اردو زبان میں مذہبی کتابوں کا انبار لگا دیا ہے۔

پہلے مقدس و بزرگ علما کی تصنیف و تالیف فقط ثواب کی نیت سے ہوتی تھی۔ اب تجارت کی غرض سے ہوتی ہے۔ علمائے سابق اپنی تصنیفات کو وجہ معاش نہیں بناتے تھے اسکے برخلاف شاید کوئی مولوی ایسا ہوگا جسکا مطلب تصنیف و تالیف سے یہ نہ ہوتا ہو کہ کچھ روپیہ حاصل کیجئے۔ غرض ان مذہبی کتابوں کی تصنیفات بھی ایک تجارت کا پیشہ ہوگیا ہے اس سبب سے بھی مذہبی علم ادب کی کتابوں کی گرم بازاری ہوگئی ہے۔ روز روز مذہبی علم ادب کی کتابیں بہت بڑھتی جاتی ہیں۔

مسلمانوں کا جدید مذہبی علم ادب

جو کتابیں کہ عربی زبان سے ترجمہ ہوئی ہیں ان میں وہی قدیمی پرانے مسائل اور مختلف مذہبی فرقوں کے مولویانہ مباحثے لکھے ہیں جو مباحثے بے نتیجہ قیل و قال خشک و خت کے ہیں نہ جنکے نتیجے ہیں

نہ پھیل جاتی ہو۔ مگر ایک نیا لٹریچر مذہبی پیدا ہوا ہے جس پر مسلمانوں کو غور و فکر اور تجربہ کرنا چاہیے جو
یہ بتلاتا ہے کہ تہذیب کی ترقی کے ساتھ مذہب کی بھی ترقی ہوتی ہے

یورپ میں جب لبرل ایجوکیشن (آزادانہ تعلیم) کو فروغ ہوا اور سائنس [illegible]
پایا جیسے مذہب موجودہ عقیدوں کی بوچھاڑ لگادی اور کسی بات کو جو خلاف نیچر اور عقل [illegible]
اسے نہیں دیا اور جبکہ [illegible] مذہب موجودہ سے [illegible] شروع کیا [illegible]
دیندار عیسائیوں سے اس کا [illegible] کیا [illegible] اپنے اصلی مذہب پر غور [illegible]
کیا تو اسکو انہوں نے پایا کہ وہ [illegible] سائنٹفک [illegible] ایسا مستحکم ہوسکتا ہے کہ جس میں
کسی [illegible] گنجائش نہیں رہے گی اسلئے [illegible] نے اپنی کتب مقدسہ کی تفسیر
اس طرح سے تحریر کرنی شروع کی کہ اپنے مذہب کو نیچر اور عقل کے موافق بنا دیا چنانچہ حضرت عیسیٰ
کو تو انہوں نے معجزہ و ناپاکی سب آیات کو جنکے معانی نیچر کے خلاف معلوم دیتے تھے کہ [illegible]
زمانہ میں جتنا علم بڑھتا جاتا ہے اتنے انکے اصلی معانی جو فی الحقیقت نیچر کے موافق تھے [illegible]
ہوتے جاتے ہیں اور [illegible] بات نکلتی آتی ہے کہ کتب مقدسہ کے اصلی معانی [illegible]
سمجھ میں آتے ہیں ایسے کبھی نہیں آئے۔ اگر یہ مان لیا جاوے کہ اس [illegible]
یورپ و امریکہ میں پہلے کی نسبت دہریے اور ملحد بہت زیادہ ہوتے ہیں تو بھی وہ سچے [illegible]
کے پابند پہلے عیسائیوں کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں۔ غرض اس تعلیم اور تہذیب کی ترقی سے مذہب
میں جو فضول اور خرافات آمیزش ہوگئی تھیں انکو پاک و صاف کر دیا۔ مہذب [illegible] کے مذہب
کی اس حالت کو دیکھکر بعض مسلمانوں نے جو ہندوستان میں عالی دماغ، روشن ضمیر، پاک خیال اولوالعزم
ذی علم اپنی قوم کے سچے دل خیر خواہ تھے وہ یہ سمجھے کہ بغیر مغربی تعلیم و تربیت و تہذیب کے مسلمان
مہذب دنیا میں عزت و وقعت نہیں پا سکتے اسلئے انہوں نے اول مسلمانوں کے لئے نئی
تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور جبکہ یہ فکر کی کہ مبادا یہ مغربی طلبہ کے مذہب پر ایسا خراب اثر [illegible]

ملحد اور دہریے ہوجائیں ورنہ سب مسلمان رہتے۔ جب یورپ اور اسلام کو سلام کر دیں تو ... نے اپنی
تصنیفات سے ایک جدید علم ادب مذہبی پیدا کیا اور آیات قرآن شریف اور احادیث کے معانی
باستناد اقوال و اعمال بزرگان سابق ایسے بیان کئے کہ ان میں کوئی بات عقل اور نیچر کے خلاف
نہ تھی اسلام کو ان فضول اور خرافات اور بے اصل باتوں سے بالکل پاک صاف کیا جو اسمیں
جہالت کے سبب سے داخل ہوگئی تھیں انہوں نے ثابت کیا کہ اسلام ہی صرف ایسا مذہب ہے
کہ سائنٹفک بنیاد پر قائم ہوسکتا ہے

مذہبی علم ادب جو عربی سے فارسی کتابوں کے ترجمہ سے یا اس طرز تصنیف سے مرتب
ہوا ہے اسکی زبان ایسی ہے کہ وہ مطلب کے سمجھنے کو کافی ہے مگر زبان کی کوئی خوبی اس میں
نہیں مگر اس جدید مذہبی علم ادب کی زبان ایسی ہے کہ اسمیں ساری خوبیاں زبان کی سلاست
فصاحت بلاغت کی موجود ہیں اگر کسی شخص کو فقط اردو زبان سیکھنا منظور ہو تو وہ ان کتابوں
کے مطالعہ سے زبان دان ادیب بن سکتا ہے۔

(دوسرا) ہندؤں کا مذہبی علم ادب ہندی بھاشا اور اردو زبان میں

اگرچہ ہندؤں کی یہ عادت پہلے نہ تھی کہ وہ غیر زبانوں کی کتابوں کا سنسکرت اور سنسکرت کی کتابوں
کا غیر زبان میں ترجمہ کرتے مگر زمانہ حال میں انہوں نے یہ کمال کیا ہے کہ تھوڑے عرصے میں اپنے دہرم شاستر
کی بہت سی پستکوں کا الٹھا ہندی بھاشا میں اور کچھ اردو زبان میں کر دیا ہے۔ دیانند سرستی نے
وید کا ترجمہ ہندی بھاشا میں کیا جس نے قدیمی مذہب میں تغیر پیدا کر دیا۔ جیسے پنڈت چونکے
کہ یہ کیسا پھوڑا اپنے ہی بدن میں نکلا اسکا علاج کرنا چاہئے پہلے تو وہ ویدوں کے مطالعہ سے
بڑے غافل تھے مگر اب دل سے اسمیں مصروف ہوئے۔ اور سرستی کے ترجمے کی غلطیاں
نکالنے لگے۔ دہرم شاستر کی بڑی بڑی کتابیں جو ہندی بھاشا میں ترجمہ ہوئیں اور بعض ان

میں سے فارسی خط میں مطبوع ہوئیں انکے نام یہ ہیں مہا بھارت - رامائن - پران - منو کا دھرم شاستر
مہا بھاشیہ جوگ باششٹ - گیتا - اپنشد - اسکے سوا اور بہت سی چھوٹی کتابیں
غرض ہندی بھاشا میں اب ہندوں کے لئے ایسا سرمایہ جمع ہو گیا ہے کہ وہ سنسکرت پڑھے بغیر
دھرم کے کرم سے بخوبی واقف ہو سکتے ہیں -

وہ دھرم شاستر پہلے برہمنوں ہی کے سینہ میں بطور خفیہ مقفل رہتا تھا اب وہ بند سے
رہا ہو گیا ہے اب اور قوموں نے بھی پنڈت ہونے لگے ہیں

(تیسرا) عیسائیوں کا مذہبی علم ادب اردو زبان ہندی بھاشا میں

ہندو مسلمانوں کو تو اپنی زبان میں مذہبی علم ادب پیدا کرنا چنداں مشکل نہ تھا مگر عیسائیوں کے
لئے وہ اسلئے مشکل تھا کہ خود انکی زبان ہندوستانی نہ تھی مگر ان کی لیاقت محنت ہمت و ولولہ
نے اس مشکل کو سہل کر دیا انہوں نے بائبل کتب مقدسہ کو اردو ہندی زبان میں ترجمہ
کیا اور ان کی اشاعت خوب کی - ان ترجموں کی اصلاح و ترمیم میں اب تک کوشش چلی جاتی
ہے اور ان میں بیدریغ روپیہ صرف کیا جاتا ہے - انہوں نے انجیل کی تفسیر میں جو رومن
کیریکٹر میں چھپی ہے ایک لاکھ روپیہ خرچ کیا - اس علم ادب کے ساتھ یہ ایک تخصیص ہے
کہ اسکی بعض کتب رومن کیریکٹر میں بھی مطبوع ہوتی ہیں - ان کتب مقدسہ کے سوا اور
کتابیں مواعظ و اخلاق و قصص و تواریخ و تذکروں کی ہندوستانی زبان میں مطبوع ہوئی
ان کے سبب سے ہماری زبان میں نئے خیالات اور مضامین داخل ہو گئے ہیں جو نیکی کی
طرف رہنمائی کرتے ہیں - (باقی آئندہ)

محمد ذکاء اللہ
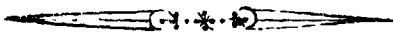
پیٹرارک کا خواب

جوانی کے زمانے میں میں اکثر غیر آباد جگہوں میں پھرا کرتا تھا اور جنگلوں اور درختوں کے جھنڈ میں سونے سے ذرا بھی خائف نہ تھا میری سب سے بڑی خوشیوں کی خوشی اور بسا اوقات میرا شغل یہ تھا کہ زمانۂ سلف کے مشاہیر کی جیتی جاگتی تصویروں سے بزم خیال کو آراستہ کیا کرتا تھا۔ ان میں شاعر بھی ہوتے اور حکما بھی۔ بڑے نصیبوں والے بھی اور بدبخت بھی۔ غرضکہ جس کسی کی ہمت۔ عقل یا شیریں بیانی میرا دل لبھا لیتی یا جس کسی کے سوانح مجھے بالخصوص دلچسپ معلوم ہوتے وہ بلا تکلف میرے انجمن تصور میں مدعو کیا جاتا۔ اپنے دل میں اُنکے طبائع اور مزاج کا جو اندازہ میں نے کر لیا تھا اسکے مناسب اُن سے باتیں کیا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ اپنے خیال میں میں اُنکی چال ڈھال بات چیت انداز و آواز سے بخوبی واقف ہو گیا تھا اور اُن میں جو بدبخت تھے اُنکی خیال۔ ورقوں کو بسا اوقات اپنے آنسوؤں سے تر کیا کرتا ...... مگر استعاروں سے مجھے ذرا دلچسپی نہ تھی۔ اُسے میں بالعموم آرام پسند۔ بے فکر سبکسیر طبائع کا بیکاری میں دل بہلانے والا مشغلہ خیال کرتا تھا۔ میرے نزدیک اُسے دلی جذبات سے ذرا مس نہ تھا۔ نظم کے لونڈی ہے غلاموں میں اُسکا سب سے کم مرتبہ تھا۔ گویا شعر کی اسٹیج پر بھوت پری کے سوانگ بھرنے کے سوا اُسکا دوسرا کوئی کام نہ تھا

ایک دن میں اسی پر غور کرتے کرتے پہاڑی کی چڑھائی سے تھک کر رستے کے کنارے ہری گھاس والے ایک نرم سے ٹیلے پر لیٹ گیا لیٹتے ہی آنکھوں میں نیند آگئی۔ نہ معلوم کتنی دیر سویا ہوں گا کہ ایک خواب یا نظارہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

دیکھتا ہوں کہ دو پیاری پیاری صورتیں میرے پاس کھڑی ہیں۔ پر دونوں کے تھے

کر کچھ تنگ سے رہتے تھے۔ ایسے معلوم ہوتے تھے کہ اُن سے کہیں کچھ زیادہ برآمد ہوں۔

اُنمیں سے ایک مجھے بار بار دیکھ کر آہستہ سے اور ایسے نرم لہجے میں جو میں نے عمر بھر نہ سنا تھا دوسری سے بولی "دیکھو بہن! اسے اپنے پر سے چھیڑ کر نہ جگانا۔ یہ اس وقت بڑی حفاظت میں ہے" یہ سنکر جو میں نے دوسری کی طرف دیکھا تو مجھے تیر سے کچھ زیادہ نظر آئے۔ وہ بھی رفتہ رفتہ ہو گیا۔ نوک تک دکھائی دیا۔ تیر کو کچھ اس نزاکت سے لئے ہوئے تھی۔ وہاں تو بالشت سے زیادہ نقطہ آتا تھا مگر باقی حصہ اور چھپنے والی کی نسبت پر کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ یہ کلام سنکر دوسری سے ذرا بگڑ کر انداز سے بولی "یہ وہ تیر نہیں جو کسی کو نیند سے چونکا دے۔ یہ میری مدد بغیر جو نیند تم آنکھوں میں لاتی ہو اُس سے کہیں زیادہ اطمینان۔ اور دلفریب خواب لوگوں کو میرے اس تیر کی بدولت نصیب ہوتے ہیں۔

پہلی نے جواب دیا "خیر بہن! یونہی سہی۔ تم جانتی ہو لڑنا جھگڑنا میرا شیوہ بھی نہیں۔ مگر بُرا نہ ماننا۔ ہزاروں جنکو تمنے بُری طرح زخمی کیا ہے مجھی کو دعائیں مانگ مانگ کر بُلاتے ہیں۔ پھر بھی تمہارے خلاف کچھ کرنے سے میں ایسی گھبراتی ہوں کہ ان بیچاروں کے لئے سوائے اسکے کچھ نہیں کرتی کہ چلتے چلتے ایک دو تسکین آمیز نقطے اُنکے کان میں کہہ آتی ہوں۔ تم تو جانتی ہو کہ ان باتوں سے مجھپر ناحق کتنے الزام آتے ہیں اور میری بیوفائی اور تغافل کے کیسے کیسے شکوے ہوتے ہیں۔ سچ پوچھو تو میں بھی اُتنی ہی گالیاں کھاتی ہوں جتنی کہ تم"

یہ سُنکر محبت طنزاً بولی۔ "اے نیند! تعجب ہے کہ میں اور آپ اسقدر ہم رنگ خیال کئے جائیں! ذرا اُدھر ملاحظہ کیجئے۔ وہ یہ ہیں جن سے آپ کے انداز ملتے جلتے ہیں۔ بھونڈی سی بھونڈی عقل بھی اسکو تسلیم کرتی ہے"

میں نے جو آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو جس طرف محبت نے اشارہ کیا تھا ایک اور صورت بھی

فاصلہ پر نظر آئی۔

محبت اور نیند کی تکرار اسی طرح جاری رہی۔ نیند تو اپنی طاقت کے اظہار اور اپنے احسانات گنوانے میں نہ باقی تھی مگر محبت کو اپنے کرشمے اور انداز جتانے اور اپنا زور جتانے میں ذرا تامل نہ تھا۔

یک بیک محبت میری طرف مخاطب ہوئی اور کہا "تمہیں کہیں نے حکم دیا۔ کہ وہ کہ کسکے زیر سایہ رہنا چاہتے ہو" میں جو غور کرنے لگا تو ان دونوں کا اثر میرے دل پر باری باری ایسی محسوس ہوتا تھا کبھی تو میں تمنا کے ولولوں سے گرما تھا کبھی تسکین کی ٹھنڈک سے آرام پاتا تھا۔ کبھی سرور کا مزا تھا۔ کبھی خمار کا لطف۔ مگر دل ماننا تھا کہ ایک ہی کو۔ اور ایک ہی کے لطف سے محظوظ ہونا پسند کروں۔ میری اس کشمکش کو دیکھ کر محبت سے نہ رہ گیا۔ جھنجھلا کر بول اٹھی کہ "خیر۔ رہ تو سہی۔ اسکا کیسا مزا چکھاتی ہوں۔ ایسا ہی زندگی تیج نہ کر دوں تو محبت نام نہیں" گو میں جانتا تھا کہ آپکا وعدہ ہمیشہ وفا تو ہوتا ہی نہیں مگر یہ جلی ہوئی تقریر ایسی نہ تھی کہ جس پر اعتبار نہ کیا جاسکے۔

یہ قضیہ ابھی فیصل نہ ہوا تھا کہ تیسری صورت بھی قریب آگئی۔ معلوم نہیں کہ بغیر دیکھے کیونکر پہچان لیا مگر میں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ موت ہے۔ اول تو اُسے دیکھ کر میں کچھ سہم گیا تھا مگر جوں جوں اُسکے خط و خال پر غور کیا وہ صورت آشنا معلوم ہونے لگی۔ شروع میں تو اُسکے چہرہ پر ایک سکوت سا طاری تھا۔ بعدہٗ اندرونی غور کے آثار نظر آنے لگے اور پھر جو نظر بھر کر دیکھا تو چہرہ کو ایک نایاب حسن سے منور پایا۔ میں نے کبھی تصویر میں یہ تناسب نہ دیکھا تھا۔ نہ کسی حسن کی دیوی کے خط و خال ایسے سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ نہ کسی پتھر کی مورت میں یہ متانت دیکھی تھی۔

محبت سے آنکھ تو ملائی گئی مگر کن انکھیوں سے موت کو دیکھتی رہی۔ چہرہ سے معلوم ہوتا تھا

نہ کچھ تو خائف سے ہے کچھ متنفر۔ آخرکار کہنے لگی " جاؤ بس اب جاؤ۔ جس چیز کو تم نے ہاتھ لگا دیا پھر وہ جیتی نہیں بچتی "

موت آگے بڑھی اور جوں جوں قریب آتی جاتی تھی زیادہ بلند پایہ اور جلیل القدر معلوم ہوتی تھی۔ پھر محبت سے مخاطب ہو کر کہا " بیٹی یوں کہو کہ جب تک میرے پروں کی چھاؤں اس پر نہیں پڑتی کوئی خوبصورت یا عالی مرتبہ شے اپنی اصلی حیات کو نہیں پاتی "

محبت نے یہ سنکر ذرا منہ بنایا۔ اور غصے سے اپنے تیر کے پر آہستہ آہستہ توڑنے مروڑنے لگی۔ جواب کچھ نہ دیا مگر ترچھی نظروں سے گھورتی رہی۔ لیکن اب مجھے اسکی جنون سے ناراض معلوم ہوتا تھا جوں جوں میں ہمت کر کے موت کے چہرہ کو غور سے دیکھتا تھا وہ مجھے راضی نظر آتی تھی۔ اُسکے پاس اُس دوسری کی طرح نہ تو پھول تھے نہ تیر تھا۔ مگر سر کو جنبش دے کے کالی زلفوں کو جو چہرے کو کچھ کچھ چھپائے ہوئے تھیں اس نے سامنے سے الگ کیا اور آگے بڑھکر تپاک سے اور خندہ پیشانی سے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ اُسکو اسطرح بے حجاب و بے نقاب اس قدر قریب دیکھکر گو میں سہما ضرور۔ مگر دل سے خود بخود الفت کی آہ نکل گئی۔ وہ مسکرائی۔ مگر میری گھبراہٹ اور تساہل کی وجہ سے تبسم افسوس آمیز تھا۔ پر میں کیا کروں میں نے اُسکا بڑھا ہوا ہاتھ دیکھا تو بے اختیار مجھے یاد آنے لگا کہ ضعیف کا ہاتھ کیسا نرم اور تشفی بخش تھا۔ محبت کا ہاتھ کیسا گرم اور ولولہ انگیز۔

بارے رفتہ رفتہ مجھے اپنے ناشکرے پن پر ندامت ہوئی اور میری گھبراہٹ دور ہو گئی۔ پھر بھی منہ تو ادھر سے پھیر لیا اور یا قسمت یا نصیب کہکر میں نے اپنا آغوش کھول دیا۔ یہ ہونا تھا کہ ہم دونوں ہم آغوش ہو گئے۔ گلے سے گلا۔ سینے سے سینہ مل گیا۔ ایک عجیب تسکین تھی کہ میری دل کی دھڑکن کو مٹا رہی تھی۔ صبح کی سی تازہ اور فرحت افزا ٹھنڈک سوزش درون کو دور کر رہی تھی۔ گویا آسمان کے دروازے میرے لئے کھل گئے تھے۔ کیونکہ جس نے

سارے بند توڑ کر مجھے آزاد کیا تھا اُس صاحب جمال کا رخسار میرے سر سے لگا ہوا تھا۔

میں چاہتا ہی تھا کہ دیکھوں وہ دونوں کہاں ہیں کہ موت نے میرے مطلب کو سمجھکر کہا "وہ نیند تو زمین کو گئی۔ ہے اُسکے بلانے والے وہاں ہزاروں ہیں۔ مگر وہ اُنکے پاس نہیں جاتی۔ وہ بیچاری جتنا اُسے بلاتے ہیں وہ اُن سے اُتنی ہی دور بھاگتی ہے۔ دیکھنے میں تو وہ متین اور سنجیدہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر سچ پوچھو تو اپنی مغرور اور وحشت خیز بہن سے کم متلون مزاج اور ناز کرنے والی نہیں"

میں پوچھنے لگا "اور محبت؟ کیا وہ بھی بے ملے رخصت ہوگئی۔ اگر اب بھی موقعہ ہو تو میں روٹھی کو منا لوں؟"

یہ سنکر وہ بولی "جو اس راستہ میں میرا ساتھ نہیں دے سکتی۔ جو مجھے پکڑ نہیں سکتی۔ نہیں نہیں جو مجھسے دو قدم آگے نہیں رہ سکتی وہ ہرگز اُس نام کی شایاں نہیں جو دنیا میں سب سے پیارا اور عقبیٰ میں سب سے بلند تر ہے۔ دیکھ اوپر نظر اُٹھا! حقیقی محبت وہ کھڑی تیری راہ دیکھ رہی ہے۔"

میں نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو زمین نیچے تھی۔ نیلگوں آسمان صاف و شفاف نظر آتا تھا۔ اور اُس سے بھی اوپر ایک عجیب روشنی۔

محمد علی

(ترجمہ از انگریزی)

سودیش پرچارک ۔ ایک ہفتہ وار اخبار منشی [illegible] صاحب دہلوی کی ایڈیٹری میں یکم جنوری ۱۹۰۶ء سے لاہور سے شایع ہوا کریگا۔ اور اسمیں ترتیب مضامین حسب ذیل ہوگی: (۱) سودیشی دستکاری کی ترقی [illegible] ایجادیں (۳) ہندوستانی کارخانے اور انکی صنعت (۴) ہنر اور انکی دستکاریاں (۵) [illegible] نقلیں وغیرہ۔ امید کیجاتی ہے کہ یہ اخبار اپنی طرز کا ایک انوکھا اخبار ہوگا۔ قیمت سالانہ [illegible]

درخواست بنام مینیجنگ سکرٹری سودیشی پرچارک کمپنی لاہور ہو۔

عالمِ تنہائی کی خوشیاں

"حضرات! میں آپ سے کیا کہوں کہ میں کسقدر بے چین ہوا جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ بھی مجھے دنیا کے مصیبت زدوں میں سے ایک مصیبت زدہ خیال کرتے ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ میری نسبت عام لوگوں کا یہی خیال ہے اور جب میں یہ سنتا ہوں تو مجھے بھی رنج ہوتا ہے۔ اے کاش! جو زندگی میں بسر کرتا ہوں ساری دنیا کو اسکا بھید معلوم ہو جائے! پھر میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص میری قسمت پر رشک کرے گا۔ اور میری تقلید کی کوشش۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر دنیا میں امن کی حکومت ہوگی۔ اور آدمی اپنے ہم جنس کو آزار پہنچانے کا کبھی وہم و گمان بھی نکریگا۔ بُرے لوگ دنیا سے مفقود ہو جائینگے کیونکہ پھر کسیکو برائی میں یہ مزا نہ آئیگا۔ وہ کیا شے ہے جسکا لطف میں اُٹھاتا ہوں؟ میں خود! ساری دنیا! وہ سب کچھ موجود ہے وہ سب کچھ جو موجود ہو سکتا ہے! وہ سب جو حسنِ دنیا میں خوبصورت کہا جا سکتا ہے وہ سب جو دماغی دُنیا میں بہترین خیال کیا جا سکتا ہے!

مینے اپنے گرد وہ سب سامان مہیا کر لئے ہیں جو میرے دل کی خوشی کا باعث ہو سکتے ہیں خود میری خواہشیں میری خوشیوں کو محدود کرتی ہیں۔ بڑے سے بڑے عیاش کو بھی اُن خوشیوں کی ہوا تک نہیں لگی جنکا حظ میں اُٹھاتا ہوں۔ مینے ہزاروں دفعہ اپنے خیالات میں وہ لطف اُٹھائے ہیں جو لوگوں کو حقیقی واقعات میں میسر نہیں آتے۔

جب غم و رنج کا ہجوم مجھے آن دباتا ہے۔ اور رات کاٹے نہیں کٹتی اور ایک لحہ کو بھی آنکھ نہیں لگتی تو میں اپنی موجودہ حالت سے اپنے خیالات کو پھیرتا ہوں۔ اور اپنی گذشتہ زندگی کے مختلف واقعات کی نسبت دھیان کرنے لگتا ہوں کبھی پشیمان کبھی بعض واقعات کی دل

خوش کن یاد - حسرت - افسوس یہ سب ملکر وقتاً فوقتاً چند ساعت کے واسطے میری موجودہ تکالیف بھلا دیتی ہیں آپکی ہارنے میں ہیں خوشی کے ساتھ اپنے ان حبادت میں کونسا زمانہ زیادہ تر یاد کرتا ہوں ؟ جوانی کی خوشیاں نہیں ! کیونکہ وہ اوال تو بہت کم تھیں - وہ بھی رنج و تکلیف سے آلودہ تھیں - اور اب تو وہ مجھسے کوسوں دور ہیں ! میں اپنی تنہائی کا زمانہ یاد کیا کرتا ہوں جبکہ میں تن تنہا سیر کو نکلتا تھا - کیسے مزے کے تھے مگر کسقدر جلد گذر گئے - وہ دن تھے جو میں نے اپنے ہی خیالات میں گذارے ہیں - ایک سادہ لوح بوڑھا جو میرے گھر کی نگرانی کرتا تھا اور ایک میرا عزیز کتا صرف یہ دو میرے ساتھ رہا کرتے تھے - کھیتوں کی چڑیاں جنگل کے چکارے میرے رفیق تھے - غرض قدرت کی ساری صنعت اور وہ وہم و گمان میں نہ آنے والا واحد صانع ہر وقت میرے پیش نظر تھا - صبح سویرے اُٹھتے ہی اپنے چھوٹے سے باغیچہ میں کھڑے ہوکر سورج کے طلوع کا سماں دیکھنے میں خصوصاً جسدن مطلع صاف ہوتا میری سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی تھی کہ خدا کرے اسوقت کسی شخص کی یا کسی خط و رقعہ کی آمد میرے اس دلفریب مزے میں رخنہ ڈالے صبح ہی صبح میں بہت سے ضروری کاموں سے فراغت پا لیتا تھا اور کھانا کھانے میں جلدی کرتا تاکہ اُن ناخواندہ مہمانوں سے بچکر نکل بھاگوں جو میرے بار خاطر ہوتے تھے - اور سہ پہر کا وقت اپنی حسب خواہش آرام سے گذاروں - ایک بجے سے پہلے ہی خواہ کتنی ہی گرمی ہو میں دھوپ کی تیزی میں اپنا کتا ساتھ لیکر گھر سے تیزی کے ساتھ نکلتا - اور جلد جلد قدم اُٹھاتا اس ڈر سے کہ کہیں کسی کی آمد سے میں پکڑا نہ جاؤں - اور جب اوٹ میں آجاتا تو میرا دل ایک انبساط کے ساتھ دھڑکنے لگتا - اور میں آزادانہ سانس لیتا یہ سمجھکر کہ اب میں امن و امان میں ہوں - پھر میں اپنے دل میں کہتا کہ اب میں سارے دن اپنا مالک آپ ہی ہوں پھر میں آرام سے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا چلتا اور ادہر اودہر جنگل میں ایک سنسان گوشے کی یا کسی ویرانے کی تلاش کرتا جہاں کوئی چیز انسان کے ہاتھ کی صنعت

نہ ہونیکے سبب اسکی عاجزانہ طاقت کا اعلان نہ کرتی - غرض ایسی جگہہ کو میں اپنا ایک مامن
سمجھکر یہ خیال کرتا کہ اس مقام پر سب سے پہلے میں آیا ہوں - اور میرے اور قدرت کے درمیان
کوئی تیسری چیز خلل انداز نہیں ہے پس اسوقت قدرت میری آنکھوں کے سامنے اپنی تازہ
بتازہ اور نوبہ نو صنعتوں کو پیش کرتی - بعض پودوں کا سُنہرا رنگ اور میدان کی سبزی حیرت
دل پر جادو کا اثر کرتی - اونچے اونچے درختوں کی شان و شوکت جنکے سایہ میں میں گذرتا اور
طرح طرح کے پھولوں کی نزاکت جو سب طرف مجھے گھیرے ہوتے تھے اور اقسام اقسام کے
پودے اور پھول جو میرے پاؤں کے نیچے کچلے جاتے تھے متواتر میری توجہ کو اپنی طرف
کھینچتے تھے اور میں اُنکی تعریف کرتے کرتے تھک جاتا انواع و اقسام کی دلکش بیشمار
چیزیں میری شُست اور خواب پسند طبیعت کو خوب لبھاتیں اور میں اپنے دل میں اکثر کہہ یا کرتا
تھا میں سلیمان کو بھی باوجود اپنی عظمت و جلال کے یہ بات میسر نہ آئی ہوگی "

اس ویرانے کو جو ایسے قدرتی خوبصورت صنعتوں سے آراستہ ہوتا تھا میری قوت متخیلہ
ویرانہ ہی نہ رکھتی تھی - میں اسکو اپنے دل کی خواہش کے مطابق ایک ایسی مخلوق سے آباد
کرتا - جو غیبت تعصب اور تمام جھوٹے جذبات سے پاک ہو - اور قدرت کے اس مقدس
مقام میں وہ آدمی بساتا جو اُسکے لائق ہوں - ان لوگوں کی فرحت افزا صحبت کا لطف اُٹھاتا
اور دیکھتا کہ میں اُنکی صحبت کے ناقابل نہیں ہوں - غرض میں اپنے خیال کے مطابق گُل رنگ
اسمیں لاتا اور اسکے دنوں کو اپنی زندگی کے اُن تمام نظاروں سے جنکی یاد میرے دل پر نقش
تھی اور اُن تمام باتوں سے جنکا شایق میرا دل اب بھی تھا معمور کرتا - یہاں تک کہ انسان
کی سچی خوشیوں کا خیال مجھے رُلا دیتا - ایسی مزیدار خوشیاں! مگر افسوس انسان سے اتنی
دور! اگر اسوقت میرے وطن کی یاد یا میری تصنیف کا خیال میرے اس تفکر میں خلل انداز
ہوتا - اوہ! تو میں کس نفرت سے اُن خیالات کو دور کرکے اُن پسندیدہ توہمات میں جنمیں کہ میری

طرح غوطہ زن ہوتی تھی غرق ہو جاتا - لیکن اسکا میں اقرار کرتا ہوں کہ باوجود ان سب باتوں کے جب میرے خیالات کا عدم وجود ذہن میں آتا تو میں ایک لمحہ کے لئے سنجیدہ ہو جاتا تھا - اور اگر میرے سب خواب حقیقی صورت بھی اختیار کر لیتے - تب بھی مجھے تسکین نہ ہوتی میں پھر عالم خیال میں غرق ہو جاتا تو بہت بناتا اور خواہشوں کو طول دیتا - میں نے آخر کار معلوم کیا کہ مجھ میں ایک ایسی کمی ہے جو کبھی پوری نہیں ہو سکتی میرے دل میں ایک قسم کی خوشی کی خواہش ہے جسکو میں ایک محدود خیالی صورت میں بھی نہیں لا سکتا - لیکن جس کی کمی کو میں محسوس کرتا ہوں - اے حضرات درحقیقت اسمیں بھی ایک مزا ہے کیونکہ میں حقیقت سے آگاہ تھا - اور نہیں چاہتا تھا کہ اس لطف سے خواہ مخواہ محروم ہوں -

زمین کی سطح سے میں نے اپنے خیالات کا رخ خدا کی مخلوق کی طرف پھیر لیا - [illegible] نظام کا جو ستاروں میں نظر آتا ہے مشاہدہ کیا - اور پھر اُس وہم و گمان سے برتر ذات کا دھیان کیا جسکی قدرت ہر چیز میں عیاں ہے اس مقام پر پہنچکر میرے خیالات کا سلسلہ ختم ہو گیا - یہاں نہ متخیلہ کام دیتی تھی نہ عقل - اور نہ منطق اور نہ فلسفہ - مجھے اسوقت ایک خاص مزا ملتا تھا - گویا دنیا کا سارا بوجھ مجھے ہلکا سا دیتا تھا - پس خیالات کے اس انتہا میں میں نے نہایت خوش ہو کر اپنے دل کو آزاد چھوڑ دیا - اس حالت میں میرے فنا ہو جانے کا خیال نہایت مزیدار تھا - میرا دل فانی جسم میں محدود ہونے کے سبب بیقرار تھا - میرا دم اس دنیا میں گھٹا جاتا تھا اور میں چاہتا تھا کہ اس غیر محدود عالم میں جسے لامکاں کہتے ہیں گھس جاؤں - میں خیال کرتا ہوں - کہ اگر مجھپر قدرت کے راز منکشف ہو جاتے - تو میرا احساس اتنا فرحت انگیز نہ ہوتا - جتنی پُر لطف میری اسوقت کی حیرانی اور محویت تھی - جسکا مزا میرا دل بے کسی کی حالت کے اُٹھاتا تھا - اور کبھی کبھی میں اپنی خوشی کے جوش میں چلا اُٹھتا تھا - "اے بڑی قدرت والے اے بڑی قدرت والے" مگر اس سے زیادہ نہ کچھ کہہ سکتا تھا نہ خیال کر سکتا تھا -

اس طرح متواتر خوشی میں میرے دن گذرتے ہیں۔ اور ایسی فرحت اور انبساط میں بسر
ہوتی ہے کہ حضرت انسان کو شاید ہی کبھی یہ باتیں نصیب ہوتی ہوں۔ اور جب شام کے وقت
سورج کا غروب ہونا مجھے واپسی کا خیال دلاتا تو میں وقت کے جلدی گذر جانے پر حیران ہو کر
کہتا کہ میں نے اپنے دن کا کام قطعاً نہیں اٹھایا۔ بس آج کی تقصیر تو انشاءاللہ کل آکر
پورا کر دوں گا۔

آہستہ آہستہ میں گھر کی طرف لوٹتا۔ دماغ ذرا تھکا ہوا لیکن دل مطمئن ہوتا۔ کچھ دیر میں
خاطر خواہ آرام کرتا۔ اور اگرچہ اکثر چیزوں کا شور مجھے اس وقت بھی نڈھال نہ کرتا لیکن میں اس وقت
نہ سوچتا اور نہ دھیان کرتا۔ اور صرف اپنے دل کی فرحت اور سکون کی بات دھیان رکھتا اتنے
میں دسترخوان بچھایا جاتا۔ اور میں اپنے چھوٹے سے گھر میں بھوک کے ساتھ شکم سیر
ہو کر کھاتا۔ کسی قسم کی غلامی یا ماتحتی کا خیال میرے گھر کے اتحاد میں رخنہ زن ہوتا۔ میرا
کتا میرا دوست تھا۔ اور میرا غلام نہ تھا۔ ہم دونوں کی خواہش میں کبھی اختلاف نہ ہوتا
تھا۔ اور اُسے میری تابعداری کرنے کی کبھی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ میری اس وقت کی فرحت
سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ میں نے تمام دن تنہائی کا لطف اٹھایا ہے۔ برخلاف اس کے
جب کبھی میں کسی کی صحبت میں گذرتا تھا تو پھر اس وقت میرا رخ بالکل بدلا ہوا ہوتا تھا۔
دوسروں سے نفرت تو الگ رہی میں خود اپنی ذات ہی سے بیزار رہتا تھا اور شام کے
وقت خصوصاً میرا مزاج چڑچڑا ہو جاتا تھا۔ اور میں خاموش دم بخود ہو کر بیٹھ جاتا۔
یہی رائے میرے گھر کی نگراں بڑھیا نے ایک دفعہ میری نسبت ظاہر کی تھی۔
اور میں جب کبھی اپنے پر غور کرتا ہوں۔ تو اُس کو ہمیشہ صحیح پاتا ہوں۔ آخرکار سوتے وقت
باغ میں تھوڑی دیر ٹہل کر یا اپنے سرود میں کچھ راگ بجا کر میں اپنے بستر پر آرام سے
لیٹتا۔ اور میری روح اور میرے جسم کو وہ چین میسر ہوتا جو نیند سے کہیں زیادہ شیریں اور

پُرلطف ہوتا تھا۔

پس ایسے دن میں نے اپنی زندگی میں سچی خوشی کے ساتھ گزارے ہیں۔ اُس خوشی میں۔ جس میں نہ تلخی تھی۔ نہ تھکان اور نہ افسوس۔ خدا کرے ایسے ہی دن میری باقی حیات میں بسر ہوں۔ میں کسی اور شے کا خواہشمند نہیں ہوں اور نہ خیال کرتا ہوں کہ ان خیالات میں میں کسی انسانی وجہ سے کچھ کہ خوشی حاصل کرتا ہوں۔ ایک بیمار جسم اپنے دل کی آزادی کو کھو دیتا ہے۔ یعنی میں اب تنہا نہیں ہوں۔ میرے ایک مہمان آئے ہوئے ہیں جن سے میں دق ہوں۔ اور اُن سے اپنا پیچھا چھڑانے کا خواہشمند ہوں۔ تاکہ میں اپنے آپے میں آجاؤں۔ اور مجھے جمعیت خاطر میسر ہو۔"

مترجم
لطیف احمد

گر ہو سلوک باہم انسان کر کے بھولے
احسان کا مزہ ہے احسان کر کے بھولے

نشتر سے کم نہیں ہے کچھ چھیڑنا کسی کی
عاشق مزاج کیونکر ارمان کر کے بھولے

وعدہ کیا پھر اُس پر تم نے قسم بھی کھائی
کیا بھول ہے کہ ایسا پیمان کر کے بھولے

وعدے کی شب رہا ہے کیا انتظار مجھ کو
آنے کا وہ یہاں تک سامان کر کے بھولے

اپنے کئے پہ نازاں ہو آدمی نہ ہرگز
طاعت ہو یا اطاعت انسان کر کے بھولے

خود ہی مجھے بلایا پھر بات بھی نہ پوچھی
وہ انجمن میں اپنی مہمان کر کے بھولے

یہ بھول بھی ہماری ہے یادگار دیکھو!
دل دے کے منت اپنا نقصان کر کے بھولے

تم سے وفا جو کی ہے ہم سے خطا ہوئی ہے
ایسا قصور کیونکر انسان کر کے بھولے

آخر تو آدمی تھے نسیان کیوں نہ ہوتا
میری شناخت سب کو دربان کر کے بھولے

اب عشق کا صحیفہ یوں دل سے مٹ گیا ہے
جس طرح یاد کوئی قرآن کر کے بھولے

اے داغ اپنا احساں رکھے گا یاد قاتل
وہ اور میری مشکل آسان کر کے بھولے

فن شاعری

نمبر (۵)

شاعری باعتبار اعمار - شاعری یا شاعر پر جیسے زمانہ اور اثنا بزمانہ موثر ہیں - ایسے ہی اعمار یا زندگی کے مختلف مراحل کا اثر بھی مسلّمہ ہے - جوانی کی شاعری کا کچھ اور ہی جوبن ہوتا ہے اور درمیانی عمر میں کچھ اور ہی - پیری اور ضعیفی میں یہ سب رنگ گویا ویسے نہیں ہوتے - لیکن بدل ضرور جاتے ہیں - چونکہ شاعری کا زیادہ تر مدار اور وسعت متخیلہ پر موقوف ہے اور قوت متخیلہ میں باعتبار اوقات اعمار گونہ فرق آتا رہتا ہے - اسواسطے ہر رنگ میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے - ایک نامور شاعر کی ابتدائی یا جوانی کی مشق کسی اور رنگ میں ہوگی - اور عالم پیری کا سماں کچھ اور ہی رنگ رکھے گا جوانی یا عالم شباب میں انسان کی قوت انتخاب جس انداز اور جس پیمانہ پر ہوتی ہے - عالم پیری میں اسکا وہ رنگ ہی نہیں رہتا - گل و بلبل کے قصے - زلف و خال کی داستانیں - الفت و عشق کے مشغلے ہجر و وصل کے ولولے - جوانی کی گرم جوشیاں - شباب کے رنگین جنوں - حسن کی سرد مہریاں نزول پیری سے کافور ہوجاتی ہیں - نہ شام عیش میں مزا رہتا ہے - اور نہ صبح عیش کی اُداسی و مایوسی میں -

تقاضائے عمر سے سب جوش اور سب ولولے فرو ہوجاتے ہیں - اگر مواد گذشتہ سے کبھی کام لیا جاتا ہے - تو ویسے ہی - جیسے کوئی دل چلا - قرض و ام لیکر گھڑی دو گھڑی دل خوش کرلیتا ہے - بعض اچھے اچھے شاعروں کی یہ نوبت آرہتی ہے کہ بجائے نظم کے نثر پسند کرنے لگ جاتے ہیں - کسی حکیم نے شاید یوں بھی کہا ہے -

"جوانی میں اوّل ناول - قصّے پھر تاریخ پسند ہوتی ہے -

"پھر شاعری -

"شاعری کے بعد فلسفہ کی نوبت آتی ہے -

"فلسفہ کے بعد مذہب پر نظر پڑتی ہے

"مذہبیات سے صوفیانہ مشرب -

جب کبھی شاعری کا موازنہ کرنا ہو - تو لازمی ہے کہ زبان کو تمام حالات رائج میں زمانہ اور عمر کا پیمانہ ساتھ ہی رکھا جاوے - جب صحیح پیمانہ سے ناپا جاویگا تو نتیجہ بھی قریباً صحیح نکلے گا -

کچھ شک نہیں - کہ بعض شاعر یا بعض طبیعتیں ایسی ضابط ہوتی ہیں - کہ زندگی کا ہر ایک حصہ ایک ہی مقدار یا حالت پر رہتا ہے - یا تو وا قعی اُنکی خلقت جدا گانہ ہے - اور یا یہ کہ وہ کشاں کشاں اپنے تئیں ایک ہی پیمانہ پر لے آتے ہیں لیکن حق یہ ہے - کہ جیسے آفتاب کی رفتار دمبدم پتہ دیتی جاتی ہے - ویسے ہی آفتاب زندگی کی رفتار اور طلوع و غروب سے بھی پتہ لگتا ہی جاتا ہے -

ایک پیر نابالغ کتنا ہی بن سنور کر گل و بلبل کے قصے کہے - وہ بانکپن - وہ چلبلاہٹ وہ جوش - وہ اُمنگ ہی نہ ہوگی[1] - جو ایک خاص عمر میں ہوتی ہے - ہاں صرف مصداق :

"پیری کہ دم ز عشق زند بس غنیمت است"

ہاں اقتضائے عمر سے اُن خیالات میں ضرور صفائی اور ترقی ہوتی جاتی ہے - جو

[1] بعض حکیموں کی یہ راے بھی ہے کہ باوجود اقتضائے عمر کے بھی خیالات یا حدوث خیالات میں کوئی فرق نہیں آتا جیسے کہ ایک جوان کے خیالات اور حرص ہوتی ہے - ایسے ہی ایک بڈھے اور بچے میں بھی پائی جاتی ہے صرف فرق یہ ہے - کہ ایک جوان بوجہ قائمی قوائے کے اُن خیالات اُن اُمنگوں کی بخوبی تکمیل کر سکتا ہے اور ایک عمر رسیدہ باوجود موجودگی اُن خیالات کے تکمیل سے قاصر اور عاری رہتا ہے - بمصداق :- بعالم پیری و نفس جوان میگیرد"

جو اس حصۂ عمر کے شایاں ہوتے ہیں۔ اور کبھی کبھی توجہ اور دیرپا مشاہدہ بھی اُنکی صفائی اور شستگی میں کافی مدد دیتا ہے۔ نثر کی جانب شاعر بعالم پیری بعض اوقات اسواسطے بھی متوجہ ہوتا ہے۔ کہ شاعری میں جو ایک جوش اور تمکنت خاص ہوتا ہے۔ وہ بعالم پیری کم ہو جاتا ہے بمقابل اسکے نثر میں ایک دھیما پن اور معمولی حالت ہوتی ہے۔ چونکہ طبیعت بھی اس زمانہ میں اسی مرکز پر آتی جاتی ہے۔ اسواسطے نثر پسند کی جاتی ہے۔

شاعری کے مصطلحات۔ ہر فن کے کچھ نہ کچھ خاص محاورات اور مصطلحات ہوتے ہیں۔ اور اُن محاورات یا مصطلحات کی وجہ سے اُس فن کی دیگر فنون سے تمیز کیجاتی ہے۔ جب تک ان مصطلحات سے کام نہ لیا جاوے۔ تب تک صحیح نتیجہ اس فن کے متعلق سے نہیں نکلتا۔ فلسفہ کے مصطلحات جُدا ہیں۔ منطق کے جُدا۔ شاعری کے جُدا۔ شاعری کے عام مصطلحات حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔

"متعلق بہ محاورات۔

"متعلق بہ فصاحت و بلاغت۔

ان دونو قسموں کی بابت فارسی۔ عربی میں جداگانہ رسائل یا کتابیں مدون ہیں۔ پہلے متعلق ایسی کتابوں اور رسالوں میں یہ جتلایا گیا ہے۔ کہ شاعر کی ایسے الفاظ یا جمل کے اطلاق سے یہ مراد ہے یا کم سے کم یہ کہ الفاظ متعلقہ کے یہ معانی ہو سکتے ہیں۔ یا یوں انکا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اور یوں نہیں ہو سکتا۔ ان مصطلحات کے ثبوت میں مستند شعراء اہل زبان کے کے ابیات یا افراد سند میں لائے جاتے ہیں۔ مثلاً

"آب بدست کسے ریختن"

یہ ایک اصطلاح[1] یا محاورہ ہے۔ مراد اس سے "خدمت کسے کردن و نوکر و ملازم شخصے بودن" ست۔

[1] فن شاعری میں جو اصطلاحات مستعمل ہیں۔ صرف شاعری اُسکے موجد یا واضع نہیں ہیں۔ بلکہ سب اصطلاحات ایسی کے وہ [illegible] نہیں ہیں۔ اصطلاحی فقرات یا الفاظ اور جمل عام طور پر ایک قوم اور ایک ملک میں مستعمل ہوتے ہیں۔ ماہرین فن انہیں موقعہ بموقعہ

بظاہر اِن لفظوں کے معنی یہ نہیں ہو سکتے - لیکن شاعروں کی اصطلاح میں یہ انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے - اسکے ثبوت میں سلیم شاعر کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے ؎

بیا زاہد کہ در ساغر شراب بے بست مستان را ‌ ‌ ‌ کہ گر آب نتواند بہ بست تاک او ریزد

جستہ کلاغ - ایک محاورہ ہے - جس سے مراد "مردہ یا را جفت کردہ بر زمین جستن ست" - یہ ایک ورزش کشتی گیروں کی ہے - نجات شاعر نے اسے یوں باندھا ہے ؎

بسکہ از آتشِ اشک تو بدن سوزد داغ ‌ ‌ ‌ مے جہد خال ز رخسار بتاں جستہ کلاغ

دستِ زیرِ شال - اس اصطلاح سے مراد "در تشخیص و قرار دادن قیمت است" - جیسے کہ ہندوستان میں خرید و فروخت اسپاں کے وقت عموماً دلال کیا کرتے ہیں - سعید اسے یوں ادا کرتا ہے ؎

سودا بود دلال او ‌ ‌ ‌ دست بزیر شال او

اس قسم کے اور بھی ہزاروں اصطلاحات ہیں - اور یہ ایک ہی زبان سے مخصوص نہیں ہیں - ہر ایک ایسی زبان میں پائی جاتی ہیں - جو شاعری مواد رکھتی ہے - شاعری مواد پر ہی کچھ موقوف نہیں ہر زبان میں انکا مجموعہ موجود ہے - جو زبانیں شستہ ہیں - اُن میں علمی رنگ لئے ہوئے ہیں - اور جو زبانیں علمی دائرہ سے دور ہیں - اُنکے یہ بھی علمی رنگ سے معرا ہیں -

ان اصطلاحات کے علاوہ ایک قسم کے اور اصطلاحات بھی ہیں - یہ اصطلاحات خاص خاص فرق اور مشارب سے مخصوص ہیں اُن میں وہ عمومیت نہیں - جو عام اصطلاحات شاعری میں ہوتی ہے - انہیں وہی لوگ سمجھتے ہیں - جو یا تو اسی فرقہ میں شامل ہوتے ہیں - یا جو بالخصوص

حاشیہ: ایک موزونیت و خوبی کے ساتھ اپنے خیالات کے قالب میں لاکر نتیجہ خاص اخذ کرتے ہیں - شاعروں کی بعض مخترعہ اصطلاحات بھی ہیں - انکا اکثر حصہ یا تو فن شاعری سے مختص ہے - اور یا عام واقعات یا کیفیات سے : ۔۔ ۱۲

اس فرقہ کے اصطلاحات سے واقفیت اور مہارت رکھتے ہیں۔

جو لوگ ناواقفیت کی وجہ سے اصطلاحات کا مطلب نکالتے ہیں۔ جلد بازی کرتے ہیں۔ وہ یا تو غلط معانی سمجھتے ہیں۔ اور یا دائرہ افراط و تفریط میں آ جاتے ہیں۔ اور ایسے شعر کہنے والوں کی مذمت یا ہجو کرتے ہیں۔

اگرچہ ایسے شاعر بلحاظ اپنے مذاق کی عمدگی اور خوبی کے قابل عزت ہی ہوتے ہیں مگر یہ غلط فہمی ہمیں ایک محدود المعلومات فرقہ میں ہے۔ بامر واقعی سب معترضین یہ نہیں سمجھتے کہ جس سرزمین میں کوئی رہتا ہے۔ اسپر اسی سرزمین کی آب و ہوا موثر ہوتی ہے۔ اور وہ اسی آب و ہوا کا دلدادہ اور مشتاق یا عادی ہے۔ اور بالخصوص جبکہ اس شخص کا مشرب ہی ویسا ہے تو پھر امید ہے یہ سمجھنے کے اسکے اصطلاحات پر اعتراض بالکل معیوب ہے۔

جو شاعر صوفی مشرب کے ہیں۔ یا جو صوفی شاعر ہیں۔ انکے کلام میں شاعری کا اکثر حصہ ان خاص اصطلاحات سے مملو ہے۔ جو صوفی مشرب میں مستعمل اور مروج ہیں۔ ایک عام شاعر یا ایک عام شخص ان اصطلاحات سے سوائے اسکے اور کوئی مطلب نہیں نکال سکتا۔ کہ انکے لفظی معانی پر حاوی ہو سکے۔

ہم اس بات کے قائل ہیں۔ کہ مذاق غالب ہمیشہ غالب ہوتا ہے۔ چونکہ ایسے لوگوں پر یہ مذاق صوفیانہ غالب ہوتا ہے۔ اسواسطے انکی شاعری یا انکی نظر ہمیشہ صوفیانہ مصطلحات میں رنگی ہوتی ہے۔ انکے اشعار یا دواوین میں جب زلف و خال اور نرگس و بلبل کا ذکر آتا ہے۔ تو لوگ معترض ہوتے ہیں اور انکے کلام کو نعوذ باللہ مخرب اخلاق اور نامہذب سمجھتے ہیں:-

ہاں یہ اعتراض اگر اس طرز سے ہوتا کہ "صوفیائے کرام نے ایسی گندی اصطلاحات کیوں رکھی ہیں۔ تو شاید کسیقدر قابل التفات بھی ہوتا۔ یہ کہنا کہ اس مشرب کے لوگ اپنی اصطلاحات میں کیوں کہتے ہیں۔ ایک فضول اعتراض ہے۔ جو شخص کسی مشرب کا پابند ہے۔ وہ اسکی اصطلاحات کا بھی تابع اور پابند ہوگا۔

(باقی آئندہ) (سلطان احمد) میانوالی پنجاب

مرحومہ مس میننگ

ہند کی خدمت میں کاٹی اُس نے ساری زندگی
وقف کردی راہِ حق میں اپنی پیاری زندگی

تھی تو عورت مگر کام ایسے کر گئی کہ مردوں میں بھی کسی کسی سے بن پڑتے ہیں - سات اوپر ستر برس کی عمر پائی - اور جب سے ہوش سنبھالا - خلقِ خدا کی بھلائی میں مصروف رہی اور جب پیامِ اجل آگیا تو اس سکون کے ساتھ کوچ کیا - جیسے کوئی ملازم شاہی مدت العمر کی کارگزاری کے بعد پنشن کے ساتھ رخصت ہوتے وقت ایک دم سرد کھینچتا ہے کہ "اب کچھ دنوں آرام [illegible] بہتر برس تک جو راحت و آسائش کے سامان میسر ہونے پر زندگی بھر دوسروں کی تکالیف میں شریک رہی - اب آرام میں ہے - اور حق یہ ہے کہ آرام میں ہو - کیونکہ ایسے خوش قسمت بہت کم ہیں جو دنیا سے اس طرح سبکبار جاویں - کسی کو بچوں کا تردد ہوتا ہے - کہ انکا کیا حشر ہوگا - خاوند کو بیوی کی فکر ہوتی ہے - اور بیوی کو خاوند کی - کسی کو عزیز و اقارب کا خیال ستاتا ہے کسی کو مال و دولت کا - مس میننگ کو عمر بھر ان علائق سے واسطہ ہی نہیں پڑا - ہاں "نیشنل انڈین ایسوسی ایشن" میں اُسکی جان لگی ہوئی تھی - اُس سے اسکو عشق تھا - اُسی کی رفاقت میں اسکی عمر کٹی - اور وہی اُسکے لئے بمنزلہ اولاد تھی -

مس میننگ کو گو خدا نے فارغ البالی دی تھی مگر دولت سے اُسکو محبت نہ تھی - دولت اُسکی نظر میں ذریعہ خیر تھی - جہانتک ہو سکا - اُسے نیک کاموں کے لئے استعمال کیا - اور چلتے وقت جو بچا - اُسے انہی کاموں کے لئے نذر کر دیا - تین لاکھ کیاسی ہزار آٹھ سو ستر روپیہ کا مال و اسباب اُسکے فیاض ہاتھوں سے بچ رہا تھا - اُسکے بیشتر حصے کو تقسیم کر گئی :- (خلاصہ وصیت)

(۱) نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کو - ہندوستان میں تعلیمی ترقی کی مدد کے لئے چھیالیس ہزار روپیہ

(۲) گرٹن کالج - کیمبرج کو لڑکیوں کی تعلیم کے لئے . . تیس ہزار روپیہ

(۳) تھی اسٹک چرچ (لندن) کو . . . . . پندرہ ہزار روپیہ

(۴) نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کو - ہندوستان میں تعلیم نسواں کی مد میں سات ہزار پانچ سو روپیہ

(۵) لندن کے مدرسۂ طبیہ نسواں کو . . . . . تین ہزار روپیہ

(۶) نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کی مختلف شاخوں کے لئے . . . نو ہزار روپیہ

(۷) سادھارن برہمو سماج - کلکتہ . . . . . . ایک ہزار پانچ سو روپیہ

(۸) انڈین ڈفرن فنڈ . . . . ایک ہزار پانچ سو روپیہ

اسکے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی خیراتی سوسائٹیاں ہیں جنکو ہزار ہزار ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپیہ وصیت میں دیا گیا ہے۔

انگلستان کو جہاں اور خوش قسمتی کے سامان افزوں میسر ہیں - وہاں یہ بھی ہے کہ اس میں بہت سے زن و مرد ایسے موجود ہیں جنکو معاش کی فکر سے نجات ہے اور اس فارغ البالی کے ساتھ اپنے ہموطنوں کو فائدہ پہنچانے کا شوق دل میں رکھتے ہیں اور اپنی عمریں رفاہ عام کے کاموں میں صرف کر دیتے ہیں - مس میننگ بھی اسی ممتاز اور قابل تعظیم جماعت میں سے تھی - ایسے کسی وجود کا دنیا سے اٹھ جانا در اصل دنیا بھر کے محدود سرمایۂ خیر میں کمی کا باعث ہوتا ہے اور اس پر ہر اہل دل کو افسوس لازم ہے - لیکن مس میننگ کا جانا ہندوستان والوں کے لئے خصوصیت سے رنج کا موجب ہے - کیونکہ انگلستان کے ان تمام مخیر لوگوں کی جماعت میں بہت ہی کم ایسے ہیں جنکو ہندوستان سے دلچسپی ہو - حالانکہ سب انگریز کم و بیش ہندوستان سے مستفید ہوتے ہیں اور ہندوستان کے جزو ممالک برطانیہ ہونے پر ناز کرتے ہیں - مس میننگ ان چند نادر الوجود لوگوں میں سے تھی - جنکی نظر میں ہندوستان کی سچی وقعت

اور جو اپنی حالت اور توفیق کے مطابق اُس نفع کا جو اہل انگلستان کو اہل ہند سے بلا واسطہ
یا بالواسطہ پہنچتا رہتا ہے کسیقدر معاوضہ دینا چاہتے ہیں۔ اور مسافر ہندوستان سے مروت کا سلوک
کرتے ہیں۔ چنانچہ مس میننگ نے ہندوستانیوں سے جو انگلستان میں وارد ہوں راہ و رسم بڑھانا
اُن کی راہ سے مشکلات رفع کرنا۔ اُن کو با اخلاق شرفا سے ملانا اور اُن کی تواضع کرنا اپنا فرض زندگی
منصبی قرار دے رکھا تھا۔ انڈین ایسوسی ایشن کی آنریری سکرٹری ہونے کے عہدے سے بھی یہ
امور اُنکے فرائض منصبی میں داخل تھے۔ مگر وہ اس فرض کو اسقدر شوق سے ادا کرتی تھی اور
اس طرح ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ملتی تھی۔ کہ یہ کام اُسکا ذاتی کام بن گیا تھا۔ اُسکا دروازہ ہر ہندوستانی کیلئے
کھلا تھا۔ خواہ وہ کسی مذہب کا ہو۔ کسی صوبے سے آیا ہو۔ کسی پولیٹکل پارٹی سے تعلق رکھتا ہو۔ اور
بھی لوگ ہیں جو ہندوستانیوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ مگر ایک محدود طریق پر۔ اگر صدیوں سے ہندوستان میں
انگریز رہے۔ تو جس صوبے میں رہے۔ اُس صوبے کے لوگوں سے زیادہ ملتے ہیں۔ اگر افسری
کی بو دماغ میں باقی ہوئی تو آزاد خیال آدمیوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ اگر کانگرس پارٹی کے رفیق میں
ہوئے تو انہیں کوئی پسند ہی نہیں آتا جب تک کہ کانگرس والا نہ ہو۔ مذہب اور علوم مشرقی کا ذوق ہوا
اپنا میلان کتب اسلامی کی طرف ہوا تو مسلمانوں کو ڈھونڈھتے ہیں۔ اور اگر ہندو لٹریچر سے آشنا
ہوں تو ہندوؤں سے ملنے کے شائق ہوتے ہیں۔ لیکن مرحومہ کے ہاں یہ سب قیود ناپید تھیں
اُسکے لئے سب یکساں تھے۔ جمعہ اور اتوار کو بعد دوپہر ہمیشہ گھر پر رہتی تھی۔ اور صلائے عام تھی۔
کہ جو چاہے آوے۔ لندن میں عموماً بُعد مقامی اسقدر ہے کہ ہندوستانی ایک دوسرے سے دور
رہتے ہیں اور ویسے بھی زیادہ ملتے جلتے نہیں۔ مگر مس میننگ کا گھر ایک مرکز تھا۔ جہاں ہر وقت
کسی نہ کسی نئے ہندوستانی سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ اور طرفہ یہ تھا کہ اُس کی ہمدرد طبیعت ہر ایک
کے حالات سے خاص دلچسپی رکھتی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی۔ کہ کسے کس کام سے دلچسپی ہے۔
اُس سے اُسی بارے میں بات چیت کرتی تھی کسیکو چٹھی سفارشی لینے کی ضرورت ہوتی تھی۔

تو اُنکے ملاقاتیوں کے وسیع حلقے میں سے جسکے نام چاہیں چٹھی مل سکتی تھی - کسیکو مشورہ درکار ہوتا تھا تو مشورہ حاضر تھا - اور جو شریف اخلاق کے برتاؤ کا بھوکا ہوتا تھا - اُسکے لیے وہاں حصہ وافر موجود تھا - چاء وغیرہ کی تواضع تو ہر وقت ہوتی تھی - لیکن اسکے سوا کبھی کبھی بڑی بڑی پارٹیاں قرار پاتی تھیں - جن میں تکلف سے خورد و نوش کا سامان مہیا ہوتا تھا - جہاں انگریز و ہندوستانی اکٹھے مل بیٹھتے تھے - یہ پارٹیاں کبھی ایسوسی ایشن کی معرفت ہوتی تھیں لیکن اکثر مس میننگ کے مکان پر - اُنکی جیب خاص سے دی جاتی تھیں -

جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے - یہ مرحومہ کی ہمدردی کے اظہار کی ایک عام صورت تھی - مگر اسکی خاص خاص ہمدردیوں کو بہت کم لوگ جانتے ہیں - کئی نوجوان ہندوستانی جب غریب الوطنی میں ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے یا کسی اور اتفاق سے حاجتمند ہو گئے - تو انہوں نے مس میننگ سے اپنا حال کہہ دیا - اور اُسنے چپکے سے انکی مالی امداد کر دی - بغیر اسکے کہ کسیکو خبر ہو - کئی بیمار ہوئے اور مرحومہ نے سن پایا کہ بیمار ہے - گلی کوچے کا پتہ پوچھتی پوچھتی پہنچی اور تیمارداری کر آئی - اور یہ اُس وقت کا ذکر ہے کہ جب پچھتر سے متجاوز سن تھا اور ضعف کے آثار نمایاں تھے - مگر اپنی ضعیفی - اور اپنی تکان کا خیال اُس کو کبھی کسی نیکی سے مانع نہیں ہوا -

نیشنل انڈین ایسوسی ایشن سے اُسکا تعلق قریب قریب اس مجلس کی بنا کے زمانے سے تھا - یہ مجلس ۱۸۷۰ء میں قایم ہوئی تھی - کیشب چندر سین (برہمو سماج کے مشہور سرگروہ) انگلستان میں بمقام برسٹل مس میری کارپنٹر کے ہاں مہمان تھے - ایک سال بعد لندن میں اس مجلس کی ایک شاخ کھولی گئی - اور مس میننگ کی سوتیلی ماں اسکی سکرٹری مقرر ہوئیں - اُنکا جلد انتقال ہو گیا - اور مس میننگ اُنکی جگہ مقرر ہوئی - ۱۸۷۷ء میں مس کارپنٹر بھی چل بسیں - اور ان چند سالوں میں مس میننگ نے لندن والی شاخ میں ایسی نمایاں

خدمت کی - کہ سب نے تسلیم کیا - کہ مس کارپنٹر کی جانشین مس مینگ ہی ہو سکتی ہے - لندن اور برسٹل کی مجلسیں ملا کر ایک کر دی گئیں - لندن مرکز قرار پایا اور مس مینگ آنریری سکریٹری مقرر ہوئی - اور اُس وقت سے لیکر مرنے سے چند ہفتے پیشتر تک وہ سرگرمی سے اس فرض کو انجام دیتی رہی -

مرحومہ کو ہندوستان سے دلچسپی نچپن تو سوتیلی ماں کے اثر سے ہوئی - جو ہمارے ملک کے حالات سے واقف تھی اور ایک کتاب "قدیم ہندوستان کی زندگی" کے نام سے لکھ چکی تھی - اس پر مس کارپنٹر کی مخیر لیڈی کی صحبت اور کشیب چندر جیسے مقناطیس شخص سے ملاقات - ان سب چیزوں نے اُسکی اثر پذیر طبیعت کو ہندوستان کا دوست بنا دیا - اُسنے دو دفعہ اپنی معلومات بڑہانے - ہندوستانیوں سے میل جول پیدا کرنے اور خصوصاً ہندوستانی مستورات سے تعلقات پیدا کرنے کی غرض سے ہندوستان کا سفر کیا - ایک دفعہ ۱۸۸۸ء میں اور پھر ایک دفعہ کوئی دس سال بعد - بہت سے شرفا کے گھروں میں گئی - بہت خواتین سے ذاتی محبت پیدا کی - کئی اب تک اُس سے خط کتابت رکھتی تھیں اور کئی پردہ داروں کی تصویریں وہ اپنے دل میں لائی تھی -

مس مینگ معتقدات پاکیزہ رکھتی تھی - خدائے واحد کی مُقر تھی - اسی لیے اُسکی وصیت میں مذہب کے نام پر جو روپیہ دیا گیا ہے - وہ کسی تثلیث کے گرجے کے حصے میں نہیں آیا - اور برہمو سماج کے حصے کا تھوڑا سا روپیہ بھی یہ بوچھو تو - توحید کی گواہی یا کشیب جیسے موحد کے اثر کا اظہار شکر ہے - اسی لئے اُسکے ہاں مذہب کی گفتگو نہیں سننے میں آتی تھی - وہ چاہتی تھی - کہ جو ہندوستانی یہاں آئیں وہ اپنے مذہب میں پختہ رہیں - اور اس لئے بعض نوجوانوں کو ایسے انگریز صاحبان سے جن کے مزاج میں تثلیث کی اشاعت کا شوق غالب ہے - ذرا الگ رہنے کی چپکے سے نصیحت

کر دیا کرتی تھی۔ جس سے اُسکا خلوص اور ہندوستانی نوجوانوں کی سچی خیرخواہی ثابت ہوتی تھی۔

اُسکے ہاتھ سے ایک رسالہ نکلتا تھا جس سے ہندوستان میں اکثر لوگ آشنا ہیں۔ یعنی انڈین میگزین اسمیں گذشتہ سالوں میں بعض بہت دلکش مضامین چھپے ہیں جنکے ذریعے سے انگلستان میں ہندوستان کے حالات کی نسبت سیف ہجس کا شوق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو لیکچر مس مینگ کی مدد سے صاحبان سوسائٹی کے جلسوں میں پڑھے گئے وہ بھی اس رسالے میں چھپا کرتے تھے۔ گذشتہ اگست ستمبر اور اکتوبر کے نمبر اس رسالے کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔ اگست کے پرچے میں یہ خبر چھپی کہ بوجہ بیماری مس مینگ استعفا دینے پر مجبور ہوگئی۔ اسکو پڑھ کر اُسکے دوستوں کو رنج ہوا۔ ستمبر کا رسالہ خبر مرگ لایا۔ کیونکہ ۱۰۔ اگست کو وہ راہی عالم بقا ہوئی۔ اور اکتوبر کا رسالہ یادگاری پرچہ ہے۔ جسمیں سوائے اُسکے مختصر حالات زیست اور اُسکے چند احباب کی طرف سے نوحہ خوانی کے اور کوئی مضمون نہیں ہے۔ اس سے بڑھکر اُسکی بے غرض اور بے لاگ زندگی پر روشنی ڈالنے والی کوئی چیز نہیں کہ مختلف مذاہب اور مختلف پولیٹکل جماعتوں کے لوگ اسکی مدح میں ہمزبان ہیں اور جو نام بہت کم یکجا دیکھے گئے ہیں وہ "انڈین میگزین" بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۵ء کے سرورق پر ایک دوسرے کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں۔ ذیل کی فہرست ملاحظہ ہو۔

مسٹر ایم۔ ایم۔ بھاونگری (ممبر پارلیمنٹ)۔ سید امیر علی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ سر جارج برڈ وڈ۔ لیڈی لائل۔ مسٹر دادا بھائی نوروجی۔ عبد القادر۔ مسٹر پریٹ۔ مسز ناٹ۔ مس بل۔ مس ڈیویز۔

ہے یہی جینا وہ جینا جس پہ آتا رشک ہے اور اسی مرنے پہ ہر کوئی بہاتا اشک ہے

گو ایسوسی ایشن کی بنیاد محکم پڑ چکی ہے اور امید قوی ہے - کہ اُسکا مفید کام جاری رہیگا خصوصاً اِس لئے کہ آنریری سکرٹری کی حیثیت سے مِس میننگ کا جُوا مسز آرنلڈ کے کندھوں پر پڑا ہے - جو ہمارے ہردلعزیز دوست پروفیسر ٹی - ڈبلیو - آرنلڈ کی بیوی ہیں - اور ہندوستان کے حالات سے پوری واقف اور ہندوستانیوں کی ہمدرد ہیں - تاہم اِس میں شک نہیں کہ مِس میننگ کی کمی زمانہ مدتوں تک پوری نہیں کر سکیگا - اور آنکھیں برسوں اُس کی نگاہ بہ وجود کو ڈھونڈھا کریں گی - اور اسکی خدمات کے قدردان جب کبھی اُسے یاد کریں گے اشکبار ہو ہو کے اُسکے لئے دعائے خیر کرینگے - (مِس میننگ کی تصویر باجازت ایڈیٹر صاحب انڈین میگزین شکریہ کے ساتھ ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے)

عبدالقادر

حاصلِ الفت مصیبت کے سوا کچھ بھی نہیں — رنج ہجر و درد فرقت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ نظر آتا ہے امیدوں کا باغ پُر بہار — خار زار یاس و حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں
جامِ صہبائے محبت کی نہ کر تا آرزو — ساغر زہراب عبرت کے سوا کچھ بھی نہیں
[illegible] کچھ نہیں تیری تمنا کے سوا — جان میں تیری محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
دھیان میں دل میں تصور میں نگاہوں میں مری — تری پیاری پیاری صورت کے سوا کچھ بھی نہیں
عکس عالم میں سبب حیرت ہے انساں کیلئے — آئینہ خانے میں حیرت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور ہی ہوتے ہیں کچھ اللہ کے بندوں کے ڈھنگ — شیخ صاحب میں مشیخت کے سوا کچھ بھی نہیں

ہے قیام زندگی **نیرنگ** اسی آزار سے
اپنی ہستی درد الفت کے سوا کچھ بھی نہیں

نیرنگ

جانِ شیریں

ذیل کی نظم کا انداز بیان اور طرز خیال خود کہہ دے گا کہ انگریزی نظم سے کھینچی گئی ہے سوال وہی ہے جسکو انسان ہمیشہ سے کرتا آیا ہے اور جسکا جواب اس نے ہمیشہ یہی پایا ہے ایک گو مگو ہے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا تو بس کہ کچھ نہ جانا ہم نے۔ جو کچھ معلوم ہے وہ یہ ہے شعر میں ہے پہلی بات قبرستان کی تک۔ دوسرے چوتھے بند میں ... اصل سے تسکین کی گئی ہے اور پانچویں بند میں مسئلہ تناسخ سے۔ آخری بند ناچاری کا تصور ہے اور ایک آرزوئے محض کا اظہار:—

(نیرنگ)

اے جانِ عزیز! جانِ شیریں!	معلوم نہ ہو سکا تو کیا ہے؟
معلوم ہے بس یہی کہ تجھ سے	ہونا مجھے ایک دن جدا ہے
پوشیدہ رہا یہ راز لیکن	کچھ کھل نہ سکا یہ بھید کیا ہے؟
کب۔ کس جگہ۔ اور کس طرح سے	مجھ سے ترا وصل ہو گیا ہے؟

جب چھوڑ کے تن کے آشیاں کو	کر جائے گی تو کہیں کو پرواز
میرے اس سر کو دست و پا کو	رکھ دیں کہیں خواہ میرے ہمراز
کیا قدر رہے گی اس بدن کی	مٹ جائیں گے سب ادا و انداز
یہ حسن ہے وصلِ جسم و جاں تک	ہیں تیرے ہی دم سے عشوہ و ناز

اُڑ کر جائے گی کس طرف تو؟	ہو گا کس باغ میں بسیرا؟

سُوجھے گا نہ تیرا راستہ بھی — نقشِ پا کا تو ذکر کیا تھا
اِس طور سے مجھ میں اور تجھ میں — ہوگا جب تفرقہ بپا
ڈھونڈوں پھر کس جگہ میں جا کر — اس چیز کو میں ہے نام جس کا؟

قیدِ تنِ نفس سے چھوٹ کر — اور توڑ کے عنصری زنداں
اُس نور کے بحرِ موجزن میں — جس کا نہ کنارہ ہے نہ پایاں
تو جس کا ہے ایک قطرہ گویا — تو جس کی ہے مبتلائے ہجراں
کیا ہوگی فنا اسی میں جا کر؟ — کیا وصل کے ہوں گے پورے ارماں؟

یا چھپ کے نگاہِ راز جو سے — پردے میں عدم کے ہوگی مستور
جیسے کوئی راہ سے بھٹک کر — جادو کے حصار میں ہو محصور
برسوں تک منتظر رہے گی — تا قیدِ طلسم تجھ سے ہو دُور
اور کتمِ عدم سے پھر نکل کر — صہبائے وجود سے ہو مخمور

جائے گی کہاں یہ عقل یہ فکر؟ — جذبات و حواس کیا نہ ہوں گے؟
دل جس کو ہے ان سے اس قدر اُنس — کہتا ہے کہ یہ فنا نہ ہوں گے
بتلا جب تو ہی تُو نہ ہو گی — کیا ہوں گے یہ اور کیا نہ ہوں گے؟
ہم تم ہیں رفیقِ رنج و راحت — سب اشکِ الم جدا نہ ہوں گے

ہوکر ہی رہے گی یہ جدائی — ٹلنے کا نہیں یہ وقتِ فرقت

یہ تفرقہ جب اٹل ہی ٹھیرا — بے سود ہے شکوہ و شکایت
اچھا بس کوچ کر یہاں سے — یہ بھی نہ بتا کہ کب ہے رحلت
دل میں جب تیرے آئے جاوے — جو تجھکو پسند آئے ساعت
مت کہہ مجھے اَلفِرَاق اَلبَین! — دکھلا مت رُوئے شامِ غربت
کل صبحِ وطن کو شادو خنداں — ملنا مجھسے بصد مسرت!

نیرنگ

نمود شام

ہمارے لطف فرما حضرت **طالب** بنارسی نے چند نظمیں ہمارے پاس بغرض اشاعت بھیجی ہیں اور انکے ساتھ ہی ایک خط میں یہ لکھا ہے کہ "میں یہ چار نظمیں دہقان - خواب جنت - طاعت الٰہی - نمود شام آپکی خدمت میں بھیجتا ہوں - گو یہ نظمیں پہلے شایع ہو چکی ہیں لیکن میری آرزو یہ ہے کہ میرا کلام تازہ اور پرانا سب مخزن میں جمع ہو جائے"

چنانچہ ہم ان دلچسپ اور قابل قدر نظموں سے اپنے ناظرین کو محروم رکھنا نہیں چاہتے اور ان میں سے ایک نظم آج ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں -

اے شام خوش آئند مبارک تیرا جلوہ — مہماں گھڑی بھر کی تو اندک تیرا جلوہ
ہے عالمِ اسباب میں جب تک ترا جلوہ — ہے چشمۂ خورشید پہ چشمک ترا جلوہ
آرام وہ قلب ہے تسکینِ جگر ہے
تو دل میں سویدا ہے تو آنکھوں میں نظر ہے

زنجیرِ مسلسل ہے تو ہی صبح و مسا کی — تفسیر حسینوں کے خط و زلفِ دوتا کی
تمہید ہے تسکین کی تردید جفا کی — دیباچۂ شب، خاتمہ ہے روزِ بلا کی
تو ہستیِ موہوم کی عبرت کا سبق ہے
دنیا میں شب و روز کی حکمت کا سبق ہے

دنیا کے ہر اک گوشے میں میدان خلا میں — اجرام میں اجسام میں اختر میں سما میں
دریا میں پہاڑوں میں جزیروں میں ہوا میں — القصہ ہر اک چیز کے دوران بقا میں
اس شام کی تاثیر فسوں چھائی ہوئی ہے
ہر آن میں تسخیر سکوں آئی ہوئی ہے

یہ وقتِ طرب خیز امیروں کے لئے ہے — ہنگام بلا خیز فقیروں کے لئے ہے
یہ عافیت آمیز اسیروں کے لئے ہے — مبدا یہ شرارت یہ شریروں کیلئے ہے
یہ شام ہیولیٰ ہے شب رنج و طرب کی
پیری ہے اگر دن کی تو طفلی ہے یہ شب کی

خورشید سے چہرہ مہ پرنور نے بدلا — آئینِ جہاں قدرتِ موفور نے بدلا
رنگ آ کے غرض نور سے دیجور نے بدلا — کچھ اور سماں جلوۂ مستور نے بدلا
سورج کی جگہ نور کے ٹکڑے نظر آئے
مہتابیوں پہ چاند کے ٹکڑے نظر آئے

معشوق ہوئے عشوہ نما آ کے لبِ بام — دکھلانے لگا قدرتِ حق جلوۂ اصنام
مسجد کی طرف جانے لگے پیروِ اسلام — گلشن میں ہوا کھانے گئے سرو گل اندام
مے خانوں میں رندوں کی ایاغوں سے لگی ہے
پروانوں کی لو جا کے چراغوں سے لگی ہے

دن بھر کی مشقت سے فراغت ہوئی سبکو — محنت سے چھٹے فرصت و راحت ہوئی سبکو
تفریح و تماشے کی ضرورت ہوئی سب کو — معشوق و شب وصل کی حسرت ہوئی سبکو

گردوں پہ شفق کا یہ ہوا حال خوشی سے
تھا زرد جو پہلے وہ ہوا لال خوشی سے

آیا شب تار کے جو اقبال پہ ادبار — آنکھوں نے کہا فاعتبروا یا اولی الابصار
نیرنگیٔ عالم کا یہی رنگ ہے ہر بار — یاں گرم ہمیشہ نہیں رہتا کوئی بازار

خورشید کا بھی شام کو جب پا نہیں رہتا
حال ایک سا دنیا میں کسی کا نہیں رہتا

کیا وقت سہانا ہے بیاں ہو نہیں سکتا — دن رات میں یہ لطف عیاں ہو نہیں سکتا
اس وقت کا کوئی اور سماں ہو نہیں سکتا — نہاں یہ کسی دل پہ گراں ہو نہیں سکتا

وہ ساعت گل گشت وہ فرحت کی گھڑی ہے
شبنم کو بھی گلزار میں گرنے کی پڑی ہے

چوپائے چراگاہ سے چر کے چلے آئے — جو کام پہ تھے سب لوگ وہ کر کے چلے آئے
سائے سر دیوار سے سرک کے چلے آئے — چلتا ہوا دن شب کے بسر کے چلے آئے

تارے کھلے۔ تاریکی بڑھی۔ چھائی سیاہی
پھرنے پہ کھڑے ہو گئے انجم کے سپاہی

ہے یاد الٰہی کی گھڑی۔ وقت نماز اب — ہے عابد و معبود میں اک راز و نیاز اب
ہے شمع و پروانے میں اک سوز و گداز اب — سب کام ہوئے بند۔ در توبہ ہے باز اب

مطلوب کے۔ معبود کے ملنے کی گھڑی ہے
یہ عاشق و معشوق کے ملنے کی گھڑی ہے

آمد ہے شب تار کی ہے روز کی رخصت ہے جلوۂ خورشید جہاں سوز کی رخصت
افکار جہاں - رونق غم اندوز کی رخصت شب بھر کو ہے اب محنت دل دوز کی رخصت
بشاش ہیں سب غنچۂ دل سب کے کھلے ہیں
بیمار بھی اٹھ بیٹھے کہ دو وقت ملے ہیں

روشن ہے مکان شان امارت سے کسی کا جلتا ہے جگر رنج فلاکت سے کسی کا
ناشاد کلیجا غم و حسرت سے کسی کا مسرور ہے دل فرط وصلت سے کسی کا
غمگیں کوئی دل شاد کوئی در طرب ہے
اک خوش ہے تو اک رنج میں ہے آمد شب ہے

ہے وصل میں یہ خوف کہ تکرار نہ ہو جائے وہ جنگ جو آمادۂ پیکار نہ ہو جائے
آغوش میں سویا ہوا بیدار نہ ہو جائے گھر جانے کو پہلے ہی سے تیار نہ ہو جائے
جاں آج سر شام سے مشکل میں پڑی ہے
جی چھوٹتا ہے اوہام سے گو رات بڑی ہے

جو ہجر کا مارا ہے اسے رات بلا ہے گیسو کی طرح وہ بھی اک الجھن میں پڑا ہے
فرقت میں سر شام سے اک حشر بپا ہے بیمار جدائی کے لئے شام عزا ہے
یہ شام اسے شومی شامت سے نہیں کم
ہے شام مگر صبح قیامت سے نہیں کم

(طالب بنارسی از بمبئی)
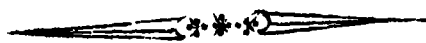
عید سعید

مخزن کے صدر مقام (لاہور) میں اس سال حسن اتفاق سے ایک ہی دن دو عیدیں ہوئی تھیں - یعنی ۲۰ - نومبر ۱۹۰۵ء کو عید الفطر بھی تھی - اور حضور شاہزادہ ویلز دام اقبالہ بھی بہ ورود اس شہر میں رونق افروز ہوئے - ان دو عیدوں کے اجتماع سے جو عالمگیر خوشی - جو رونق - جو چہل پہل شہر میں تھی وہ دیکھنے ہی کی تھی - ایک عجیب حسن اتفاق یہ ہے کہ دربار تاجپوشی حضور شہنشاہ ہند ایڈورڈ ہفتم بھی عید فطر کے روز ہوا تھا - گویا حضور ملک معظم اور انکے خاندان کے اقبال اور عید مبارک کا چولی دامن کا ساتھ ہے - اس مسرت کے موقع پر بہت سی نظمیں آئی ہیں - ایک تو ہمارے کرم فرما جناب خواجہ شہباز ڈاکٹر محمد نعیم (بھوپال) کی ظرافت بھری نظم ہے اور دو نہایت شاداب نظمیں حضرت تاب کی ہیں - ہم ان نظموں کو عید کے تحفے کے طور پر نہایت خوشی سے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں -

عید کی خوشی

جاتا ہے خانۂ کعبہ کو پیرِ خوش رمضاں — آرہی عید ہے مے خانے کو خنداں خنداں
عید کہتی ہے کہ کعبے کو تو اے شیخ نہ جا — سنگِ اسود بھی ہے بت - کرلے یہیں طوف بتاں
آبِ زمزم کی نہ کر چاہ - تو یاں بھی ہیں بہت — کھاری لذت کے کنوئیں - شورمزہ باولیاں
دل کو رغبت ہے اگر اونٹوں کے شتر غمزوں سے — تو یہاں بھی ہے یہ مخلوق بہت غمزہ کناں
اور منظور نظر گر ہے گدھے پر چڑھنا — قحط کچھ ان کا نہیں - یاں بھی گدھے ہیں ارزاں
سنتے ہی اسکے ہوئے آپے سے حضرت باہر — ایسی باتوں کی بھلا تاب بزرگوں کو کہاں

ہوتی ہے نمازوں کی شلک ؟ یا کہ فلک تک — پہونچاتی ہے خوشنودیٔ خالق کی خبر عید
بے فیضی پہ اللہ رے کیا اوس پڑی ہے — ہر قطرۂ شبنم کو بناتی ہے گہر عید
پھل پاتے ہیں دیندار ریاضت کے یہیں کا — وہ ہے شجر گلشن جنت کے ثمر عید
کس شیریں زبانی سے گلے ملتے ہیں سب لوگ — ہر مفلس و زردار سے ہے شیر و شکر عید
وہ مومن و دیندار تھے جو قایم و تسلیم — ہے اُن کے لئے آج حقیقت میں مگر عید
طاعت سے مسلمانوں کی اللہ بھی خوش ہے — مسجد میں نمازی ہیں کہ احمد کے گھر عید
دنیا کے دلوں سے اُسے کہ دیتی ہے باہر — لیتی ہے غم دہر کی کیا خوب خبر عید

(سراپائے عید سعید)

(یعنی - ع - ی - د)

ہے عین سے ہر عید مگر عین سعادت — کیوں دیدۂ عالم کو ہو منظور نظر عید
تحتانی جو ہے عید میں اُس سے یہ عیاں ہے — باندھے ہوئے ہے عدو - دوست کے ملنے پہ کمر عید
ہے دال بھی یوں دال کہ اس دیر جہاں میں — ہے مطلعِ انوار کی بنیاد مگر عید

مل جائیں ہم ساغر و مینا بھی ذرا آج — رکھے نہ کہیں بال برابر بھی کسر عید
یہ روز خوشی ہوتا ہے کب روز میسر — باسی بھی جو ہو جائے تو ہے تازہ و تر عید
اِک دن کی خوشی ہوتی ہے یکتائے زمانہ — بن جائے محرم رہے دس روز اگر عید
دل شاد ہوئے خلق کی آنکھیں ہوئیں روشن — ہے دیدۂ بینا کے لئے کحل بصر عید

اللہ سے دن رات یہ طالب کی دعا ہے
مخزن کو مبارک رہے ہر شام و سحر عید

(طالب بنارسی از بمبئی)

ملے عین - عید کا عدو + ملے دال - عید کا - دوست +

لوازم شاعری

بہت ہیں نظم کے باب میں مختلف آئیں — کسی کا قول ہے کچھ اور کسی کا کچھ دعوا
کوئی تو کہنہ روش کو پسند کرتا ہے — کسی کی طبع ہے طرز جدید کی شیدا
ہماری رائے ہے اس باب میں جو کچھ — خلاصہ اسکا ہم اس جا بیاں کرتے ہیں ملا
مقدم اسمیں ہے خود شاعروں کی پہچان یہ — کہ شاعری سے موزوں ہے کسکو نا زیبا
تو حق یہی ہے کہ شاعر ہو فطرتی شاعر — جو کسب کے ہو جوش اسکے دل میں بھرا
طبیعت اسکی ہو ایسے اختیار مائل نظم — بنے سر میں کاکلِ مشکینِ نظم کا سودا
تعلق اسکا ہو طبعی کلام موزوں سے — کہے جو شعر تو سامع کی بھی نہ ہو پروا
غرض سے پاک ہو یہ عشق فطرتی اسکا — کہے بغیر نہ چین آئے طبع کو اصلا
دروس علم سے بھی باخبر ہو حتی الوسع — فنونِ شعر پہ حاوی ہو اسکی وسیع رسا
علاوہ علم کے ادراک میں بھی تیزی ہو — رہیں بیاں کے نتیجے پہ اسکی آنکھیں وا
ضرورتوں سے بھی آگاہ ہو زمانے کی — مذاقِ ملک سے بھی بےخبر نہ ہو اصلا
میسر آئی ہو سب طرح کی اُسے صحبت — ملا ہو سب ادانی سے لیکے تا اعلا
طبیعت اُسکی تعصب سے اجتناب کرے — گداز ہو دلِ عاشق مزاج بھی اُسکا
ہو اختلافِ مذاہب پہ بھی نظر حاوی — خصوص ہو فنِ تاریخ میں یدِ طولیٰ
تو ایسے شخص کو لازم ہے شاعری کرنا — رہے وہ غرق جو تکمیل میں تو ہے زیبا
یہ نعمتیں جسے دی ہوں خدا نے از رہِ فضل — اگر وہ اسمیں ریاضت کرے تو ہو یکتا
مگر بہت سے ہیں اس راہ میں خس و خاشاک — ہو دیکھ بھال کے وادیِ نظم میں پویا

وہ الفاظ ترک کیا ہو جسے فصیحوں نے — بجائے نشۂ بالفتح جس طرح سے نشا
تو ایسے لفظ کا حکماً بہت ضرور ہے ترک — لگے نہ تاکہ فصاحت میں نظم کی دھبّا
بعینہ یہی حالت ہے ایسے لفظوں کی — کہ جنسے کچھ نہیں مطلب رعایتوں کے سوا
چلے عبارت اردو میں اہل فارس کی چال — کہ تا نہ صورت ظاہر ہو اسکی نازیبا
کئی زبانوں سے ملکر بنی ہے تو اردو — زیادہ اس میں فقط فارسی ہے یا بھاشا
زبان فارس کی تحصیل سب سے اقدم ہے — بغیر اسکے کوئی اسکو کہہ نہیں سکتا
بہت ضرور ہے اردو کو فارسی دانی — نہ جیسا نتا ہو جو بھاشا تو کچھ نہیں پروا
جدا کرے بھی اگر کوئی فارسی سے اسے — یہ لاعلاج تعلق مٹا نہیں سکتا
اسی لئے ہے تتبع بھی فارسی کا ضرور — خراب ہوگا بغیر اس کے نظم کا خاکا
مگر تتبع لفظی کی صرف حاجت ہے — کچھ اسقدر نہیں لازم تتبع معنے
جہاں زمانے سے مری بیگانہ اس فن میں — مجھے پسند ہے انداز اصل یورپ کا
قلم سے لیتے ہیں وہ لوگ موقلم کا کام — اتار لیتے ہیں گویا وہ ہو بہو نقشا
مبالغہ ہے نہ اغراق انکے مضموں میں — وہ صنعتیں نہیں جو واقعی ہیں بے سروپا
وہ جانتے نہیں الٹی کا نام کر دینا — جسے سمجھتے ہیں معراج اور یہاں کے سب شعرا

(باقی آیندہ)

علی محمد شاد

ترجمہ اینک آرڈن

آخر آیا اک انقلاب اور	جیسا کہ ہے جہان کا طور	اُس پورٹ سے پانچ کوس ادھر	قائم ہوا اک جدید بندر

تازہ غزلیں

دیکھا مگر وہ تنکے اُدھر اور زیادہ
کھنچنے ہی سے بڑھتی ہے نظر اور زیادہ

دو گھونٹ ہو جو مزا آ گئے ہمیں بھی
تھم تھم کے بڑھے ہے دردِ جگر اور زیادہ

جز بھر نہ ہو تر بھر میں دو لگتا نہیں ساقی
کم تو نہیں تھوڑی سہی مگر اور زیادہ

جتنی وہ بجھاتے ہیں محبت کی نظر سے
اُتنی ہی بھڑکتی ہے اُدھر اور زیادہ

اسواسطے کہتے تھے کہ شاعر نہ لگا دل
لے اور کسی شوخ پہ مر اور زیادہ

آغا شاعر دہلوی قزلباش

بلا کے پُر اثر مجھ عاشق تفتہ کے نالے ہیں
شبِ فرقت مری آنکھوں نے پتھر پھونک ڈالے ہیں

انہیں ہے ناز دلداروں میں ہم سب سے انوکھے ہیں
ہمیں دعوی ہے جانبازوں میں ہم سب سے نرالے ہیں

بیاں کیا ہو سکے عالم تمہارے حسن زیبا کا
یہ قدرت نے اعضا نور کے سانچے میں ڈھالے ہیں

نگاہ شوخ میں پنہاں ہزاروں فتنہ و شر ہیں
یہ خاموشی یہ کہتی ہے کہ گویا بھولے بھالے ہیں

بچا لے اے صنم اپنی مسیحائی کے صدقے سے
ترے بیمار غم کو پڑ رہے اب جان کے لالے ہیں

فنا فی العشق ہیں آزاد ہیں قیدِ شریعت سے
حقیقت میں یہی بندے ہیں جو اللہ والے ہیں

وہ چھپٹا اُدھر لپکا اسے لوٹا اُسے مارا
تمہارے دست سرکش نے بہت پاؤں نکالے ہیں

[illegible] قتل تو نے آج کس حسرت کے مارے کو
ترے کوچے میں قاتل ہر قدم پر خوں کے تھالے ہیں

[illegible] کیا ہمسری لالے کے دھبوں کو
کہ ہر موسم میں یاں ہم جگر کے زخم آلے ہیں

[illegible] اسکی تم گلریز کیا جانو
وہی جانیں کبھی جنکو پڑے اُس بت سے پالے ہیں

(میر اظہار حسین گلریز [illegible]ابادی

ممیرے کا سرمہ

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل اگزامینر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسروں نامور ڈاکٹروں والیان ریاست ولایت کی یونیورسٹی کے سند یافتہ یورپین ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ یہ سرمہ امراض ذیل کیلئے اکسیر ہے ضعف بصارت تاریکی چشم۔ دھند۔ جالا۔ پڑبال۔ غبار۔ ڈھلکی۔ سرخی۔ پھولا۔ ابتدائی موتیا۔ ناخنہ۔ پانی بہنا۔ خارش وغیرہ معزز ڈاکٹر حکیم ہنجار اور اودیچہ آنکھ کے مریضوں پر اب اس سرمہ کا استعمال کرتے ہیں چند روز کے استعمال سے بینائی بہت بڑھ جاتی ہے اور عینک کے استعمال کرنے کی حاجت نہیں رہتی بچے سے لیکر بوڑھے تک کو یہ سرمہ یکساں مفید ہے قیمت اسلئے کم رکھی ہے کہ عام وخاص اس سرمہ سے فائدہ اٹھا سکیں قیمت فی تولہ جو سال بھر کیلئے کافی ہے مبلغ عہ دو روپیہ ممیرے کا سرمہ سفید اعلےٰ قسم فی تولہ مبلغ سے تین روپیہ۔ خالص ممیرہ فی ماشہ عہ مصری سرمہ فی تولہ ۱۲ خرچ ڈاک بذمہ خریدار۔

المشتہر پروفیسر میا سنگھ اہلووالیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور

ان سے بڑھکر اور کیا معتبر شہادت ہوسکتی ہے

(۱) میں نے ممیرے کا سرمہ سردار میا سنگھ اہلووالیہ نے تیار کیا ہے ان مریضوں پر کہ جنکی آنکھیں بہت کمزور اور بیمار تھیں استعمال کرکے دیکھا مفید پایا میری رائے میں خاصکر ان مریضوں کے واسطے جن کی آنکھوں سے پانی جاری رہتا ہے۔ اور دھند۔ غبار۔ کمزوری نظر ہو بہت نہایت ہی مفید ہے۔

راقم

ڈاکٹر بیج لال گھوش، ایم اے ایل ایم۔ ایس اسسٹنٹ سرجن پروفیسر میڈیکل کالج لاہور و آنریری سرجن گورنر جنرل ہند

(۲) میں اس امر کی بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ میں نے ممیرے کا سرمہ جو کہ سردار میا سنگھ اہلووالیہ نے تیار کیا ہے اپنے زیر علاج کئی ایک قسم کے مریضوں پر استعمال کیا۔ میری رائے میں بینائی قائم رکھنے اور آنکھوں کی بیماریوں سے بچنے کے لئے ممیرے کے سرمہ کا استعمال بہت مفید ہے۔

راقم

خان بہادر ڈاکٹر سید امیر شاہ ایل ایس اسسٹنٹ سرجن پروفیسر میڈیکل کالج لاہور۔

پانچ ہزار روپیہ انعام

اگر کوئی شخص ممیرے کے سرمہ کی سندات میں سے جو کہ قریب بیس ہزار کے ہیں ایک کو بھی فرضی ثابت کر دے اسکو مبلغ پانچہزار روپیہ کا انعام دیا جائیگا۔ [illegible] کے پنجاب بنک میں اسی مطلب کے لئے [illegible] جمع کیا گیا ہے۔

وکیل اور زمیندار کا قصہ

کسی گاؤں میں ایک سادہ لوح و غریب زمیندار رہا کرتا تھا۔ ایک دن اسے شہر جانے کا اتفاق ہوا جہاں وہ ایک مشہور وکیل سے ملا اور پوچھا کہ مالدار بننے کی کوئی راہ بتلاویں۔ وکیل نے اپنی فیس لے کر ایک بند لفافہ زمیندار کے حوالے کیا۔ گھر میں آکر شام کے وقت زمیندار نے لفافہ کھولا۔ تو لکھا تھا:-

جو کام آج کر سکتے ہو اُس کو کل پر مت ڈالو

زمیندار کا ہزاروں من چارہ باہر کھیت میں پڑا تھا۔ فوراً اس کو گھر لا کر مکان کے اندر رکھوا دیا۔ رات کو طوفان آیا اور بارش موسلا دھار ہوئی۔ جن لوگوں کا چارہ باہر تھا۔ سب بہ گیا۔ اسکے سارے گاؤں میں صرف زمیندار ہی بشاش تھا۔ طاعون کا طوفان بارش کے طوفان سے بدرجہا خوفناک ہے۔ جو لوگ زمیندار کی طرح خوش و خرم و بے فکر رہنا چاہتے ہوں۔ اُن کو طاعون کی دوا ہر وقت گھر پر رکھنی چاہیئے۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ کسی مریض نے ہماری دوا کا استعمال کیا ہو اور وہ راضی نہ ہوا ہو۔ یا کسی تندرست آدمی نے اسکا تھوڑا تھوڑا استعمال کیا ہو اور وہ طاعون کا شکار ہوا ہو۔

۱۔ دوائی طاعون ہزاروں جانیں بچا چکی ہے قیمت دو روپے فی شیشی

۲۔ خضاب یعنی تیل پھلیل کے لگایا جاتا ہے سفید بالوں کو سیاہ بھونرا کر کے اصلی رنگت دیتا ہے۔ بالوں کو ریشم جیسے نرم رکھتا ہے۔ جلد پر داغ نہیں دیتا۔ قیمت دو روپے (عہ)

۳۔ روغن و گولیاں۔ ان کے استعمال سے بال ہمیشہ سیاہ رہتے ہیں۔ اگر سفید ہو گئے ہوں تو بھی آہستہ آہستہ سیاہ ہو جاتے ہیں (عہ)

۴۔ گلگونہ۔ چہرہ سے جھریاں۔ چھائیاں سیاہ داغ و کیل دور کرتا ہے خوبصورتی کے واسطے لازمی ہے قیمت (عہ)

۵۔ دوائی بواسیر۔ بواسیر خونی ہو یا بادی مسّے اگر ہوں تو بلا تکلف گرا دیتی ہے شرطیہ شفا قیمت (عہ)

۶۔ مفرح النساء۔ عورتوں کی سب بیماریوں کے واسطے اکسیر ہے قیمت (سے)

۷۔ روغن کان۔ بہرے ہوں بہتے ہوں۔ درد سائیں سائیں یا طرح طرح کی آوازیں آتی ہوں فوراً آرام ہوتا ہے قیمت (عہ)

۸۔ سرمہ ممیرہ۔ دھند غبار۔ لالی۔ پڑوال۔ جالا۔ ناخنہ۔ وغیرہ کے واسطے اکسیر۔ موتیا بند کے واسطے مفید امریکہ و جرمنی تک مشہور (عہ)

۹۔ بال اگانے کا تیل۔ بلا تکلف دو تین ہفتہ میں بال دار ہوں قیمت ۸ فی شیشی (محصول ڈاک بذمہ خریدار)

ملنے کا پتہ: ڈاکٹر کیسر سنگھ ایم۔ اے بکرم ہسپتال فیروز پور شہر (پنجاب)

آئینۂ داغ

اردو ہے جسکا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اسمیں علاوہ فصاحت زبان حال کے ہر دلعزیز مقبول عام فصیح استاد زبان اردو کے سب سے بڑے محسن دہلی کے حضرت کل حالات اور معرکۃ الآرا اشعار آپکو ملیں گے بلکہ ہر حصہ ملک میں مرحوم داغ کا پورا مرقع آنکھوں کے سامنے آجائیگا۔ داغ مغفور کے چبھتے اور پھڑکتے ہوئے اشعار کے ساتھ ہی اکثر مشاہیر شعرا مثل ذوق، غالب، مومن وغیرہم کا کلام بھی مختلف طبائع و اصناف سخن کا رنگ دکھانے کے لیے درج ہے۔ غدر سے پہلے قلعہ معلی کے مشاعروں میں حضرت داغ کی شرکت۔ ہز ہائینس نواب رامپور کی قدردانی کلکتہ کا سفر۔ حیدرآباد دکن کا قیام۔ حضور نظام کی بے اعزازی [illegible] مرحوم کی زندگی کے ہر دلچسپ [illegible] نہایت دلچسپ پیرایہ میں قلمبند کیگئی ہے۔ یہ سوانح عمری جناب داغ مرحوم کے دوست اور ہمعصر جناب میر نثار علی صاحب شہرت دہلوی نے مرتب فرمائی ہے۔ نہایت خوشخط [illegible] مع تصاویر کے جو اعلیٰ فوٹو سے لیگئی ہیں طبع ہوئی ہے قیمت صرف ۱۲؍

المشتہر { محمد سراج الدین مالک و مہتمم مفید کتب ایجنسی رنگ محل لاہور

ترکی ٹوپیاں

ہم نے اپنے احباب کی خاطر نہایت اعلیٰ قسم کی عمدہ نفیس ترکی ٹوپیاں [illegible] جو پہننے کا شوق ہیں منگائی ہیں جو مخمل کیطرح نہایت ملائم اور فیشن ایبل بنی ہوئی ہیں۔ قیمت درجہ اول [illegible] درجہ دوئم [illegible] سوئم [illegible] چہارم [illegible]

المشتہر محمد سراج الدین مالک و مہتمم مفید کتب ایجنسی رنگ محل لاہور

فہرست مضامین دربار نمبر حجم قریباً سو صفحہ

اعلیٰ قسم کا کاغذ

نمبر	مضمون	مصنف
۱	اہلِ قلم کی طرف سے مبارکباد	ایڈیٹر
۲	موجودات	ظفر علیخاں بی اے
۳	پرانے لکھنؤ کی ایک جھلک	لالہ سری رام ایم اے
۴	ذوقِ سلیم	شیخ محمد اکرام
۵	تصویر یاس	حاجی محمد خاں بی اے
۶	اضطراب شوق	پروفیسر شہباز
۷	وارفتہ	شوکت علیخاں بی اے
۸	کمالِ حسن	میر نذیر حسین بی اے
۹	ام کہانی	ابو نصر غلام یسین آہ
۱۰	ہمت و تدبیر	سید علمدار حسین
۱۱	بزرگانِ عظیم آباد	میر علی محمد شاد
۱۲	شمع / ایک آرزو	شیخ محمد اقبال ایم اے
۱۳	انگریزی لباس	خانصاحب سید اکبر حسین جج
۱۴	جوگی	چوہدری خوشی محمد بی اے
۱۵	انسان کی فریاد	میر نیرنگ بی اے
۱۶	افسانۂ حسرت	مولوی حبیب الرحمن شروانی

قیمت صرف ۸؍ علاوہ محصولڈاک دفتر مخزن سے طلب کیجیے

ایک علمی ماہوار رسالہ

الندوہ

قیمت سالانہ [illegible]

آنریری اڈیٹر شمس العلماء شبلی نعمانی

ہر پرچہ [illegible]

چند مضامین کی فہرست ذیل میں [illegible]

مضمون	مضمون نگار
مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے	شبلی نعمانی
علوم القرآن	״
اخلاق عرب	״
عربی زبان	״
مثنوی مولانا روم اور سائنس	״
فلسفۂ یونان پر مسلمانوں نے کیا اضافہ کیا	״
ابن رشد	״
عربیت اور ہندوستان	مولانا شاہ سلیمان صاحب
فن بلاغت	شبلی نعمانی
مسئلۂ جبر و قدر	״
ابن جوزی کی کتاب مناقب عمر بن عبدالعزیز پر ریویو	״
مسائل فقہیہ پر ضروریات زمانہ کا اثر	״
سوانح عمری غلام علی آزاد	״
ندوہ اور اسلام	״
ذوالنون مصری اور علم کیمیا	مولوی عبداللہ صاحب عمادی

درخواستیں بہ اجازت [illegible] اس پتہ سے آئیں۔

منیجر الندوہ
لکھنؤ

ماء اللحم انگوری دو آتشہ

یہ ایک عطر مجرب ہے جو خالص انگور و گوشت میوہ اور مقوی میوہ جات و مفرح اجزا سے حسن
طریقہ پر کشید کیا جاتا ہے۔ ہر سال ہزاروں بوتلیں باہر جاتا ہے۔ یہ ماء اللحم ہمدرد ایجنٹ ہے اس قدر سریع الاستحالہ
و الاثر ہے کہ حلق سے اترتے ہی سیدھا خون میں شامل ہو جاتا ہے۔ اعضائے رئیسہ کے تمام افعال باقاعدہ
بنا کر ان سے وہی کام لیتا ہے جو قدرت نے ان کو تفویض فرمایا ہے۔ یہ امر مسلم بثبوت ہے کہ
زندگی کا مدار خون صالح پر موقوف ہے اور حکما خون کو روح کہتے ہیں اور روح کی حفاظت
سب سے ضروری ہے۔ اس لئے ماء اللحم کا استعمال بدن کی پرورش کے لئے اکسیر کا
کام دیتا ہے۔ جو لوگ موسم سرما میں اس کا استعمال کریں گے وہ تمام امراض سے محفوظ رہ
سکتے ہیں۔ تمام کمزوریاں دور کر کے بدن میں چستی طبیعت میں بشاشت پیدا کرتا ہے۔
لاغر جسم کو فربہ بناتا ہے۔ دماغی طاقت بھرپور چہرہ پر نور ہوتا ہے۔ حافظہ کو وہ تیزی دیتا ہے
کہ برسوں کی بھولی بسری باتیں یاد آجاتی ہیں۔ ذہن کی جلا کے واسطے بے نظیر مدد دیتا
ہے۔ جو لوگ موسم سرما میں اس کا استعمال فرماویں گے وہ کبھی ضعف کی شکایت
زبان پر نہ لاوینگے۔ مالیخولیا۔ سوداء۔ رعشہ۔ نسیان کو اڑا دیتا ہے۔ خون کی سمیت و
گندہ پن کو دور کر کے صاف خون پیدا کرتا ہے۔ نزلہ۔ زکام۔ کھانسی کا دشمن ہے۔
اشتہائے صادق پیدا کرتا ہے۔ الغرض ماء اللحم وہ جاں پرور دوا ہے جو جسم کو کندن
بنا کر بدن میں نئی روح پھونک دیتا ہے۔ مبہی و مقوی درجہ اول ہے باوجود ان اوصاف
کے **قیمت فی بوتل للعہ/ روپیہ رعایتی ایک روپیہ (عہ/)**

نوٹ تین بوتل سے کم بیرونجات میں روانہ نہیں کیا جاویگا۔ اور حالت سرما ولایتی بوتلیں روانہ ہو سکتا ہے۔ محصول ڈاک وغیرہ بذمہ خریدار۔ ریلوے اسٹیشن کا مفصل پتہ تحریر کریں۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر پیشگی وصول ہونی چاہیئے ورنہ تعمیل ارشاد نہیں کی جاوے گی۔

خادم الحکما محمد فضل اینڈ کو مالکان شفاخانہ آفتاب حکمت لاہور

جلد ۱۰ جنوری سنہ ۱۹۰۶ء نمبر ۴

ایڈیٹر
شیخ عبدالقادر بی اے

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

تصاویر دربار پرنس اینڈ پرنسس آف ویلز

مضامین نثر

مضامین نظم

نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں - اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں -

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ▭ ان شہروں میں اردو مروج ہے - ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے -

شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر
نے خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا -

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک قسم اول (پہ) فی پرچہ ۴ر قسم دوم (چار) فی پرچہ ۳ر

H. R. H. THE PRINCE OF WALES

ایچ - آر - ایچ - پرنس آف ویلس

H. R. H. THE PRINCESS OF WALES.

ایچ - آر - ایچ - پرنسس آف ویلز

(۱۰)

اِن تینوں مذہبی علم ادب کا زہریلا حصہ۔ ان تینوں مذہبی علم ادب کا وہ حصہ جو احکام مذہبی کی طرف رہنمائی اور ہدایت کرتا ہے وہ اہل مذہب کو نہایت عزیز ہے اور ان کے حق میں مفید اور سودمند ہے مگر ان کا وہ حصہ بڑا زہریلا ہے جس میں مخالفانہ اور معاندانہ مذہبی مباحث و مجادلے ہیں خواہ وہ ایک مذہب کے دوسرے مذہب کے ساتھ ہوں یا ایک ہی مذہب کے فرقوں میں باہمی ہوں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان آپس میں عداوت رکھنے اور نفرت کرنے کے لئے کافی مذہب رکھتا ہے مگر ان کے پاس آپس میں محبت کرنے کے لئے کافی مذہب نہیں ہے ہر مذہبی متعصب یک چشم ہوتا ہے۔ اپنے مذہب کی خوبیوں اور نیکیوں کے دیکھنے کے لئے ایک آنکھ رکھتا ہے مگر اس کی دوسری آنکھ غیر مذہبوں کی نیکیوں کے دیکھنے میں پھوٹی ہوئی ہوتی ہے۔ ایک بات کو جو اپنے مذہب میں ہو علوی اور الٰہی کہتا ہے اور اسی بات کو جو دوسرے مذہب میں ہو سفلی و شیطانی بتاتا ہے۔ اب تک یہ تحقیق نہیں ہوا اور نہ ہوگا کہ دنیا میں کونسا ایک مذہب برحق ہے۔ یوں ہر مذہب والے اپنے مذہب کو برحق جانتے ہیں اور اس کے سوا اور مذہب کو باطل سمجھتے ہیں۔

کوئی ہے کافر کوئی مسلماں جدا ہر اک کی ہے راہ ایماں
جو اُس کے نزدیک راہبری ہے وہ اِس کے نزدیک رہزنی ہے

اگر دُنیا میں سو مذہب فرض کئے جائیں تو ہر مذہب کے بُطلان پر ننانوے مذہب گواہی دینگے صرف ایک مذہب اس کی صداقت پر شہادت دیگا۔ جب یہ صورت ہے تو مشکل ہے کہ کوئی ایک مذہب سچا ثابت ہو۔ مگر یہ ایک رسم دنیا میں ہو گئی ہے، کہ اکثر ہر آدمی اپنے آبائی مذہب کو سچ جانتا ہے اور مذہب آبائی کی تحقیقات کا خیال تک بھی اسکو نہیں آتا۔ غرض ایک مذہب اپنے نزدیک دوسرے مذہب کے باطل ثابت کرتے ہیں اپنی دلائل کو مستحکم جانتا ہے وہ اِس بات کو ذرا نہیں سمجھتا کہ جس طرح ایک مذہب حق یا باطل ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرا ایک مذہب کا مُنہ نہیں کہ دوسرے مذہب پر مُنہ آسکے۔ ان مذہبی مباحثوں میں اکثر دلائل الزامی مستعمل ہوتی ہیں جو کسی بات کو ثابت نہیں کرتیں۔ اعتراضوں کے جوابوں میں اسی قسم کے اعتراض کرتے ہیں ایک مذہب جب دوسرے مذہب میں کوئی عیب بتاتا ہے تو دوسرا مذہب پہلے مذہب میں اِسی قسم کا عیب بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ تو اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتا۔ عیب کے بدلے میں عیب بتانے سے عیب نہیں دُور ہوتا۔ دونوں کا معیُوب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہر مذہب جھوٹی باتوں کا مجموعہ ہوتا ہے جس کو جُہلا سے سچ جانتے ہیں تو لوگ اِس پر لعن طعن کرنے لگینگے اور یہ نہیں خیال کرینگے کہ ہم بھی اپنے مذہب کے سوا اور مذہبوں کو وہی کہہ رہے ہیں جو وہ سب کو کہہ رہا ہے وہ ایک مذہب کے مستثنیٰ نہ کرنے کا گنہگار ہے۔ سوا اس کے اِس زمانے میں اشاعتِ مذہب کے لئے نہ معجزات ہیں نہ شمشیرِ تیز ہے۔ فقط یہی مباحثے ہی اشاعتِ مذہب کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں جن میں شمشیرِ زبانِ دشنام دہی اور بد کلامی و فحش بیانی سے دلوں کو مجروح کرتی ہے۔ اور آپس میں عداوت و نفرت پیدا کرتی ہے جس سے اخلاق میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ آپس میں حسد اور

ہٹ دھرمی بڑھتی ہے۔ بعض اوقات اس بحث کی وہ نوبت آجاتی ہے کہ نوبت فوجداری کو جا پہنچتا ہے اور سزائیں ملتی ہیں۔

(چوتھا) گورنمنٹ اور گورنمنٹ کے سررشتہ تعلیم نے جو اردو ہندی میں جدید علم ادب پیدا کیا ہے

گورنمنٹ نے اپنی مملکت ہند کے لئے جو قوانین انگریزی زبان میں مرتب کئے۔ ان کا اردو زبان میں ترجمہ کرا کے شائع کیا جس سے ہماری زبان میں ایک نیا قانونی علم ادب پیدا ہوا۔ قانون ایسا فلسفہ ہے کہ جس سے فہم میں ذکاوت و متانت پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کے مطالعہ سے ہماری عقل و دانش میں افزائش ہوتی ہے۔ قانون دانوں کو دیکھو کہ ان کی تحریر و تقریر برجستہ و شائستہ و شستہ معقول و مدلل ہوتی ہے۔ گو ان قوانین کی کتابوں کی اردو زبان انوکھی ہے مگر تعزیرات ہند اور ہدایت نامہ مالگذاری و بندوبست کی زبان بڑی سلیس و بامحاورہ ہے۔

گورنمنٹ کے سررشتہ تعلیم نے یہ کار نمایاں کیا ہے کہ یورپ میں جو مہذب و شائستہ قوموں کا علم ادب ہے اس کے ایک قلیل حصہ کو اردو ہندی زبانوں میں ترجمہ کیا ہے اور بہت سی کتابیں ایسی تالیف و تصنیف کی ہیں کہ ان میں وہ مغربی خیالات ہیں جو انسان کو مہذب و شائستہ بناتے ہیں اور علم جس کو علم کہنا چاہیئے سکھاتے ہیں۔ مغربی خیالات کا ہندوستانی زبان میں لکھنا ایسا آسان نہیں جیسا کہ مشرقی خیالات کا۔ مشرقی انشا پردازی کے لئے پہلے ہی سے اس کے نمونے بے شمار موجود ہیں۔ ان کو دیکھ کر ان کی نقل اتارنی آسان ہے۔ مگر مغربی خیالات کی انشا پردازی کے پہلے نمونے موجود نہیں۔ ایک ایک خیال کے بیان کرنے میں خون جگر کھانا پڑتا ہے۔ ایک ایک لفظ و اصطلاح کی ترجمانی کے لئے گھنٹوں سوچنا پڑتا ہے۔ پھر بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی۔ اس لئے مغربی خیالات کے بیان

کرنے کی زبان مشرقی خیالات کی انشا پردازی کی زبان کے برابر بلاغت و فصاحت نہیں رکھتی۔ مگر وہ مشرقی انشا پردازی کے خیالات کی پستی و فضولی و مبالغہ آمیزی سے جاتی ہو۔ مشرقی خیالات کی انشا پردازی میں الفاظ کے زیور ایسے بھاری ہوتے ہیں کہ جن سے معانی دبے جاتے ہیں۔ اُن کا حال بعینہٖ ایسا ہوتا ہے جیسا عورتوں کے ناک کان کا بھاری زیوروں کے پہننے سے کہ وہ سُوجتے ہیں کٹتے ہیں۔ ہندوستانیوں میں جب تک وہ مہذب و شائستہ نہ ہوں مغربی خیالات کا مذاق نہیں پیدا ہو سکتا۔ مشرقی زبانوں کے جاننے والے اپنے مشرقی خیالات کے والہ و شیدا اور فریفتہ و دلدادہ ہیں۔ وہ مغربی خیالات کی ایک کتاب کو پسند نہیں کرتے اس کا استہزا کرتے ہیں۔ سررشتۂ تعلیم کی کسی کتاب کو میں نے نہیں دیکھا کہ جس کی وُہ تحقیر و تذلیل و تفضیح نہ کرتے ہوں۔ وہ اس سررشتۂ تعلیم کی کتابوں کو سمجھتے بھی نہیں۔ اور مطالعہ کر کے سمجھنے کا قصد بھی نہیں کرتے۔ گو سررشتۂ تعلیم نے بعض اخلاق کی کتابیں ایسی تصنیف و تالیف کی ہیں کہ اُن میں گلستاں کی سی اخلاق کی باتیں موجود تھیں مگر اب چشم گلستاں کا نہیں تھا۔ وُہ ہندوستان میں مقبول و مرغوب گلستان کی برابر نہیں ہوئیں اور نہ ہونگی۔ سررشتۂ تعلیم نے تواریخ و فلسفے و پولٹیکل اکونومی (سیاستِ مدن) اور اصولِ قوانین و تذکروں و قصص کی بہت سی کتابیں تالیف و تصنیف کی ہیں۔ ان کو سررشتۂ تعلیم اپنی مرضی سے مدارس میں درس میں جاری کر دیتا ہے مگر کوئی مشرقی زبان دان ان کا مطالعہ نہیں کرتا نہ اُس کے سمجھنے کی لیاقت رکھتا ہے۔
غرض جو مشرقی علم ادب سے واقفیت رکھتے ہیں وہ تو اس مغربی علم ادب کے نمونے کی کتابوں کو پسند نہیں کرتے بلکہ نفرت کرتے ہیں مگر وُہ لوگ جو کثرت سے ایسے ہیں کہ ان کے گھر میں پہلے سے کوئی علم نہ تھا اور اُن کو سررشتۂ تعلیم ہی نے اپنی کتابوں کے ذریعہ سے علم سکھایا وُہ مشرقی خیالات کی کتابوں سے نفرت رکھتے ہیں وہ اُن کی سمجھ

میں نہیں آتیں اور نہ اُنکا مذاق رکھتے ہیں ۔ یہی سررشتۂ تعلیم کا علم ادب ہندوستان کو مہذب و شایستہ بنیگا اور مشرقی علم ادب کو اپنی جگہ سے ہٹا کر اس کی جگہ لے لیگا اور انہیں کو مٹا دیگا۔ اگر یہ سررشتۂ تعلیم کا علم ادب نہ پیدا ہوا ہوتا تو مشرقی علم ادب منزل تنزل میں ہوتا۔

(پانچواں) اخباروں اور رسالوں کا علم ادب اُردو ہندی میں

ہماری زبان میں اخباروں اور موقت رسالوں نے علم ادب کی ایک ہی شاخ لگائی ہے۔ ان میں مہذب ملکوں کے اخباروں اور رسالوں سے بعض عمدہ مضامین ترجمہ ہو کر چھپے جاتے ہیں۔ جن کی زبان مطلب خیز ہوتی ہے۔ بعض کی زیر تعلیم یافتہ خود بھی ایسے مضامین اپنی زبان میں لکھتے ہیں کہ جو انگریزی آرٹیکلوں اور جواب مضمونوں ایسے سے کم نہیں ہوتے۔ اگر ان اخباروں اور رسالوں میں سے یہ مضامین منتخب ہو کر ایک مجموعہ بنایا جائے تو وہ ہماری زبان میں علم ادب کا سرتاج ہو۔ مگر جہاں گل ہے وہاں خار بھی ہے ان اخباروں میں خصوصاً بیہودہ لغو پُر فحش مضامین بھی چھاپے جاتے ہیں۔ آپس میں تُو تُو مَیں مَیں اور بیجا مدح وذم ۔ امراء و شرفاء و رؤسا پر طعن۔ گورنمنٹ کی ناسزا عیب جوئی و بدگوئی ہوتی ہے۔ ع

کب وہ بھلا گذرتے ہیں لاف و گزاف سے
جنکی کہ آشنا ہے زباں لام کاف سے

اپنی خودستائی اپنے معاصرین کی ہجو پیرائی پر فخر و ناز ہوتا ہے۔ اپنے مخالفوں کی دل آزاری داخل ثواب سمجھی جاتی ہے۔ بعض اخبار تجارتی اصول پر نکلتے ہیں۔ ان میں اشتہاروں کے طومار کے طومار رہتے ہیں۔ اشتہاروں کا لکھنا انشاپردازی کی ایک فرع ہے جس کو ہم بہت کم جانتے ہیں اس لئے ان میں مبالغہ اور دروغ اتنا ہوتا ہے کہ وہ پایۂ اعتبار

سے ساقط سمجھے جاتے ہیں۔ دواؤں کے اشتہاروں میں بعض دفعہ فحش ایسا ہوتا ہے کہ مشتہر مجرم ہو تو سزا پاتا ہے۔

پنچ کے عنوان کے نیچے اکثر مضامین ایسے لکھے جاتے ہیں جن کی زبان لُچوں قحباؤں کی جھگڑا اور شہدوں کی ضلع و جگت ہوتی ہے مگر بعض مضامین میں دلچسپ ظرافت و لطافت دلربا شوخی انگریزی پنچ کی سی ہوتی ہے۔ ان میں تصویریں بھی ہوتی ہیں جو اصل سے ایسی غیر مشابہ ہوتی ہیں جیسی کہ کوئی مصوّر مینڈک کی تصویر بنا کر اس پر لکھ دے کہ یہ اڈیٹر صاحب کی تصویر ہے۔ بعض ذہین و طبّاع اڈیٹر اس میں اپنا وقت بہت صرف کرتے ہیں۔ اُنکا اصل مطلب بھانڈوں کی طرح لوگوں کو ہنسانے اور اپنے روپے کمانے سے ہوتا ہے۔ پنچ کی انشا پردازی مسخرگی میں داخل ہے۔ علم ادب کی وہی رفعت فرع نہیں ہے۔ انسان بالطبع بعض اوقات مسخرے پن کے مضامین سے دل بہلانا چاہتا ہے سو وہ پنچوں میں ایسے مضامین کو پڑھکر اپنا دل خوش کرسکتا ہے۔ اس قسم کی انشا پردازی میں ناموری و عام پسندی حاصل کرکے نام پیدا کرتے ہیں۔

چند اخبار اور رسالے ایسے بھی نکلتے ہیں کہ اُن میں مستورات کی مضمون نگاری بھی ہوتی ہے جن کی زبان .... سلاست و شیرینی میں مرد مضمون نگاروں کی زبان کو مات کرتی ہے۔ اور مضامین اور خیالات بھی عورتوں کے حسب حال خوب موزون ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اِن اخباروں اور موقت رسالوں میں علم ادب کا ایک حصہ مفید اور دوسرا حصّہ مضر ہوتا ہے۔ اگر یہ دونو میزانِ عدل میں تولے جائیں تو معلوم نہیں کہ کونسا پلڑا بھاری رہے۔

(چھٹا) ہمارے شاعروں اور مشرقی خیالات کے انشا پردازوں کا علم ادب اردو و ہندی بھاشا میں

ہماری زبان کے شاعروں کا بڑا گروہ ہے۔ پہلے اس کے دو فرقے اہلِ دہلی اور اہلِ لکھنو

تھے - اب دونو بہت سے زمروں میں منقسم ہو گئے ہیں - ان میں سے ہر ایک کو اپنی زباندانی
پر لاثانی ہونے کا دعویٰ ہے - ہر زمرہ نے اپنی خود مختاری سے چند قواعد صحیح و غلط ٹھہرا لیے
ہیں اور کچھ لفظی محاورے بھی گھڑ لیے ہیں - اسی کو معیار سخن وہ سمجھتا ہے اور زمروں کے کلام
کو اس معیار پر پرکھ کر کھوٹے کھرے کا فیصلہ کرتا ہے اور زمرے جن معیاروں کو مسدود کرتے
ہیں کہ جو کھوٹے کو کھرا اور کھرے کو کھوٹا پرکھتے ہیں - ہر زمرہ اپنے اساتذہ و قدمائے سخن کا [illegible]
جانتا ہے جو اس کی اطاعت نہیں کرتا اسکو وہ باغی گردن زدنی سمجھتا ہے - غرض ہر ایک زمرہ
نیابت میں فرعونی دعویٰ رکھتا ہے - اس قسم کے اشعار اپنے ایام طفلی سے سنتے چلے آئے
ہیں اور اسی طرح میں خود سخن سنج ہوتے ہیں اسی کو شاعری جانتے ہیں باقی سب کو ہیچ پوچ -
اور زمروں کے اساتذہ کی خردہ گیری کرتا ہے اور ہجا انکی ہوا کرتی ہے - ہر ایک زمرہ
اپنے اساتذہ کو خدائے سخن سمجھتا ہے جو اس کو نہیں مانتا اسکو مشرک و کافر جانتا ہے - ہر ایک
اپنے منہہ سے میاں مٹھو بننے میں شرم نہیں کرتا - پھر تماشا یہ ہے کہ ان زمروں کا علم عروض و قوافی
علم معانی و بیان - علم صرف و نحو - غزل و قصیدہ کی اور اور اصناف سخن کے مضامین کی طرز ادا
واحد ہے کوئی کسی طرز کا موجد نہیں مگر ہاں غلط الفاظ و محاورات پر کچھ بحث پڑی ہو جسکا انکو
کچھ نتیجہ نہیں ہوتا طرفین بک بک کئے جاتے ہیں چپ نہیں رہتے - غرض اس نزاع لفظی کے
سبب اساتذۂ مسلمہ پر لعن طعن ہوتی ہے جس سے انکی استادی میں تو کوئی بٹا نہیں لگتا - مگر
بحث کرنے والوں کا تعصب و جہل مرکب کا اعلان ہوتا ہے - اب دہلی و لکھنؤ کی
زبانوں کی پہلی سی وقعت نہیں رہی - اب ہر شہر کو اپنی زباندانی پر ایسا ہی دعویٰ ہے جیسے
کہ پہلے اہل دہلی اور اہل لکھنؤ کو تھا -

شعرا اور مشرقی خیالات کے انشا پرداز اس بیان پر جو علم ادب کی تقسیم کے باب میں
لکھا ہے - استہزا کرینگے اور زبان مبارک سے فرمائینگے کہ یہ کیا بچر لچر پچر کچر لکھا ہے :

جس کا سر ہے نہ پاؤں ہے۔ علمِ ادب کا اطلاق تو صرف ہماری کلام پر ہوتا ہے۔ سرے سے کسی اور قسم کے کلام پر علمِ ادب کا اطلاق کرنا ہی غلط ہے یہ ناحق بکواس کی ہے۔

تو میں اُنکی خدمت میں عرض کرونگا کہ دنیا کی شائستگی و تہذیب کی تاریخ ثابت کر رہی ہے کہ جو ملک نیم مہذب و نیم وحشی ہوتے ہیں۔ انکی شاعری میں سخن سنجی اور سب علموں پر شرف و برتری رکھتی ہے اور ایک عالم کے دلوں پر اپنی تاثیر چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ خلائق کے دلوں کے تسخیر کرنے میں اعجاز نمائی کرتی ہے۔ اس نیم مہذب زمانہ میں جو اس کا اثر ہوتا ہے وہ مہذب زمانہ میں سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا غضب کا ہوتا تھا۔ مگر جب کسی ملک کی تہذیب و شائستگی کو بڑھاتا ہے تو شاعری اپنے عزّ و شان کے اوج سے نیچے گرنی شروع ہوتی ہے۔ مہذب ملک اور قوموں میں شاعری کسی بڑی وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی۔ مہذب دنیا میں ہمارا ملک نیم مہذب شمار ہوتا ہے اس لئے اب تک اس میں شاعری کی قدر و منزلت باقی ہے۔ مگر اب مغربی خیالات کے نور نے تہذیب و شائستگی کی روشنی پھیلانی شروع کی ہے۔ اس لئے شاعری پر تاریکی آتی جائیگی۔ اس لئے میں نے لٹریچر کا بیان اس طرح کیا ہے کہ مشرقی خیالات کے شاعر و نثر پرداز جو اپنے علم ادب کے سوا دنیا کے علم ادب کو معدوم سمجھتے ہیں اور اپنی بڑی لن ترانیاں مارتے ہیں وہ اس کے بحرِ ذخار کو دیکھ کر کنوئے کی مینڈکی اور گوبر کے کیڑے بنے ہیں۔ ایک عجیب قلیل زمرہ شعرا کا بیان کرتا ہوں۔ یہ قاعدہ مشہور ہو رہا ہے کہ جو طلبا انگریزی میں تحصیلِ علم کرتے ہیں اُن کا انگریزی زبان میں ذی استعداد ہونا ایک مشتبہ امر ہے۔ مگر اُن کی اپنی مادری زبان کا بگڑ جانا ایک یقینی امر ہے۔ اس لئے اُن کی اُردو کا نام سڑدو یعنی سڑی ہوئی اُردو رکھا گیا ہے۔ مگر کوئی قاعدہ جب تک ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی مستثنےٰ مثالیں نہ ہوں۔ سو اس قاعدہ کی مستثنےٰ مثالیں چند جوان یونیورسٹیوں کے گریجوایٹ ہیں جو اپنی مادری زبان میں شعر کہنا اور نثر لکھنی جانتے ہیں۔ ان نوجوانوں کی

قابلیت و استعداد قابل تعریف ہو کہ وہ انگریزی علم ادب بھی جانتے ہیں اور اس کے ساتھ
انکو اپنی زبان میں نظم و نثر لکھنی بھی آتی ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ وہ اپنی قابلیت پر دوربین
لگا کے دیکھتے ہیں اگر وہ مکھی کے برابر ہو تو بھینسے کے برابر انکو نظر آتی ہے۔ انکو اپنی قابلیت
اور لیاقت پر یہ نخوت ہے کہ وہ ان بزرگوں کو جن کی ساری عمر فن زبان کی تحصیل
و تحقیق میں گذری ہے۔ تقویم پارینہ جانتے ہیں اور اس کے مصداق بنتے ہیں کہ تھوڑا
علم خطرناک ہوتا ہے۔ وہ خوب سمجھ لیں کہ خواہ وہ اپنے تئیں کیسے ہی عالم فاضل تصور کریں
مگر ان بزرگوں کے سامنے طفل مکتب ہیں۔ ابھی تک علم ادب پر انکی نظر وسیع نہیں ہے۔
انکی ساری عمر ان بزرگوں کے مطالعہ کی عمر کے بھی برابر نہیں۔ یہ بزرگ ان سے ذہانت
و ذکاوت میں کچھ کم نہیں۔ انہوں نے اپنا سارا وقت اپنی زبان کی زباندانی و نکتہ سنجی میں
صرف کیا ہے کچھ بھاڑ نہیں جھونکا کہ تم اپنے تئیں ان سے بہتر سمجھنے لگے۔ ایک قالب
معین میں الفاظ کا ڈھال کر شعر موزوں کر لیا طبیعت کی موزونی پر دلالت کرتا ہے مگر
یہ قافیہ پیمائی تم کو زباندانی کی معراج پر نہیں پہنچاتی اور اساتذہ کامل کی انجمن میں جگہ نہیں
دیتی۔ یہ کمال افسوس کی بات ہے کہ وہ اپنی علمی توقیر کی توفیر کے لئے ان اساتذہ کامل
کی تحقیر کرتے ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر اپنی زباندانی کی تحصیل میں صرف کی ہے۔
جب کہ سب طرح سے انکا کلام شستہ سمجھا جاتا ہے۔ ؎

اچھوں کو برا جو کہے بیشک وہ برا ہے ہووے گی بروں کی نہ کبھی اچھوں میں توقیر
تجھ سا نہ برا ہوویگا آفاق میں کوئی اچھوں سے جو اچھے ہیں تو انکی کرے تحقیر

کوئی مونس کے کلام کی نسبت اپنی اردو لٹریچر کی کم استعدادی کے سبب کہتا ہے کہ
اس کے کلام میں جتنی زبان کی غلطیاں ہیں اتنی اس کے کسی معاصر کے کلام میں نہیں ؎

کیسی ہی بنایا کرے باتیں کوئی ناداں داناؤں میں ہووے گی نہ سخن اس کے کو توقیر

وہ جو اساتذہ کے کلام کی تنقید میں نکتہ چینی و عیب گیری کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انکی طبیعت سلیم و مذاق صحیح نہیں ہے۔ انکی خردہ گیری خود انکی کوتاہ نظری پر دلالت کرتی ہے۔ اس تنقید میں وہ انگریزی زبان کے نقادوں کا تتبع کرتے ہیں مگر نقادوں کے سے تمام خوبیوں سے چشم پوشی کر کے صرف نکتہ چینی و عیب گیری کے لئے ہیں۔ اگر وہ اپنے اس شیوہ ناستودہ کو چھوڑ کر اپنی زبان میں مغربی خیالات کا علم ادب تصنیف و تالیف کریں تو اپنے ملک پر بڑا احسان کریں۔ اور اپنی زبان کو ترقی دیں ان میں ایسی استعداد ہے کہ اگر وہ اس طرف متوجہ ہوں تو نہایت عمدہ کتابیں لکھیں چنانچہ بعض نے اس کا نمونہ اپنے ترجموں اور تصنیف و تالیف سے دکھا دیا ہے۔ اُن ہی سے ایسی توقع ہو سکتی ہے کہ وہ مغربی خیالات سے اپنی زبان کے علم ادب کو معمور کر دیں۔ وہ جو عیب [illegible] رہنے میں بیجا وقت ضائع کرتے ہیں اگر وہ اسکو اپنے ہنر و کمال کے پیدا کرنے میں صرف کریں تو وہ اپنے ملک کے لئے فخر سمجھے جائیں

وکٹوریا البرٹ میوزیم

لندن کا وکٹوریا البرٹ میوزیم ساؤتھ کنسنگٹن میں واقع ہے۔ یہ عمارت نومبر ۱۸۵۷ء کی نمائش کے لئے تیار ہوئی تھی۔ جس پر دولتِ برطانیہ نے ... چنانچہ ... روپئے صرف کئے۔ ۱۸۹۹ء میں ... ایک وسیع اور عالی شان عمارت بننی شروع ہوئی ۱۹۰۹ء میں اس کا نام ساؤتھ کنسنگٹن میوزیم رکھا گیا۔ ۱۸۹۹ء میں ... عمارت کی اصلاح ہوئی۔ اور اس اصلاح شدہ عمارت کا نام ملکہ وکٹوریا اور ان کے شوہر کی یادگار میں وکٹوریا البرٹ میوزیم رکھا گیا۔

اس عمارت میں قدیم و جدید فنون و علوم کا ایک بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ جو دنیا کی ممتاز قوموں کا تمدن اور تمدن کی ترقی کی تاریخ ظاہر کر رہا ہے۔ مشرقی قوم کا تمدن ایک علیحدہ عمارت میں دکھایا گیا ہے۔ جہاں ہندی۔ ایرانی۔ شامی۔ عربی۔ ترکی چینی و جاپانی صنائع کے علیحدہ علیحدہ کمرے موجود ہیں۔ اس عمارت کے ... کمرے ہندوستان کی صنعت و حرفت سے پر ہیں۔ باقی کمرے ممالک متذکرہ بالا کی مصنوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں اس وقت میوزیم کے دوسرے حصوں سے بحث نہیں کرتا۔ صرف اسی حصہ عمارت کی بابت گفتگو کرتا ہوں جس سے ہندوستان کو تعلق ہے۔

میوزیم کے اس حصہ کی ابتدا ایسٹ انڈیا کمپنی سے علاقہ رکھتی ہے۔ کمپنی کی وفات پر اس کا ورثہ انڈیا آفس کو پہنچا۔ جس میں انڈین میوزیم بھی شامل تھا۔ ۱۸۸۰ء میں یہ میوزیم ساؤتھ کنسنگٹن میوزیم میں ملحق کر دیا گیا۔ اس عمارت کے دروازے پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے "انڈین سیکشن" غیر قوم اُن سے متاثر ہو یا نہ ہو لیکن ہندوستانی کو یہ الفاظ مغموم یا مغرور ضرور

کر پہنچینگے۔ دروازے پر ایک گورا کاکی وردی میں ٹہلتا نظر آویگا۔ اگر آپ پگڑی باندھے ہوئے ہیں تو "انڈین پرنس" سمجھکر سلامی دیگا اور آپ کے لئے راستہ چھوڑ دیگا۔ دروازے میں گھستے ہی سجے ہوئے ہوا محل نظر آئینگے۔ جن کی نقل پیتل میں ہے۔ اب آپ ایک چوبی چھت دیکھینگے جو چین کے کسی مندر کی ہے۔ اور ساتھ ہی راجہ رامچندر جی کی شادی کا مرقع پیش کر رہی ہے۔

آگے چلکر ایک چوبی برآمدہ ہے جس میں دو دروازے جھانکتے ہیں۔ دروازوں کے دو جھروکے ہیں۔ لکڑی پر کام بہت اعلیٰ ہے۔ یہ حصہ عمارت شاہ حسام ہادی کے محل کا ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ میں صدی پیشتر سے متعلق ہے۔ اس برآمدے کی خرید میں دو سو پونڈ صرف ہوئے۔ پاس ہی خان دوران خاں کی قبر کی جالیدار دیوار ہے۔ جو گوالیار سے لائی گئی ہے۔ یہ سید مراد شاہ کے مزار واقع ملتان کا نمونہ ہے جس پر مرحوم کی تاریخ بھی کندہ ہے۔

پھر سانچی ٹوپ واقع بھیلسہ بھوپال (ممالک متوسط) کی نقل ہے۔ یہ عمارت ہندوستان میں بدھ مت کے عروج کے زمانے کی یادگار ہے۔ اور اس کو ہندوستان کی نہایت ہی قدیم عمارت کہا جاسکتا ہے۔ عمارت کی صورت ایک بڑے گنبد کے مشابہ ہے جس کے گرد احاطہ کھینچا ہوا ہے احاطے میں چار دروازے ہیں۔ ان میں ایک دروازہ بجنسہ میوزیم کے بالائی حصے میں رکھا ہوا ہے۔ گنبد کی تاریخ تعمیر پانسو سال قبل مسیح ظاہر کی جاتی ہے اس کے بانی کا نام نامعلوم ہے دو سو ساٹھ برس قبل مسیح راجہ اشوکا نے اسکو سنگ سرخ سے تعمیر کیا اور پینتیس برس قبل مسیح شری سنگارنی (مالگدہ دیس) نے اس کے دروازے تعمیر کئے۔

دو خانوں میں بدھ کی ثابت اور شکستہ مجلسیں ہیں۔ بعض مجلس میں بدھ جی شاگردوں میں

سلہ ہندوستانی شاہزادہ ۱۲

مشغول ہیں اور تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ بعض میں بدھ جی یادِ الٰہی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ بعض میں بدھ جی کسی قوال سے جس کے ہاتھ میں ساز بھی ہے وجدانی لحن اور گیت سن رہے ہیں۔ یہ مجسمے حال ہی میں ملک یوسف زئی سے برآمد ہوئی ہیں۔ ان کی تاریخ نامعلوم ہے۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ یہ تخت اکبری سے بھی بہت قدیم ہیں۔ یہیں جیسے کہ قدیم زمانہ کے شکستہ بت اور ستون موجود ہیں جن کی تاریخ دوسری اور آٹھویں صدی عیسوی کے درمیان بیان کی جاتی ہے۔ یہاں قطبی عمارات (قطب الدین ایبک) کے بھی چند نمونے نظر آتے ہیں۔ قریب ہی شمسی عمارات (شمس الدین شمس) کے کچھ باقیات ہیں جن پر طرز مسجد کی آیات کندہ ہیں گور اور قدیم بنگال سے شیر شاہی عمارات کے بقیے ہیں جو پندرھویں صدی عیسوی کا نمونہ ہیں فتحپور سیکری سے تخت اکبری بجنسہٖ یہاں رکھا ہوا ہے۔ اکبری قلعہ واقع سکندرہ کے نمونے اور آرام بانو کے مزار کی نقل بھی موجود ہے۔ تاج گنج کی کئی نقلیں ہیں۔ امرتسر کے سنہری مندر کی نقل بھی یہاں نظر آتی ہے۔ دو کمرے یہاں ختم ہوتے ہیں۔

تیسرے کمرے میں ہندوستان کے پیشہ ور صنعت پیشہ و تجارت پیشہ دکھائے ہیں ان کے اوقاتِ زندگی مختلف رسمیں۔ شادی۔ ماتمداری مذہبی رسمیں جلوس۔ درگا پوجا اور محرم وغیرہ وغیرہ دکھائے ہیں۔ قدیم و جدید سواریوں کے نمونے۔ پیشہ وروں کے اوزار اور موسیقی کے ساز قدیم و جدید جمع ہیں۔

چوتھے کمرے میں ہندوستان کی ساخت کا کپڑا نظر آتا ہے۔ چھینٹیں۔ سیلے۔ مندیل۔ زردوزی۔ گوٹا۔ اور سوئی کے کام کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے رکھے ہوئے ہیں۔ یہیں ہندوستان کی قوموں کا لباس دکھایا گیا ہے۔

پانچویں کمرے میں لیس کا کام۔ لکڑی کا کام۔ ہاتھی دانت پر کام۔ سینگ کا کام۔ چمڑے کا کام۔ غرض سب صنعتوں کے نمونے رکھے ہیں۔ میز کرسی۔ پلنگ۔ صندوق۔ زین۔ پالان وغیرہ وغیرہ

پ مشہور مقامات ہندوستان کا سامان موجود ہے۔ یہیں چند خانوں میں ہندوستان کے مختلف اضلاع کی گڑیاں ٹوپیاں رکھی ہوئی ہیں۔

صحن عمارت یہاں ختم ہوتا ہے۔ زینہ کا راستہ لیجئے اور دیواروں پر لٹکی ہوئی تصویروں پر بھی نظر ڈالتے چلئے۔ جو ہندوستان کے مختلف مقامات کے مناظر ہیں کرسی پر زینہ کے ایک حصے میں دو الماریاں دیوار کے برابر کھڑی ہیں۔ جن میں ہتھیار بند ہیں۔ ایک تلوار پر جو سلاح خانہ الور سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ فارسی شعر سونے کے پانی سے لکھا ہوا ہے

روزیکہ ہیچکس نبود دادرس مرا　　یا مرتضیٰ علی تو بفریادرس مرا

پہلے کمرے میں تانبے پیتل کانسی کے برتن دکھائے ہیں اور دیواروں پر ایرانی۔ افغانی۔ ترکستانی اور ہندوستانی قالین لٹک رہے ہیں۔ دوسرے کمرے میں ہندوستان کا مروجہ حال و قدیم زیور طلائی و نقرئی دکھایا گیا ہے۔ دو تین خانوں میں شاہ برما کے زمانے کی جڑاؤ چیزیں رکھی ہیں جو انگریزوں نے ۱۸۸۵ء میں منڈالے کے محل سے لی تھیں جن میں کچھ نقرئی اور طلائی برتن بھی ہیں۔

تیسرے کمرے میں ہندوستان کے مختلف اضلاع اور قوموں کے ہتھیار دکھائے ہیں پہلے خانے میں آسام کے ہتھیار ہیں جو زیادہ بھدے اور ناتراشیدہ ہیں۔ پھر نیپال کے ہتھیار ہیں جو ان سے بہتر ہیں۔ مرہٹوں کے ہتھیار ہیں۔ راجپوتوں کے۔ سندھ کے۔ پنجاب کے۔ اور پٹھانوں کے بناوٹ کے لحاظ سے۔ یہ ہتھیار سب ایک ہیں کیونکہ کوئی خاص ہتھیار سے ہندوستان میں کسی خاص قوم کو علاقہ نہیں۔ راجپوتوں کا کھنڈا اور کٹار۔ سکھوں کا بچھوا اور پٹھانوں کا چھرا مشہور ہے۔ لیکن اور قوموں نے بھی انکو استعمال کیا ہے۔ انگریزوں نے غالباً ان ہتھیاروں کی تقسیم جداگانہ یوں کی کہ جس قوم سے جو ہتھیار ان کے ہاتھ لگے وہ ہتھیار اسی قوم کے خانے میں دکھا دیئے۔ اسی خانے میں دو تین توپیں پڑی ہوئی ہیں اور خود

نام جنہوں نے یہ پیاری اور خوشنما چیزیں یہاں کیں غائب ہیں۔ اب رہے وہ ناموَر جنہوں نے ہندوستان کی تاریخ میں کارہائے نمایاں کئے اور ایسے اپنے زمانے میں شاہی اور خدائی اختیارات پائے۔ ان مرہٹوں کی تمام تو نہیں پر چند نشانیاں باقی ہیں۔ انگریز اٹھا کر لے گئے تو پہلے درجے کے ہیں اور اصل بھی یہ ہے کہ ان کے چھوٹے چھوٹے گھر سندوں کی طرح آراستہ بجائے خود عجائب خانے ہیں۔ کوئی بدنصیب گھر ہوگا جس میں ہندوستان کی ایک آدھ چیز نئی پرانی نظر نہ آوے جس زمانہ سے انکو تعلق ہندوستان سے ہوا جب سے آج تک انہوں نے کیا کچھ نہ لیا ہوگا اس کا حساب تو وُہ جانیں اور انکا خدا۔ لیکن عام تفرج گاہوں میں جو کچھ نظر آتا ہے وُہ بہت ہی کم ہے۔ کچھ چیزیں ونڈسر کاسل میں ہیں۔ کچھ قصر بکنگھم میں۔ کچھ برٹش میوزیم میں۔ کچھ ٹاور میں۔ کچھ انڈیا آفس میں اور چند یہاں جب ٹاور میں ہمارے غریب الوطن کوہ نور کی نقل رکھی ہوئی ہے۔ اور یہیں سیواجی مرہٹہ کا وہ جانستاں بچھوا رکھا ہوا ہے جس سے اُس نے افضل خاں کی جان لی تھی۔ اس میوزیم میں جو چیزیں تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں انکو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے ایک کُرسی رنگ مرمری ہے۔ یہ کُرسی سراج الدین محمد بہادر شاہ نے جنرل سر جارج بروک کو بخشی ہے۔ ایک مقام پر اسی بدنصیب بادشاہ کے دو فرمان لٹک رہے ہیں جو زر افشاں کاغذ پر ہیں اگر ایک فرمان کی نقل بھی درج کر دیجائے تو خالی از لطف نہیں۔

"دریں وقت میمنت اقتران فرمان والاشان واجب الاذعان صادر شد کہ بمقتضائے وفور مراحم خاقانی و تفضلات خسروانی کہ نمونۂ افضال یزدانی ہست۔ فدوی خواص لائق العنایت والاحسان سیمن فریزر را بخطاب امین الدولہ بہادر دلیر جنگ یمین الاعیان والارکان وفی الامثال والاقران سرفراز و ممتاز فرمودیم۔ باید کہ فرزندان نامدار کامگار والاتبار وسوز رائے ذوالاقتدار و امرائے عالیمقدار و حکام ممالک فدوی خاص معز اللہ را از جانب فیضمآب بادشاہے مشمول

ایں خطاب برگزیدہ و القاب پسندیدہ معزز و مباہی رستہ اتفاق افتاد حضرت ابد دولت را بہ توالی شہنشاہ
آں بہادر معزالیہ یوماً فیوماً متزاید و بے نہایت دانند ۔ تاریخ است پنجم جمادی الثانی ... م
از جلوس ابد مانوس معلیٰ زیب تحریر یافت ۔

اس فرمان پر شاہ موصوف کی مہر ہے ۔ مہر کے حاشیے پر گذشتہ سلاطین مغلیہ کے
تحریر ہیں ۔ برابر ہی خط طغرا میں ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی لکھا ہوا ہے ۔

یہاں ایک مسند پوش بھی ہے ۔ اس کی ولادت ترکستان ہے لیکن انقلاب
زمانہ اسے ہندوستان اور ہندوستان سے یہاں لایا ۔ یہ مسند پوش امیر بخارا نے امیر شیر علی
امیر افغانستان کو تحفتاً بھیجا تھا ۔ اُن سے انگریزوں کے ہاتھ لگا ۔ سرخ بانات پر زردوزی کا
کام ہے ۔

سابق مہاراجہ بڑودہ کا انگریزی لباس کوٹ پتلون اور ہیٹ[سلہ] بھی یہاں رکھے ہوئے
ہیں ۔ پتلون سیاہ کشمیرے کی ہے جس پر دوہری روپہلی لیس لگی ہوئی ہے ۔ اسی
کا سیاہ کوٹ ہے ۔ کالر، آستین، کندھوں اور حاشیہ پر سنہرا اور روپہلا کام ہوا ہے ۔ ہیٹ
تمام زرنگار ہے ۔ چند دوسرے پر سرخ و سفید پر پھیلے ہوئے ہیں ۔

پگڑیوں اور ٹوپیوں کی قطار میں ایک سرپیچ مرصع ہے جس پر کلغی اور مالا پڑی ہوئی ہے
اس سرپیچ کا علاقہ مہاراجہ مان سنگھ جی مہاراجہ جودھپور سے ہے ۔

اسی موقع پر ایک ٹوپی بھی قابلِ ذکر ہے ۔ نہ صرف اس لحاظ سے کہ اس کا علاقہ وزیر شاہِ
اودھ سے ہے ۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ وہ اپنی طرز میں اکیلی ہے ۔ حضراتِ لکھنؤ تراش خراش
اور ایجادوں میں تو فرد ہیں ۔ یہ بھی اُنکی ایک ایجاد ہے اور بالکل عجیب ہے ۔ پہلے ایک بل دار پگڑی
کا تصور کیجئے ۔ پگڑی کی چھت پر ایک چوگوشہ تاج نما ٹوپی مستزاد کیجئے ۔ ایسی پگڑی یا ٹوپی

سلہ انگریزی ٹوپی ۱۲

کے لئے سر بھی خاص قسم کا تلاش کرنا ہوگا۔ کیونکہ بادشاہ کے سروں پر تو وہ بہت ہی بڑی ہے لیکن وزیر شاہ زادہ تھے۔ شاید سر بھی شملہ بمقدار عظیم معمولی سروں سے بڑا ہو۔ مگر افسوس ہے کہ اس کلاہ کو فروغ کا موقع نہیں ملا۔

مہاراجہ ہلکر کی تلوار بھی قابل تحریر ہے۔ یہ مہاراجہ پور کے واقعہ کی یادگار ہے، جس میں انگریز فتحیاب اور مہاراجہ ہلکر کو شکست ہوئی۔ جنگ کے خاتمہ پر مغلوب ہونے کی علامت میں یہ تلوار مہاراجہ موصوف نے انگریزی سپہ سالار کو دی۔ گورنمنٹ نے سر جان منظم کو تحفتاً دی۔ ان کے متعلقین سے ایک سو پچیس پونڈ میں میوزیم کے لئے خریدی گئی۔ قبضے پر مُلمّع سنہری کام ہوا ہے اور لعل و زمرد جڑے ہوئے ہیں۔ میان فرنگی شکل کا ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ایک نادر کرسی ہے۔ تمام کرسی پر سونے کا پانی پھرا ہوا ہے۔ اندر کی طرف گاؤ تکیہ کی شکل کے تکئے بنے ہیں۔ یہ افغانستان کی گدی کی ایک کرسی یہاں رکھی ہوئی ہے۔ یہ کرسی اکتوبر ۱۹۴۹ء میں شہر کابل کی فتح پر انگریزوں کے ہاتھ لگی۔ کرنل ... نے شاہ ایڈورڈ کو ان کے ولیعہدی کے زمانے میں نذر کی۔ شاہ موصوف نے میوزیم میں منتقل بھیجدی۔ کرسی پر بادامی مخملی رنگ ہے۔ دونوں بازوؤں پر دو شیر تراشے ہوئے ہیں۔ نشست پر ہلکے سرخ رنگ کا ریشمی کپڑا منڈھا ہے۔

شاہ شجاع کے آہنی دستانے بھی ہتھیاروں کے سیٹ میں نظر آتے ہیں۔ دستانوں پر چاندی چڑھی ہوئی ہے۔ چاندی پر سونے کے پانی سے عربی میں اللہ میاں کے نام اور عربی جملے تحریر ہیں۔ پونچے کی طرف بسم اللہ تحریر ہے۔ کلائی پر ... کہنی کے قریب لافتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار مرقوم ہے۔ حاشیہ پر پوری آیۃ الکرسی لکھی ہوئی ہے۔

نواب آصف الدولہ بہادر کی توپ بھی یہاں رکھی ہوئی ہے۔ یہ توپ غالباً غدر لکھنؤ میں انگریزوں کے ہاتھ لگی ہوگی۔ اس توپ پر یہ جملہ تحریر ہے۔ سرکار آصف الدولہ بہادر وزیر الممالک ستم ...

امیر یعقوب خاں سابق والیٔ افغانستان کا اب خیمہ بھی یہاں لٹک رہا ہے۔ خیمے کے
وسط میں پوری بسم اللہ خط طغرا میں تحریر ہے۔ یہ خیمہ انگریزوں نے قندھار کے مقام پر لیا تھا
زنانہ لباسوں میں ایک پوشاک لکھنؤ کی آخری بیگم کی نظر آتی ہے۔ جس میں غرارہ و زنانہ
پاجامہ دوپٹہ اور محرم شامل ہے۔ دوپٹہ سبز ریشمی ملائم ہے جس پر موتی ٹکے ہوئے
کار چوبی لگے ہیں۔ کرتی لیس دار ہیں ... پاجامہ سرخ اطلس کا گھیر دار
ہے۔ کلی ... ہے۔ پوشاک کا اصلی رنگ ... چکا ہے۔ ... جا سکتا ہے کہ وہ
شدہ ہے۔ انقلاب زمانہ دیکھئے۔ بیگم لکھنؤ کی پوشاک اور لندن میں۔

برہما کی رانی کی خوابگاہ کا پلنگ بھی قابل لحاظ ہے۔ یہ پلنگ انگریزی کوچ سے زیادہ
ملتا جلتا ہے۔ پائے ایک بالشت اونچے ہیں۔ پاؤں کا وہ حصہ جو زمین کو چھوتا ہے پرندے کے
پنجوں کے مشابہ ہے۔ بینوں اور پایوں پر سرخ و سفید اور سبز شیشے بڑی صفائی سے جڑے
ہوئے ہیں سونے کے پانی میں یہ شیشے کچھ عجب بہار دیتے ہیں۔ یہ وہ پلنگ ہے جس پر
شاہ برہما کی رانی سوتی تھی۔

سلطان ٹیپو کی یہاں کئی یادگاریں ہیں۔ کوئی چیز اس قدر حسرت انگیز نہیں ہو سکتی جیسے
یہ چیزیں۔ اور جب کہ اس کے مقصد زندگی کا خیال بھی ذہن میں ہو۔ تو یہ چیزیں دل کو
گداز کرتی ہیں۔ یوں تو اس کا مزار ہندوستان میں ہے لیکن یہ چیزیں بھی مزار سے کچھ کم نہیں۔
یا یہ کہیئے وہاں ایک مزار ہے اور یہاں کئی مزار ہیں۔ اس مزار میں اس کا جسم دفن ہے اور ان
مزاروں میں وہ چیزیں دفن ہیں جو زندگی میں اس کے جزو بدن رہ چکی ہیں۔ اصلی مزار اس قدر
پائدار نہ ہوگا جس قدر یہ مزار پائدار ہیں۔

رہیگا کوئی تو تیغ ستم کے یادگاروں میں
مرے لاشے کے ٹکڑے دفن کرنا سو مزاروں میں

ایک صندوق میں اسکی شمشیر ہے۔ میان گم ہے۔ یہ تلوار ایرانی ساخت کی ہے۔ بالکل ہلالی شکل ہے۔ قبضہ پر سونا چڑھا ہوا ہے جس پر منقشی کام ہوا ہے جو ہندی ساخت کی تلوار پر بہت زیادہ ہے۔ قبضہ اور تلوار دونوں پرانے معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ قبضے کا سونا اور بیل بوٹے دونوں مٹتے چلے ہیں۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ تلوار ٹیپو کے زمانے سے پہلے کی بنی ہے۔ تلوار پر سنہری حرفوں میں لکھا ہوا ہے "ٹیپو سلطان" یہ کام بعد کا اور قبضے کے ہندوستانی ہونے کا۔ یہ وہ تلوار ہے جس کے زور سے سلطان ٹیپو ہندوستان کے دل مردہ کو زندہ کرنا چاہتا تھا جنگ آزمائی کہا جا سکتا ہے اور کیا عجب ہے کہ یہی تلوار اسوقت اس کے ہاتھ میں ہو جبکہ وہ سرنگا پٹم کے دروازے پر زخموں سے چور نقش بیجان ہو کر گرا۔ میان کا گم ہونا ہمارے خیال کی تائید کرتا ہے اور یہ بھی ظاہر کر رہا ہے کہ وہ اس کے سلاح خانے سے انگریزوں کے ہاتھ نہیں آئی۔

ایک صندوق میں ٹیپو کا آہنی خود ہے جس کے کناروں پر سونے کی بیل چڑھی ہے۔ لوہے کا بینی پناہ ہے جسکو پیچ کے ذریعہ سے اوپر چڑھایا جا سکتا ہے۔ بینی پناہ کے دونوں بازوؤں میں دو نلیاں ہیں جن میں دو نشان طرے اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ خود کے وسط میں ایک نوک نکلی ہے۔ دامن پر لوہے کی چادر جھالر کی طرح لٹک رہی ہے جس کو کڑیوں کے جیٹے سے خود کے ساتھ پیوست کیا ہے۔ یہ چادر چہرے کی طرف چار انگل چوڑی ہے لیکن پشت اور بازوؤں پر اس قدر چوڑی ہے کہ گردن اور کندھوں کی حفاظت بخوبی ہو سکے۔ یہ خود پرانی وضع کے خودوں سے زیادہ ملتا جلتا ہے تمام اس پر اس قدر عمدہ اور خوشنما ہیں کہ سلامی خودوں میں بہتر کہلایا جا سکے۔ اسی میوزیم میں اس سے اچھے اچھے خود ہیں لیکن ان کی تاریخ سے ہم ناواقف ہیں۔ برٹش میوزیم میں شاہ عباس صفوی کا ایک خود ہے جو تمام خودوں سے بہتر اور اعلیٰ ہے۔

ایک مقام پر ٹیپو کا ٹوپ ہے جو چمڑے کے استر پر ہے ایک انچ موٹی روئی بھری ہوئی ہے۔ جس پر چھینٹ کا استر ہے اس پر سبز اطلس منڈھی ہے۔ سبز مخمل کی آدھ انچ چوڑی گوٹ ہے پہننے پر یہ ٹوپ آدمی کی پیشانی ڈھانک لیتا ہے۔ گردن اور کندھوں کی طرف اس قدر نیچا ہے کہ گردن اور کندھوں کا بچاؤ ہو سکے۔ ٹوپ کے اندر فارسی میں کچھ تحریر ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا۔ انگریزی میں اس قدر بیان کیا ہے کہ یہ چیز زمزم کے مقدس پانی میں دھوئی گئی ہے اس سے کوئی حربہ اثر نہیں کریگا۔ اس عقیدے پر آج کی دنیا ہنسیگی لیکن یہ یاد رہے کہ ٹیپو کا زمانہ اور تھا اور یہ زمانہ اور ہے۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ مسلمان مذہب کی روشنی میں آنکھ کھولتے تھے۔ اور اسی روشنی میں آنکھ بند کرتے تھے۔

ایک خانے میں ٹیپو کے دستانے ہیں کہنی سے لیکر کلائی کے قریب تک یک طرفی جوشن کا کام دیتے ہیں کلائی پر بٹنوں کی طرح دو مہرے ہیں دو طرفہ حفاظت مقصود ہے جو کڑیوں کے ذریعے سے کھولے اور بند کئے جاسکتے ہیں۔ اندر کی طرف تسمے اور گھنڈیاں ہیں جنکو پہننے پر کس دیا جاتا تھا۔ ان دستانوں پر سونے کا کام ہوا ہے اور دمشقی بیل بوٹے ہیں۔

ایک خانے میں ٹیپو کا سینہ بند ہے جس سے سینے اور پشت کی حفاظت مقصود ہے۔ سینے کی طرف سے کھلا ہوا ہے اور بٹنوں کے بجائے کڑیاں لگی ہوئی ہیں جو ریشمی تسمے کے ذریعے سے کس دی جاتی ہونگی۔ یہ سینہ بند بھی ٹوپ کی طرح ایک انچ موٹا ہے اندر شاید چمڑا ہو۔ باہر کا استر سبز اطلس کا ہے جو پرزے پرزے ہو رہا ہے۔

• ٹیپو کا زین پوش۔ یہ زین پوش قرمزی مخمل کا ہے چار فٹ آٹھ انچ لمبا اور چار فٹ ساڑھے آٹھ انچ چوڑا ہے۔ مخمل پر نہایت اعلیٰ درجہ کا زری کا کام ہوا ہے۔ یہ کام کسی استاد کے ہاتھ کا ہے تمام میوزیم میں اس قدر صفائی کا نمونہ نہیں ملتا۔ بیل بوٹے اپنی وضع میں اعلیٰ درجے کے ہیں اور جو نزاکت اور ستھراپن کاریگر نے اس کام میں دکھایا ہے وہ لاجواب ہے۔ میوزیم نے

چالیس پونڈ میں اس زین پوش کو خریدا ہے۔

ایک چھوٹی سی پیتل کی توپ ہے جو ڈیڑھ گز لمبی ہے۔ توپ کے منہ پر گینڈے کی شکل بنی ہوئی ہے۔ یہ توپ سرنگاپٹم سے انگریزوں کے ہاتھ لگی۔ یہ توپ بھی سلطان ممدوح کی یادگار ہے۔

یہاں عجیب قسم کا ساز ہے جو اپنی وضع میں یکتا ہے۔ ارغنون کی شکل ہے۔ لکڑی کے ڈیڑھ گز لمبے اور پون گز چوڑے تختے پر ایک انگریز چت لیٹا ہے۔ جس پر ایک شیر سوار ہے۔ شیر کی دونوں ڈاڑھیں انگریز کی گردن میں گڑی ہوئی ہیں۔ اگلے پنجے سینے میں پیوست ہیں اور پچھلے پنجے زانوؤں میں۔ شیر کا جسم اندر سے خالی ہے۔ اس خالی مقام میں ایک کل رکھی ہوئی ہے۔ اس کل میں ہارمونیم کی طرح سے برابر قطار میں اٹھارہ پردے ہیں۔ پردوں پر تین تین انگل اونچی انگل انگل موٹی اٹھارہ نلیاں دوہری قطار میں ہیں۔ جن پر تانبے کا دو انچ چوڑا تار پردوں کے متوازی لگایا گیا ہے۔ پردوں کے اختتام پر ایک دندانہ دار چکر ہے جسکا تعلق ایک آہنی تار کے ذریعہ باہر کے دستے سے ہے۔ دستہ شیر کے بازو پر باہر کی طرف بنا ہوا ہے۔ دستے کو گردش دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اندر کا چکر حرکت میں آتا ہے اور اس کا اثر نلیوں اور پردوں پر پہنچتا ہے۔ شیر کی دم پر دو مروڑیاں ہیں۔ جن کے مروڑنے سے اندر کا تار کھلتا بڑھتا رہتا ہے۔ شیر کا جسم تختیوں کے ذریعے سے ڈھکا ہوا ہے۔ تختیاں اس قسم کی ہیں کہ انکو کھولا اور بند کیا جا سکتا ہے۔ یہ ساز سلطان ٹیپو کی تفریحِ طبع کے لئے ایجاد کیا گیا تھا۔ عیار موجد نے یہ کمال دکھایا ہے کہ اپنی اختراع کے ساتھ بھی سلطان کی اداشناسی اور مزاج دانی کو بھی نباہ دیا۔ یہ آلہ ہم کہہ سکتے ہیں کسی ہندوستانی کے دماغ کا نتیجہ تھا۔ اس کو یورپین مصنوعات سے کوئی مشابہت نہیں پردوں کا ڈھنگ ممکن ہے کہ ہارمونیم کے پردوں سے اڑایا گیا ہو اگر یہ ممکن ہو کہ اس وقت ہارمونیم ہندوستان میں رواج پا گیا تھا۔ ہارمونیم کے پردے طویل مربع ہوتے ہیں۔ لیکن یہ پردے

زمانۂ گذشتہ کے طرزِ بود و باش کے اس نمونے پر ہم اس عجائب خانے کی سیر ختم کرتے ہیں۔ جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اُس سے اس کی دلچسپیوں کا اندازہ ہو سکتا ہے اور ناظرین یہ خیال کر سکتے ہیں۔ کہ کتنی دفعہ جا کر گھنٹوں وہیں پڑے رہنے کے لئے سامان موجود ہے ایک ایک چیز لا انتہا سلسلۂ خیالات چھیڑتی ہے۔ اور ایک ایک خیال گھڑیوں بے چین رکھتا ہے۔ دل میں قوتِ احساس اور نگاہ میں شوقِ مشاہدہ درکار ہے ✣

محمود شیرانی (از لندن)

نالے بے چھیڑے ہوئے غیر کے پیدا نہ ہوا
میں لبِ نے کی طرح آپ سے گویا نہ ہوا

داغ کیا پاس کو بھی تجھ سے گوارا نہ ہوا
ایک دل پہ مرے کس کس کا اجارا نہ ہوا

نعمتِ اشکِ چکیدہ یہ فلک نے کھویا
کوہ دشت بھی کوئی میرا جو یا نہ ہوا

ہائے کیونکر نہ کروں میں گلہ محرومی
لاکھ ارمان تھے اور ایک بھی پورا نہ ہوا

عُمر بھر رشک عدو ساتھ رہا کہتا کیا حال
وُہ ملا بھی کبھی تنہا تو میں تنہا نہ ہوا

خوں رلاتی رہی بدفالی شادی ہر سو
زخم کی طرح مبارک مجھے ہنسنا نہ ہوا

خشک آنسو نہ ہوئے طعنۂ اعدا سُن کر
خاک اڑانے سے بیاباں کبھی دریا نہ ہوا

مثلِ شمعِ تہِ فانوس رہا جلوہ فگن
اُس نے پردا بھی کیا ہم سے تو پردا نہ ہوا

کیا کہوں مرتے ہیں کس بات پہ دُنیا والے
اے اجل مجھ کو تو جینا بھی گوارا نہ ہوا

کامل راہِ طلب قید سے دیکھے آزاد
موج سے سلسلہ برپا کبھی دریا نہ ہوا

تھے وُہ تصویرِ خیالی کہ سوا مٹنے کے
مُفت بھی کوئی خریدار ہمارا نہ ہوا

ظلمتِ دل ہے وہی لاکھ جلایا غم نے
پھونک دینے سے بھی اس گھر میں اجالا نہ ہوا

کیا کہوں جھوٹ کے ہیں اس گلِ تر سے تسلیم
صورتِ نکہت برباد کہیں کا نہ ہوا

ڈوشہ سوزِ آشنائی بشناختن نیرزد

یہ مصرع جو اس مضمون کا عنوان ہے۔ اُن اقوال کی مثال ہے جن میں شعراء ایک خاص جوش اور وجد کی حالت میں بہت سے جذباتِ انسانی کو چند لفظوں میں ظاہر کر دیتے ہیں یا بہت سے سالوں کے تجربے اور مشاہدے کو ایک مصرع یا ایک شعر کے تنگ حدود میں بند کر دیتے ہیں۔ شعر میں جو ایک غیر معمولی اثر اور قوت ہوتی ہے۔ جو بعض اوقات آدمی کے دل پر بطرح قابو پالیتی ہے وہ الفاظ کی ایک مناسب اور موزون ترتیب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن اس ترتیب کا مادہ خدا نے ہر شخص کو عطا نہیں کیا۔ اور سوائے اُن لوگوں کے جن کے حصے میں مذاقِ شاعری قدرت نے رکھا ہو۔ کسی کو یہ طاقت نہیں کہ محض لفظوں کے ہیر پھیر میں دلوں پر حاوی ہو جائے۔ مذاقِ شاعری سے مراد طبیعت کی وہ موزونیت نہیں جو عروض کے چند ابتدائی قواعد کے مطابق تک بندی کرنے تک محدود ہوتی ہے اور جس کا شمالی ہندوستان میں قریباً ہر باشندے کو عمر کے ایک نہ ایک حصے میں دعوی ہوتا ہے۔ بلکہ قدرت کا بنایا ہوا شاعر ہم اسکو مانتے ہیں جس کا دل شاعر ہو۔ دل کا شاعر ہونا اردو میں ذرا غیر مانوس محاورہ ہے اور اکثر لوگوں کے کان جو انگریزی نہیں پڑھے اس سے غالباً ناآشنا ہونگے۔ اس لئے اس کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ دل کے شاعر ہونے کے بظاہر تو معنے معلوم ہوتے ہیں۔ کہ دل غزلیں اور مخمس اور مسدس کہتا ہو۔ اور تاریخیں نکالتا ہو۔ اور ایک مثنوی عشقیہ بھی لکھ چکا ہو۔ ایک آدھ مرثیہ یا سلام بھی اس کی تصنیفات میں ہو۔ شعر کی جو مختلف صنائع ہیں اُن سے بھی واقف ہو۔ ایک سہرا بھی کسی کی مبارکباد کو نہ سہی۔ ذوق و غالب کے جواب میں ہی کہہ رکھے۔ اور کبھی کسی مشاعرے میں بھی پڑھا ہو۔ لیکن انگریزی میں شاعر

دل اور بھی معنے رکھتا ہے ۔

وہ دل جس میں درد ہو۔ رقت ہو۔ سوز ہو۔ گداز ہو۔ وہ دل جو قدرت اور اُس کے گوناگوں تماشوں میں اپنے ساتھ کچھ یگانگت پائے۔ وہ دل جو قدرت سے قادر کا پتہ لگاتا ہو وہ دل جو خالق کے سبب اس کی مخلوق کو بھلا جانے۔ وہ دل جو زندگی کے مقصد کا متلاشی ہو۔ اور وہ دل جو ان تمام مدارج کو طے کر کے خود فراموشی اور محویت کے ایک ایسے درجے پر پہنچے جس میں وہ عام انسانوں کے طبقے سے اوپر نظر آئے

یہ کہنے سے کہ انگریزی میں ہارٹ (دل) کے یہ معنے ہیں یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمارے شعرا میں ان اوصاف سے متصف شاعر نہیں گذرے۔ ہمارے شعرا میں سے بعض میں صانع قدرت نے یہ صفات کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کا پرتو اُن کے کسی نہ کسی شعر میں نمایاں ہیں۔ تشنے ہیں تو بہ امکان ہے۔ بلکہ مدعا یہ ہے کہ ان اوصاف کو لازمِ شاعری ٹھہرانا اور اُن اشخاص کو جو ان سے بے بہرہ ہوں۔ غیر شاعر سمجھنا اہل یورپ کی تی کتابوں میں دیکھا گیا ہے اور وہ وقت آگیا ہے کہ ہندوستان میں بھی ان اصولوں کی پابندی شروع ہو۔ اور جو لوگ اس معیار پر پورے نہ اتریں۔ ان سے شاعری کا خطاب چھین لیا جاوے محض قافیہ اور ردیف کے سمجھنے اور پرانی لکیر پر چلکر دو چار غزلیں کہہ دینے کا نام ہی شاعری نہ رکھا جاوے۔ اس سے ہمارے پرانے اعلیٰ درجے کے شعرا کی ناموری میں جیسے کہ میر مصحفی۔ ذوق۔ غالب۔ آتش۔ ناسخ۔ انیس۔ دبیر ہیں تو کوئی کمی نہیں آئیگی۔ لیکن بہت کچھ رطب و یابس جو ہمارے لٹریچر میں بھرا ہوا ہے۔ چھنٹ جائیگا۔ اور شاعری کے پہچاننے کا صحیح مذاق ملک میں پیدا ہو جائیگا۔ اور لوگ اس قابل ہو جائینگے کہ ایک ایسے مصرعے کو جو ان چند سطور کا زیب عنوان ہے۔ پڑھ کر محض اس کی لفظی خوبی اور بندش ہی کو نہ دیکھیں گے بلکہ ان خیالات پر بھی غور کرینگے جن کے ہجوم کرنے سے شاعر کی زبان پر مصرع

مگر وہاں بھی ناکامی نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا ہو۔ کوئی اور ترکیب سوچی ہو۔ مگر پھر بھی تیر نشانے پر نہ بیٹھا ہو۔ آخر ملاقات ہوئی ہو۔ اب ملاقات بڑھانے کی فکر ہو۔ مگر جس کا یہ مشتاق ہو وہ اس سے دور دور کی سلام علیک ہی پسند کرے۔ مشکلوں سے اس نے ربط بڑھایا ہو۔ پھر ربط بڑھنے کی حالت میں چند امتحانات اس پر آ پڑے ہوں اور اُن میں بھی یہ پورا اُترا ہو۔ اور عین اُس وقت جب وہ یہ سمجھے کہ جسے میں چاہتا تھا وہ میرا ہو لیا تو کوئی ایسی غلط فہمی درمیان آ جائے کہ شخص موصوف پھر بدگمان ہو جائے اور منانے سے نہ منے اور بات ایسی بگڑے کہ بنائے نہ بنے۔ کیا یہ اس حالت میں اس کے منہ سے بے ساختہ نہ نکل جائیگا؛ کہ ع

دو سہ روزِ آشنائی بشناختن نیرزد

کیا اُس کو وہ دو چار دن جو باہم ارتباط میں گذرے اس زمانہ دراز کے سامنے جو اِشتیاق میں گذرا تھا بہت ہی کم نہ نظر آئینگے؟ اور کیا وہ یہ نہ کہیگا کہ "شناختن" کی تکلیف کی قیمت بھی ادا نہ ہوئی۔

اِس سے بھی زیادہ تصدیق کی ضرورت ہو تو کسی ایسے شخص کو ڈھونڈھو جس نے ایسی تلاش سے جیسی اوپر بیان کی گئی ہے بیس بائیس سال میں دو چار دوست پیدا کئے ہوں۔ جس نے اس عرصے میں والدین اور اعزہ اور اقربا کی بے غرض محبت کی قدر کرنی سیکھی ہو۔ اور جس کے دل میں اس کے جوش زندگی کے نیک ارادے ہوں۔ جس نے بہت انتظار کے بعد اپنے مطلب کی بیوی پائی ہو۔ اور نکاح کے بعد یہ محسوس کیا ہو کہ دنیا میں پوری خوشی باعصمت و تعلیم یافتہ بیوی کے مل جانے سے ہے۔ اور جس نے مناسب نکاح کا پہلا اور سب سے عمدہ میوہ ایک صحیح اور خوش رو بچہ ابھی ابھی دیکھا ہو۔ اور جو بچپن سے لیکر اس وقت تک کے دراز عرصے میں دنیا کی سب چیزوں سے محض آشنا ہوا ہو اور اس آشنائی کے لطفوں کے کچھ عرصے تک حاصل کرنے کے خیال میں ہو۔ کہ اچانک اسے پیام اجل

آجائے۔ اور وُہ تمام اُمیدوں اور آرزوؤں کو خیرباد کہتا ہُوا اور در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتا ہُوا عالمِ بالا کو سدھارنے لگے۔ اگر اس وقت کان لگا کر اُس کی کمزور آواز سنو یا اگر لب بند ہوں تو اس کی صدائے دل سنو تو یہ کہہ رہا ہو گا۔ کہ ع

دو سہ روزہ آشنائی بشناختن نیرزد

اچھا ان خیالی مثالوں کو چھوڑ کر سر سید احمد خاں مرحوم کی واقعی مثال کو لیں۔ ان کے بچپن کو دیکھیں۔ اس جوانی پر نظر ڈالیں۔ اس کے ادھیڑپن کے زمانے پر غور کریں۔ اور اس کے بڑھاپے کو خیال میں لائیں۔ شروع سے یہ دھن اس کے سر میں سمائی ہُوئی تھی کہ قوم مسلمان جو علوم زمانہ حال سے نفور ہے۔ ان کی طرف راغب ہو۔ جہالت اور مذہب کی نسبت توہمات بیجا اور خیالاتِ باطل جو ان کے دلوں میں گھر کئے ہُوئے ہیں۔ ان سے دُور ہوں۔ وُہ اسلام کی حقیقت کو پہچانیں۔ اور اس کے اصُول پر کاربند ہوں۔ اور اُن بدعات کو جو دوسری اقوام کی رسُومات کے اثر سے اُن میں پیدا ہُوئی ہیں چھوڑیں۔ اسلام کی وقعت غیر قوموں کے دلوں میں پیدا ہو۔ اور اس کی شان بڑھے۔ اس دُھن کے پُورا کرنے کے لئے سید مرحوم تمام العمر محنت کرتا رہا۔ گالیاں کھاتا رہا۔ بدنامی سر پر لیتا رہا۔ کفر کے فتوے سنتا رہا۔ اور جب وُہ زمانہ قریب آیا کہ اپنی محنت کا ثمرہ اُٹھائے۔ لوگوں میں وُہ شوق جو وُہ پیدا کرنا چاہتا تھا پیدا ہونے لگا۔ اُس کی نیکنامی شروع ہُوئی۔ اُس کی تکفیر کے فتوے بند ہُوئے اقوامِ غیر بھی مسلمانوں کو قوموں میں شمار کرنے لگیں تو مشیتِ ایزدی میں یہی آیا۔ کہ اس کا وقت ختم کر دیا گیا۔ کیا وہ دو سہ روزہ آشنائی جو سر سید مرحوم کو قومی ترقی کے آثار سے ہُوئی اُس محنت کا جو "شناختن" میں صرف ہوتی تھی معاوضہ ہو سکتی ہے۔ گو اُس کو اس تسلّی نے کہ کام شروع ہو گیا ہے خواہ تکمیل اس نے نہ دیکھی۔ شاید اس مصرعے کو تسکاتاً پڑھنے سے روک لیا ہو۔

تحصیل علوم و فنون میں یہی حال نظر آتا ہے کہ تحصیل کا عرصہ اُس عرصے سے جس میں اس

تحصیل سے فائدہ اُٹھایا جائے عموماً کم ہوتا ہے۔

مثلاً کسی علم کی تکمیل کے لئے تو کم از کم ایک عمر چاہیے۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص عمر بھر صرف کرکے بڑھاپے کے قریب اُس علم سے کماحقہٗ آشنائی حاصل کرتا ہے پس وہ دن جن میں وہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اتنے تھوڑے ہیں کہ محنت کے زمانہ کا پورا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ فرض کرو کہ ایک طبیب پچاس سال کے تجربے سے مرض کو پہچاننے میں تھوڑا سا ملکہ حاصل کرتا ہے۔ مگر جلد وہ تجربہ اس کے ساتھ ہی قبر میں چلا جاتا ہے اور اس سے دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔ ایک علم کیمیا داں عمر بھر کی محنت شاقہ کے بعد کبھی ڈسکوری کرتا ہے یا کوئی ماہر علم طبیعیات کوئی نئی اور مفید ایجاد کرتا ہے۔ یا فلسفی کوئی تھیوری ثابت کرتا ہے۔ اتنے میں پیمانہ عمر لبریز ہو جاتا ہے۔

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تو عام دستور ہے جو سب پر کم و بیش اثر کرتا ہے کہ آشنائی میں محنت کرنی پڑے اور شناختن کے بعد لطف یا فائدہ اٹھانے کے دن کم ہوں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلنا چاہیے کہ اس خیال سے وہ محنت ہی نہ کریں۔ وہ تو مایوسی کی حالت میں انسان کے دل سے یہ نکل جاتا ہے کہ کاش ان کی عمریں ہزار برس ہوتیں تاکہ یہ مزید دیکھنا نصیب ہوتا۔ اس اظہار ناراضگی سے طبیعت ایک گونہ تسلی پاتی ہے۔ مگر ایسے بیتابانہ الفاظ یا فقرات کبھی نت سعی نہیں سوچتے کیونکہ دنیا میں اصلی راحت تو سعی میں ہے۔ گو انسان ہر وقت بہشت کو نہیں سمجھتا۔ اور شاعر نے جب ایسی ہی مختلف خیالات کے ہجوم سے جنکے نمونے اوپر لکھے گئے ہیں۔ بے ساختہ مصرع کہا تو اسکا مقصد یہ تھا کہ یہ خیال کہ حصولِ مدعا کے بعد اس کا لطف چند روزہ ہوتا ہے۔ اور دنیاوی چیزیں بہرحال چند روزہ ہیں ہر وقت پیشِ نظر رہے۔ اور اس خیال سے وہ فرصت کو غنیمت سمجھ کر آشنائی کے حصول میں اتنا وقت ضائع نہ کردے جتنا بعد کے زمانہ الطفول کی امید ہونے کی صورت میں کوئی کر سکتا ہے۔

اور نیز یہ کہ جب سعی کی کوششوں کا حاصل اس سے چھینے لگے تو وہ بالکل ہاتھ سے نہ دے بیٹھے بلکہ اس خیال سے تسلی پاکر کہ آشنائی تو اپنے پہری میں دو سہ روزہ تھی ۔

(عبد القادر)

خدا کی ہستی

سقراط حکیم نے سن رکھا تھا کہ ارسطو دیموس نہ قربانی کرتا ہے۔ نہ نماز و وظیفہ پڑھتا ہے۔ نہ مندروں کے پجاریوں کی وساطت سے پیش آنے والی باتوں کی نسبت دیوتاؤں کا منشا دریافت کرتا ہے۔ بلکہ اور لوگ جو ایسا کرتے ہیں ان پر ہنستا ہے۔ اس لئے موقع ملنے پر اس نے ارسطو دیموس کے ساتھ اس طرح گفتگو کا سلسلہ چھیڑا:۔

س۔ ارسطو دیموس! کوئی شخص ایسے بھی ہیں جن کی لیاقت کی وجہ سے تم ان کی قدر کرتے ہو؟

ا۔ ہاں! کیوں نہیں:

س۔ بھلا ان کے نام تو لو۔

ا۔ ہومر رزم و بزم کی نظم میں۔ ملیناپدیس۔ رندانہ و مستانہ غزلخوانی میں۔ سفوکلیز۔ اندوہناک ناٹک میں۔ پولی کلیطس۔ بت تراشی میں۔ زیوکسس نقاشی اور مصوری میں۔

س۔ بھلا تم کن استادوں کو تحسین و آفرین کے لائق خیال کرتے ہو۔ آیا ان کو جو بیجان اور بے روح صورتیں اور مورتیں بناتے ہیں۔ یا ان کو جو ذی روح اور ذی حیات بناتے ہیں کہ اپنی مرضی سے چلتے پھرتے ہیں اور گویائی و نطق سے بہرہ ور ہیں؟

ا۔ بیشک آخرالذکر کو۔ بشرطیکہ وہ عقل و شعور سے کام لیتے ہوں۔ اور اتفاقات و حادثات کے بھروسے پر نہ بیٹھے ہوں۔

س۔ بعض چیزیں ہیں کہ انکی نسبت ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیوں بنائی گئی ہیں۔ بعض اور چیزیں

ہیں کہ صریحاً اچھی اور مفید ہیں۔ ان دونوں فریقوں میں سے تم کس کو عقل و شعور کا کام کہو گے اور کس کو اتفاق کا؟

ک۔ معقول بات تو یہ ہے کہ جو چیزیں صریحاً اچھی اور مفید ہیں انکو عقل و شعور کا کام جانیں

س۔ تو کیا تم نہیں خیال کرتے کہ جس صانع نے آدمی کو دیکھنے کے لئے آنکھ۔ سننے کے لئے کان۔ اور اور چیزوں کے جاننے کے لئے باقی حواس دیئے اسکو انسان کی مصلحت اور منفعت منظور تھی؟ خوشبوئیں کس کام آتیں اگر ان کے آنے کی سبیل یعنی ناک نہ ہوتی؟ حلق اور تالو کے مزے کس طرح لیتے اگر زبان میں مزا لینے کی قابلیت اور تمیز نہ رکھی جاتی؟ آنکھ کیسی نازک شے ہے؟ اس کی حفاظت کے لئے پپوٹے ہیں۔ کہ دیکھنے کے وقت کھلے رہتے ہیں اور سوتے ہی مند جاتے ہیں۔ کیا اس انتظام میں تم کو پیش بینی اور پیش بندی کا گمان نہیں گذرتا؟ دیکھو تو سہی کس خوبی کے ساتھ پلکیں خاک دھول کو آنکھ کے اندر جانے سے روکتی ہیں اور بھویں پیشانی کے پسینے کو بہکر آنکھوں کے اندر اترنے اور خلش کرنے سے باز رکھتی ہیں! کس حکمت کے ساتھ کان کو بنایا ہے کہ کل آوازوں کا خیر مقدم کرتا ہے اور ایک کو دوسرے کا سد راہ نہیں ہونے دیتا۔ جانداروں کے جبڑوں کو دیکھو کہ آگے کے دانت نوالہ کترنے اور پیچھے کی ڈاڑھیں اس کو نرم کرکے حلق سے اترنے کے قابل بنانے کے لئے کتنی موزوں ہیں! منھ کو آنکھ اور ناک کے تحت میں رکھا ہے۔ تاکہ اس کو ہدایت ہوتی رہے کہ کونسی چیز اندر لے جانے کے کام کی ہے اور کونسی نہیں ہے۔ یہ بات بھی غور کے قابل ہے کہ جو اشیا حواس کو پراگندہ کرنے والی ہیں ان کو حواس سے کتنا دور رکھا گیا ہے۔ پس جہاں یہ احتیاط اور انتظام موجود ہے۔ وہاں تم کو اس بات کے بتانے میں کیا تامل ہو سکتا ہے کہ آیا یہ پیش بینی کا نتیجہ ہے یا محض اتفاق و حادثات کا؟

ا - مجھے اس بارے میں ہرگز ہرگز کوئی تامل نہیں ہے۔ میں جس قدر غور و فکر کرتا ہوں اسی قدر میری طبیعت یہ کہتی ہے کہ یہ سب کچھ کسی ایسے صانع کی قدرت کاملہ کا نمونہ ہے جو نوعِ انسان کو سب سے عزیز رکھتا ہے۔

س - بھلا اس باب میں تمہاری کیا رائے ہے کہ اس نے جاندار میں اپنی نسل کے بڑھنے کی خواہش پیدا کی ہے۔ ماں میں اولاد کی الفت اور تربیت بھی ہے۔ اور پیدائش کے وقت سے اخیر دم تک ان کو حیات زندگی پر جان دیتے ہیں اور موت سے ڈر پیدا ہوتا ہے؟

ا - ارے کیا ہوئی سوائے اس کے کہ اس نے ان کی ذات و نوع کے قیام کا پورا پورا انتظام کر دیا ہے؟

س - تو ابھی تو خاتمہ نہیں ہو گیا۔ ابھی جیسے چلو جواب دیتے جاؤ۔ شاید تم بھی مجھ سے کوئی سوال پوچھنے لگو۔ مجھے یقین ہے اس بات سے تو تم بے خبر نہیں ہو کہ تم کو عقل و شعور عطا کیا گیا ہے۔ پھر کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ اور کوئی صاحب عقل و شعور ہستی ہی نہیں؟ ذرا سوچو تمہارا بدن ایک مٹی کا ہے اس تودہ عظیم کی جو تمہارے سامنے موجود ہے۔ تو کیا اس سے یہ مٹی خمیر ہوئی ہے ایک قطرہ ہے اس بحر ناپیدا کنار کا جو کل روئے زمین پر محیط ہے۔ گویا تمہارا جسم ایک ذرہ ہے اس مجموعہ عناصر کا جس بے اندازہ مقدار دنیا میں موجود ہے۔ پس اگر کوئی اور صاحب عقل و شعور کہیں نہیں ہے تو تمہارا عقل و شعور ہی ایک ایسی شے ہوئی جو تمہارے نصیب سے نہیں معلوم کہاں سے تم کو مل گئی۔ اور تم شاید یہ کہو گے کہ یہ تمام کائنات اور یہ کل اجسام و اجرام کسی صاحب عقل و شعور کی مدد کے بغیر آپ ہی آپ یونہی مرتب و منظم ہو گئے ہیں؟

ا - میری سمجھ میں تو اور کوئی بات آتی نہیں۔ دنیا میں جو چیز ہم بنتی ہوئی دیکھتے ہیں اسکا

بنانے والا بھی نظر کے سامنے موجود ہوتا ہے۔ تم کہتے ہو دنیا اور اس کے کل کارخانے کو دیوتاؤں نے بنایا ہے اور وہی ان کا انتظام کرتے ہیں۔ مگر وہ دیوتا ہیں کہاں؟ کہیں نظر تو نہیں آتے۔

س۔ تم اپنی روح کو بھی تو نہیں دیکھتے جو تمہارے جسم کی حاکم ہے۔ لیکن نظر نہ آنے کے سبب سے کیا تم یہ نتیجہ نکالو گے کہ تم جو کام کرتے ہو وہ روح کی تحریک اور ہدایت کے بغیر خود بخود ہی چلا جاتا ہے؟

ا۔ (کچھ تذبذب کے ساتھ) میں خدا کی تحقیر تو نہیں کرتا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس کی ذات ایسی کامل اور غنی ہے کہ اس کو میری اور میری بندگی کی ضرورت نہیں ہے۔

س۔ یہ سراسر غلطی ہے۔ باایں کمال و استغنا جب دیوتا تمہارا اتنا خیال کرتے ہیں تو تمہارا فرض ہے تم بھی انکی اتنی ہی حمد و ثنا کرو۔

ا۔ مجھے اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ دیوتا انسانوں کے کاروبار میں دلچسپی ظاہر کرتے ہیں تو میں ہرگز ان کی بھینٹ پوجا میں کوتاہی نہ کروں۔

س۔ ہیں! ابھی تم کو یہی یقین نہیں ہے کہ دیوی دیوتا انسانوں پر کیا کیا احسان کرتے ہیں! دیکھنے۔ سننے۔ چکھنے کی قوت تو جیسی اور جانوروں کو دی ہے ویسی ہی ہمیں دی ہے۔ مگر ٹانگوں پر کھڑا ہو کر چلنے کا شرف کیسا ہے؟ جانوروں کو تو یہ شرف نہیں ملا۔ اس سے انسان کو کتنے فائدے ہیں! اسی کی بدولت آگے دیکھتا ہے۔ دور کی چیز تاک سکتا ہے۔ چوپائے اپنی ٹانگوں سے چلنے کے سوا اور کوئی کام نہیں لے سکتے۔ انسان پر اس معاملے میں بھی نفس علوی کا بڑا احسان ہے۔ اس کو ہاتھ بھی دیئے ہیں کہ ان سے ہزاروں بڑے بڑے مفید کام لیتا ہے۔ اور فضیلت کے علاوہ بے حد مسرت

حاصل کرتا ہے۔ جانوروں کو زبان دی گئی ہے۔ مگر کلام کی طاقت ان میں نہیں ہے بلکہ زبانِ انسانی ہی پر موضوع ہوتا ہے۔ جو اس کے خیالات کو ظاہر کرتا ہے اور دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا تو ذکر ہی کیا ہے کہ انہوں نے اور جانوروں کی لذت و راحت کو خاص خاص قتوں اور موسموں کے تابع رکھا ہے۔ وہ انسان کے لیئے یہ سب قیدیں ہٹا دی گئی ہیں۔ ہر قسم کی راحت ہر وقت میسر ہوتی ہے اور ہر نوع کی لذت ہر موسم میں روا ہے۔

خدا نہ صرف ہمارے جسم کی خبر لیتا ہے۔ بلکہ ہماری روح کی بھی خبر لیتا ہے۔ اس خلاقِ کل نے ہمیں نہ صرف جسمانی فضیلت دی ہے۔ بلکہ روحانی بخشش جس سے کہ انسان پروری ظاہر ہوتی ہے وہ روحِ ناطق ہے جو اس نے ہمارے قالب میں پھونکی ہے۔ اور روح بھی جسے اشرف الارواح کہنا چاہئے۔ کیونکہ اور کونسی ذی روح خدا کو جان سکتی ہے اور اس کی قدرت کے کارخانوں کو پہچان سکتی ہے؟ کیا انسان کے سوا کوئی اور ذی حیات بھی ہے جو خدا کی بندگی کرتا اور اسے پوجتا ہے؟ کونسا جانور ہے جو آدمی کی طرح بھوک پیاس سردی گرمی سے اپنا بچاؤ کر سکتا ہے؟ اور کونسا جانور ہے جو آدمیوں کی طرح بیماری کی دوا کر سکتا ہے۔ اپنے قوا سے کام لے سکتا ہے تحصیل علم کر سکتا ہے۔ اور اپنی دیکھی بھالی سنی سنائی باتوں کو تمام و کمال یاد رکھ سکتا ہے؟ اگر اسکی جسمانی اور روحانی فضیلتوں کا خیال کیا جائے تو انسان اور جانداروں کے مقابلے میں الوہیت کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اگر اس کو بیل کا جسم دیا جاتا تو اس کی فہم کی رسائی کس کام آتی۔ منصوبے اور تدبیریں سوچ لیتا لیکن انکی تعمیل بیل کیونکر کرتا؟ برعکس اس کے بیل کو انسان کا جسم ملتا اور عقلِ انسانی نہ دی جاتی تو دیگر بہائم سے کس بات میں افضل ہوتا؟ دیکھو تو سہی دیوتاؤں نے عمدہ سے عمدہ جسم تم کو دیکر کیسی لطیف ترین

و شریف ترین رُوح اُس میں پھونکی ہے! کیا اب بھی تم یہی کہے جاؤ گے کہ وُہ تمہاری کچھ خبر نہیں لیتے؟ دیوتاؤں سے تم کیا چاہتے ہو جو تمہیں یقین ہو کہ ہاں وُہ تمہاری خبرگیری کرتے ہیں؟

ا۔ مَیں چاہتا ہُوں کہ جس طرح تمہارے بیان کے مطابق تمہارے پاس اُن کے پیغام آتے ہیں میرے پاس بھی آیا کریں اور مجھے بھی وُہ براہِ راست مطلع کرتے رہیں کہ مَیں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔

س۔ کیا جب وُہ ایتھنز کے کل باشندوں کے لئے کوئی ہدایت کرتے ہیں تو تم یہ خیال کرتے ہو کہ وُہ تم سے مخاطب نہیں ہیں؟ جب غیر معمولی حادثات و کرامات کے ذریعے سے وُہ کل اہلِ یونان کو آنے والے واقعات سے متنبہ کرتے ہیں تو کیا وُہ تمہاری طرف سے خاموش ہیں اور ایک اکیلے ارسطادیموس ہی کو بھول جاتے ہیں؟ لوگوں کے دلوں میں جو انہوں نے یہ اعتقاد پیدا کر دیا ہے کہ رنج و راحت سب دیوتاؤں کی طرف سے ہے وُہ رنج و راحت پر قادر ہونے کے بغیر ہی پیدا کر دیا ہے؟ کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ اگر یہ محض دھوکا ہوتا تو انسان آخر کب تک اس سے بے خبر رہتے اور اِس سے اپنے تئیں نہ بچاتے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ قدیم سے قدیم اور عاقل سے عاقل قومیں خُدا پرست ہوتی رہی ہیں۔ اور ہر ایک انسان کی عمر میں خدا پرستی کی خواہش درجۂ کمال کو اسوقت پہنچتی ہے جب اُس کی عقل پختگی کی سمت [illegible] ہوتی ہے؟ اے عزیز! دھیان کر کہ تیرا نفس کس طرح سے تیرے جسم پر اپنی مرضی کے موافق حکمراں ہے۔ اور یقین کر کہ اسی طرح ایک روح ہے جو کل عالم پر حاوی ہے اور اسکو اپنی مرضی کے موافق چلا رہی ہے۔ اس خیال کو دل سے نکال ڈال کہ تیری ناقص آنکھیں تو کوسوں دُور کی چیز کو دیکھیں اور خدا تعالیٰ ایک ہی وقت میں سب چیزوں کو نہ دیکھ سکے

یہ خیال کرکے میں ایسے نادر مصرف اور مسلی کے معاملات پر جامعیت کے ساتھ غور و فکر کرسکتا ہوں اور خدائے عزوجل کل کائنات کے معاملات پر ایک ہی وقت میں غور نہیں کرسکتا۔ انسان کی احسانمندی کا امتحان جب ہوتا ہے کہ اُس کے ساتھ کوئی سلوک کیا جائے۔ اس کی دانائی کی آزمائش یوں ہوتی ہے کہ اس سے کسی مشکل اور پیچیدہ معاملے میں مشورہ طلب کیا جائے۔ اسی طرح اگر تم خدا کی قدرت اور مخلوق پروری کا ثبوت چاہتے ہو تو سچے دل سے اس کی بندگی اور پرستش کرو۔ اس وقت تجھ کو یقین کامل ہوجائیگا کہ خدا سب کو دیکھتا ہے۔ سب کچھ سنتا ہے ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔ اور کل کائنات کا انتظام و انصرام کرتا ہے۔

جیارام

کولرج کے اقوال

(۱) اگر یہ سچ ہے کہ انسان کی مصیبتیں اس کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ تو یہ بھی سچ ہے کہ بعض اوقات انسان کی بداعمالیاں مصیبت کی بدولت ہوتی ہیں۔

(۲) میرے ایک دوست کا یہ قول تھا کہ کوئی عقیدہ یا رائے اسوقت تک بچے کے ذہن نشین نہ کرنی چاہئے جب تک کہ وہ سن تمیز کو نہ پہنچ جائے اور اپنے لئے پسند کرنے کی قوت اس میں پیدا نہ ہوجائے۔ ایک دن میں نے اسے اپنے باغ کی سیر کرائی جسکو دیکھکر وہ بولا۔ کہ یہ باغ کس کام کا ہے۔ اسمیں تو تمام خس و خاشاک اُگ رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ یہ باغ ابھی تک سن تمیز کو نہیں پہنچا۔ جھاڑ جھنکار خس و خاشاک اُگ آئے ہیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے تعصب کو دخل دوں اور اس میں بجائے گلاب چنبیلی لگاؤں

خوشی

دُنیاوی خوشی کیا ہے؟ کیا وہ خیالی صورت جس کا ذکر تو ہم نے ہزاروں مرتبہ سُنا مگر دیکھا ابھی نہیں؟ کیا وہ جس کے وعدے ہم سے ہمیشہ ہوتے ہیں اور ہمیشہ ٹوٹتے ہیں اور پھر بھی ہم اس کے وعدوں کا یقین کر لیتے ہیں؟ کیا وہ جو بلا کسی حقیقت کے صرف باتوں ہی باتوں میں بہلاتی ہے اور پھل کے بجائے صرف پھول ہی میں ٹالدیتی ہے؟ جو لوگ اس کے مزے سے محروم ہیں وہ اس کے مشتاق ہیں مگر جو اُس کا لُطف اُٹھا سکتے ہیں وہ اسکو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ **امّید** اس کی علمبردار ہے مگر مایوسی بھی اس کے ہمرکاب ہو۔ امید ہمارے تخیل پر مبنی ہے اور اس کے حصول کا ہمیں یقین دلاتی ہے مگر مایوسی ہمارے تجربہ کا نتیجہ ہے اور ہم مجبوراً اس کی بات کو صحیح مانتے ہیں۔ زندگی کے رقص کی تمام حرکات خوشی پر مبنی ہیں جو ہمیں پیچیدہ راستوں اور ٹیڑھی گھاٹیوں میں گھسنے کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ مگر وہ ہم میں سے کسی دو افراد کو بھی ایک ہی راستہ سے نہیں لیجاتی۔ ارسطپس[1] اسکو نفسانی حظائظ میں ڈھونڈھتا ہے۔ سقراط[2] صرف حکمت میں اُسے پاتا ہو اور اپی کیورس[3] ان دونوں کو اس کا سرچشمہ بتلاتا ہے۔ غرض اُس نے ہر ایک پر اپنا

---

[1] ارسطپس ( ) حضرت مسیح سے چار سو برس پہلے یونان میں پیدا ہوا۔ اور سقراط کا شاگرد بنا۔ اُس کا طریقہ زندگی اپنے اُستاد کی رائے اور عمل کے برخلاف عیاشانہ اور رندانہ تھا۔ اور محض نفسانی خوشی کو نیکی سمجھتا تھا۔

[2] سقراط ۴۶۹ سنہ قبل مسیح پیدا ہوا۔

[3] اپی کیورس یونانی فلسفی حضرت مسیح سے ۳۴۱ برس پہلے پیدا ہوا فلسفہ کی تحصیل ایتھنس میں

مقناطیسی اثر کیا لیکن کسی کو نگاہِ تلطف سے نہیں دیکھا۔ اگرچہ یہ لوگ بھی بہت سے اور طالبین کی طرح اُس کے خاص لطف کی لاف زنی کرتے رہتے۔ اس کی ناکامیابی دیکھ کر سٹوِاک[۵] فرقہ نے اُس کے حصول کا ایک نیا اور عجیب طریقہ نکالا یعنی اس کا طالب رہنا مگر اُسے بُرا کہہ کر اُس کے حصول کی طرف تکنا مگر اُس سے احتراز کرکے۔ غرض اُن کا تکبرانہ خیال یہ تھا کہ جتنا اُس سے بچا جائے۔ اور جتنا اُس سے بھاگا جائے۔ اتنی ہی وہ

بقیہ حاشیہ۔۔ کی وہ ۲۰۶ قبل مسیح میں ایتھنس میں ایک باغ خرید کر وہاں سکونت اختیار کی اور اپنی تعلیم جاری کی۔ اسکی بڑی تعلیم یہ تھی۔ کہ اخلاق میں صرف خوشی سے بڑی نیکی ہے۔ اور خوشی عقل کی مدد سے حاصل کرنی چاہیے۔ کیونکہ دانائی سب خوبیوں میں افضل ہے۔ اور صرف اخلاقی نیکیوں سے خوشی میسر آتی ہے۔ رُوح کے غیر فانی ہونے سے اُس نے انکار کیا۔ دیوتاؤں کے وجود کو تسلیم کرتا تھا مگر کہتا تھا کہ انسانی معاملات سے وہ تعارض نہیں کرتے۔ اسکی تصانیف سب معدوم ہو گئیں کچھ باقی ہیں ۲۷۰ قبل مسیح انتقال کیا۔

[۵] زینو۔ ایک یونانی فلسفی سٹواک فرقہ کا بانی تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش نامعلوم ہے مگر غالباً ۳۵۵ قبل مسیح پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک سوداگر تھا اور اس نے اس کی پرورش بھی اپنے پیشہ کے مطابق کی ایک ناگہانی حادثہ سے جیسے سوداگروں کو اکثر پیش آیا کرتے ہیں وہ مفلس ہو گیا۔ اور اس نے فلسفہ کی تحصیل شروع کی۔ مختلف مقامات میں مختلف فلسفیوں کے لیکچر سنے۔ مگر کسی سے اطمینان قلبی نصیب نہ ہوا۔ آخر خود بیس برس تک محنت شاقہ کے بعد حق کی تلاش کرتے کرتے اس نے اپنی ایک جدا تعلیم اختیار کی۔ زینو نہایت کمزور اور منحنی سا آدمی تھا۔ اور اس کے چہرے سے تفکر ظاہر ہوتا تھا۔ نہایت پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے کے بعد ۹۸ برس کی عمر میں فوت ہوا۔ اس کے ہم وطن اس کی بے انتہا عزت کرتے تھے اسکی تعلیم عملی زندگی کے مطابق تھی۔ یعنی آدمی کا بڑا مقصد صحیح عقل کے مطابق بسر کرنا ہے۔ نیکی یعنی کمالِ انسانیت صرف دانائی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ صرف نیکی ہی خوشی کی بنیاد ہے۔ تمام نیک کام یکساں نیک ہیں۔ اور تمام بُرے کام یکساں بُرے ہیں۔ نفسانی جذبات کو مغلوب کرنا اور اُن سے آزاد رہنا کمالِ انسانیت ہے۔ اسکی شاگردوں نے اسکی تعلیم کو بہت پھیلایا۔ کیونکہ اسکی تعلیم نہایت پسندیدہ اور نہایت ہر دلعزیز تھی ۲۶۳ قبل مسیح وفات پائی ۱۲

دنیا توجہ کرتی ہے اور ہمارے پیچھے دوڑتی ہے۔ اے خوشی تو بھی ایسی ہی دھوکہ دینے والی ہے جیسے وہ سکون جو طوفان کے آنے سے پہلے عالم پر چھا جاتا ہے۔ تو بھی طوفان کی تبسم کن بیٹی یعنی قوس قزح کے مانند خوشنما ہے۔ لیکن صحرا میں سراب کی طرح تو ہمیں تشنہ کیے رکھتی ہے جسکو نا امید زیادہ کرتا ہے اور قریب ستا دیتا ہے۔ ہم بغیر تلاش کے اکثر تو میسر آجاتی ہے۔ اور جب تیری کوئی توقع نہ ہو تو تو آن موجود ہوتی ہے۔

جو لوگ نہایت سرگرمی سے خوشی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ان سے وہ کوسوں بھاگتی ہے۔ کیونکہ وہ اسے وہاں ڈھونڈتے ہیں جہاں وہ ہوتی نہیں۔

انٹونی[1] نے اسکو محبت میں ڈھونڈا۔ بروٹس[2] نے جاہ و جلال میں۔ اور سیزر[3] نے حکومت میں لیکن پہلا بے عزت ہوا۔ دوسرا افسردہ کیا گیا۔ تیسرا احسان فراموشی کا شکار ہوا۔ اور تینوں کے تینوں مایوس ہو کر بری طرح ہلاک ہوئے۔

بعض اوقات وہ عنایت کرتی ہے مگر جب انہیں مزے میں غرقاب پاتی ہے تو فوراً لطف کی نگاہ کو بے رحمی سے بدل دیتی ہے۔ کسی کو وہ اپنی شیریں شراب کے جام پر جام دیتی ہے۔ اور

[1] انٹونی مصر کی ملکہ کلیوپیٹرا کا سچا عاشق تھا۔ مسیح سے چالیس یا پچاس برس پہلے ہوا ہے ۱۲

[2] بروٹس ایک مشہور رومن ہے جو سیزر کے قتل میں شریک تھا۔ ابتدا میں اسکو سیزر سے بڑی محبت تھی اور اس کا دلی دوست تھا۔ سیزر بھی اس پر پورا اعتماد کرتا تھا مگر اس نے قومی جوش میں آکر سیزر کے خلاف سازش کی اور اسکو قتل کرایا مگر پھر لوگ اس کے خلاف ہو گئے اور وہ ایک نہایت ذلت کی موت مرا۔

[3] سیزر روم میں سو برس قبل مسیح پیدا ہوا۔ نہایت فیاض اور سخی تھا۔ بہادری میں شہرۂ آفاق تھا۔ بہت سی فتوحات اپنے مخالف پومپی پر حاصل کرنے اور اسکو کئی جگہ شکست دینے کے بعد اس نے روم میں ایک خود مختار حکومت قائم کرنی شروع کی۔ اس کی عظمت اور شان و شکوہ ضرب المثل ہے۔ آخر بروٹس اور دیگر سازش کرنیوالوں نے اسکو سینیٹ کے دربار میں ۴۴ قبل مسیح مار ڈالا ۱۲

اُسکو اتنا مدہوش کر دیتی ہے کہ اس کی عقل زائل ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وُہ اپنے آپ کو مخلوقِ خدا
سے بالاتر تصور کرنے لگتا ہے۔ پھر اس کو اس حد پر خود پرستی کی طرف دھکا دیتی ہے۔ حتیٰ کہ وُہ
تحت الثریٰ میں پہنچتا ہے۔ کبھی کبھی یہ ہوس برق بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ جس کا شکار نیپولین[1] ہوا۔
اور اپنے پروانہ کو ایسی اداؤں سے لبھاتی ہے جو روشن چہرہ والا چاند بھی اپنے شیفتہ چکور
کے واسطے اپنے تصور سے نہیں پیدا کر سکتا۔ مگر یہ سب کچھ لطف و شفقت اس غصہ و
غضب کا پیش خیمہ ہے جس کا ظہور اس کی عادت میں داخل ہے۔ اور یہ کرم کی نگاہیں آثار
میں ان فراق کے تیروں کے جن کا مزہ وہ چکھانے والی ہوتی ہے۔ تاہم زمانہ اس کے
سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے اور اسکو ملکہ جانتا ہے۔ جذبات اس کے غلام ہیں اور اس کے
دربار میں دست بستہ اس کے حکم کے منتظر کھڑے رہتے ہیں۔ اور اس کے اشاروں پر چلتے
ہیں۔ اُس کے گرد بھی بڑے بڑے بادشاہوں کی طرح امرا۔ وزرا اور ارکینِ سلطنت کی ہر وقت
بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اور اس تک اسکی حضوری میں رسائی اور اُس سے ہمکلامی نہایت مشکل ہے۔ جاہ
طلبی۔ حرص۔ محبت۔ انتقام سب کے سب اس کے ادھر اُس کے تلاشی کھڑے رہتے ہیں۔ مگر
افسوس نہ اُن کی رسائی اُس تک ہو سکتی ہے اور نہ وُہ خود اُن تک آ سکتی ہے۔ لیکن وُہ ان کے
پاس اپنے ادنیٰ اور ذلیل ایلچی بھیجتی رہتی ہے۔ جاہ طلبی کے پاس طاقت کو۔ حرص کے پاس
دولت کو۔ محبت کے پاس رقابت کو۔ انتقام کے پاس پشیمانی کو۔ مگر افسوس یہ سب کیا ہیں؟
محض مایوسی کی دوسری صورتیں ہیں! نہ خوشامد سے نہ رشوت سے اُسکو پھسلایا جا سکتا ہے۔
مگر ہاں اُس کے حصول کا بہترین ذریعہ اُس کے دشمنوں کے ساتھ معرکہ آرائی کرنا ہے۔
کیونکہ خود اسکو براہِ راست خوشنود کرنا ممکن الوقوع نہیں۔ وُہ لوگ جو اُس کے دشمنوں پر فتحیاب
ہوتے ہیں۔ انہیں اُس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وُہ خود ان کے پاس

[1] نیپولین فرانس کا مشہور بادشاہ اور یورپ کا فاتح جزیرہ کراسیکا میں ۱۷۶۹ء میں پیدا ہوا۔

ڈھونڈی آتی ہے۔

اگر وہ کسی اور طرح حاصل ہو سکتی تو سب سے پہلے بادشاہوں کا حصہ ہوتی۔ کیونکہ اُن سے زیادہ اُس کے طالب اور لوگ نہیں ہوتے۔ اور وہ اتنی قدرت بھی رکھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ قیمت دیکر اُسے حاصل کر سکیں لیکن وہ بادشاہوں کا بھی اتنا ہی لحاظ کرتی ہے جتنا انکی رعایا کا۔ اور اُن کے محلوں میں صرف اپنے نقیب مثل شان و شوکت جاہ و جلال ساز و سامان وغیرہ کو بھیجکر اپنی آمد کا انہیں منتظر رکھتی ہے۔ مگر جاتی کبھی نہیں۔ آخر کیوں؟ کونسی چیز اُسے روکتی ہو؟

اوہ - اوہ وہ تو قناعت کی شیدا ہے۔ اور ہمیشہ مل کر اس کی ملاقات کو ہمیشہ جایا کرتی ہے۔ کہ تنہائی میں اُس کی صحبت کا لطف اُٹھائے اور جنگل کی جھونپڑی کے اندر اُس کی نباتات کی دعوت میں اُس کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو۔

تو ہاں اے ملکہ - میری پیاری اور سنجیدہ باتیں سُن۔ بادشاہ ایسی باتیں کم سُنا کرتے ہیں لیکن تو سُن۔ میں نہ تجھ سے قطعی نفرت کرتا ہوں اور نہ تیرا دیوانہ ہوں۔ تیرا لطف عارضی ہوتا ہے۔ اور تیری بخشش تیری سلطنت کے اندر ہی اندر محدود ہوتی ہیں۔ تو بھی اور بادشاہوں کی طرح دوسروں کا سہارا تکتی ہے اور انکی طرح اگر تو بھی اپنے سہارے سے محروم کر دی جائے تو تو اپنے آپ کو بھی نہیں سنبھال سکتی۔ اگر قناعت تیرا ایک ہاتھ پکڑ کر اور تندرستی دوسرا ہاتھ پکڑ کر تجھے سہارا نہ دیں۔ تو تو ایک نکمّے اور فضول جسم کی طرح زمین پر گر پڑے"۔

(ترجمہ)

لطیف احمد پانی پتی

کوکبۂ ملوکی و ملوکی (مؤلفہ مولوی سید ضمیر الدین صاحب احمد آنریری مجسٹریٹ پٹنہ) اسمیں ہندوستان کی فرمانروایاں ملوک خلجی کے تاریخی کارنامے مندرج ہیں۔ مولوی صاحب نے اس تاریخ کو دلچسپ بنانے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ زبان اس کتاب کی سلیس و پاکیزہ ہے۔ لکھائی چھپائی بھی نفیس ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عـہ)۔ مولوی ابوالحسن صاحب لودی کٹرہ پٹنہ کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

موسیقی

سوائے حُسن کے جہان بھر میں غالباً کسی شے کو وہ قبولیت عام حاصل نہ ہوگی جو موسیقی کو حاصل ہے - جدھر نظر ڈالئے جہاں دیکھئے قلب انسانی اِس پر فریفتہ و شیفتہ نظر آتا ہو۔ پتھروں کے پگھل جانے پہاڑوں کے ٹل جانے، اور خودبخود آگ لگجانے کے قصّے غلط سہی مگر اس میں کچھ کلام نہیں کہ موسیقی کا جادو نہ صرف انسان پر بلکہ تمام جانداروں پر چلتا ہے -

موسیقی کی بناوٹ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکے اجزا - آواز کی ایک خاص قسم کی چال (جس کو "لَے" کہتے ہیں) حصّہ ہائے آواز کی ایک خاص ترتیب (جسے "تان" کہتے ہیں) اور خود آواز (جس کو "سُر" کہتے ہیں) ہیں - پہلے دو اجزا عقل انسانی کی صنعت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں اور اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ حُسن بزور ہنر صرف اَور چیزوں میں پیدا نہیں کیا جاسکتا - آواز میں بھی اُس کا ظہور ممکن ہے - یہ وُہ حُسن ہی جس کا احساس جاہل سے جاہل شخص اور بیدل سے بیدل انسان کو ہوتا ہے - فرق صرف اتنا ہی کہ صاحب فہم اس احساس سے زیادہ لطف اُٹھاتا ہے اور یہ مقابلۃً کم "سُر" موسیقی میں وُہ چیز ہے جو دراصل موسیقی کی جان ہے اور جس کے بغیر موسیقی موسیقی نہیں - غور سے دیکھئے تو یہ "سُر" "تاثر قلبی کا ہوبہو عکس ہے - کسی موسیقیانہ آواز کو آنکھیں بند کرکے دھیان لگاکر سُنئیے بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اپنے دل کا حال مُوبمو آپ سے کہ رہا ہے - کبھی کسی رنج کو یاد کرکے آہ کھینچتا ہی جس کو سُنکر آپ بھی بیتاب ہوجاتے ہیں - کبھی کسی لُطف کو یاد کرکے قہقہے لگاتا اور خوش ہوتا ہے جس کے اثر سے آپ کا سارا غم والم دم بھر میں کافور ہوجاتا ہے - موسیقی کے ایجاد کرنے والوں کی قدرت اور وسعت خیال پر نظر کرکے حیرت ہوتی ہے کہ تاثر سی لطیف چیز کو

تقسیم کرکے کس کس انداز سے ترتیب دیا ہے اور کس طرح ایک قطرے کو دریا بنا دیا ہے۔

موسیقی کا اثر دو طرح کا ہے۔ ایک تو وہ جو تال اور لَے سے ظہور میں آتا ہے۔ یہ اثر عام و خاص دونو پر پڑتا ہے۔ دوسرا وہ جو مختلف سُروں کی کیفیات کی وجہ سے طاری ہوتا ہے۔ اس کے لئے ذرا صاحبدل ہونا ضروری ہے۔ ناٹک کے گانے مجلس عزا کے سوز عشق و محبت کے گیت سب اپنی تاثیر کے لئے سُروں کے محتاج ہیں اور اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ موسیقی جب ان جذبات کے ساتھ مل جاتا ہی تو جذبات کی تصویر اُترتا تو ایک طرف نقل کی کیفیت اصل سے بڑھ جاتی ہے۔

یُوں تو موسیقی کسی ملک اور کسی قوم میں نہیں۔ مگر جو بات ہندوستانی موسیقی میں ہی غالباً کسی میں نہیں۔ اسکا کمال سُر کے باریک باریک امتیاز اس کی پیچی اور اثر میں ڈوبی ہُوئی کیفیات اس کی تال کی پُر لطف پیچیدگی اس کے لے کا لوچ اور تڑپ یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کا نشان یورپ کے ترقی یافتہ موسیقی میں کہیں نہیں ملتا۔ بلاشبہ یورپ کا موسیقی ابھی ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہے اور اس لائق ہے کہ سالہا سال ہندوستانی موسیقی کے سامنے زانوے ادب تہ کرے۔

ایک غلط سا خیال عام طور سے موسیقی کی قدیم مقررہ طرزوں کی نسبت پھیلا ہوا ہی وہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک طرز کسی خاص وقت کے ساتھ مختص ہی۔ اس خیال کا باعث وہ طرزیں ہیں جو صبح کی چیزیں کہلاتی ہیں۔ ان طرزوں میں مایوسی درد اور تفکر بہت زیادہ ہوتا ہے اور صبح کے وقت انکو گانے سے ان سب کا اثر اور بھی زیادہ ہو جاتا ہی۔ اوقات پسند گروہ اسی پر قیاس کرکے کہ دیتا ہی کہ یہ چیزیں صبح سے مخصوص ہیں حالانکہ ایسا نہیں۔ موسیقی کو اوقات سے کوئی ایسا تعلق نہیں۔ اگر ہے تو اتنا کہ بعض بیحد افسردہ طرزیں ہوائے سکون اور سکوت کے عالم کے کسی دوسرے وقت نہیں کھلتیں اور سکون و سکوت کی موجودگی ہر طرز

کے لئے باعث فروغ ہو جاتے ہیں۔ سکوت صبح کو یا دوپہر کو یا آدھی پچھلی رات کو۔ یہ بات
مانی جا سکتی ہے کہ آدھی رات پچھلی رات اور تڑکے کی چیزیں کسی اور وقت میں وہ لطف نہیں دیتیں جو
مذکورہ اوقات پر دیجاتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ چپ چاپ وقت ان دلچسپ چیزوں کے لئے زیادہ موزوں
ہیں۔ مگر یہ امر ہرگز ماننے کے قابل نہیں کہ رات کی چیزیں کبھی دن کے وقت کو بھی نہیں جچتیں۔
ہندوستانی تھیئٹر کبھی اس بات کی پروا نہیں کرتے۔ اور جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ وہ بالکل حق بجانب ہیں
کہتے ہیں کہ یورپ کے موسیقی میں شادی اور غم کے لئے الگ الگ طرزیں مخصوص ہیں۔ ہندوستانی موسیقی
میں بھی اس قسم کا امتیاز ممکن ہے مگر بہت مشکل۔ ہندوستانی موسیقی وہ مخلوط رنگت ہے جس میں
شادی و غم کے گنگا جمنی تار کچھ اس طرح پیوست ہوتے چلے گئے ہیں کہ ایک تار کو دوسرے تار سے
الگ کر دکھانا اعجاز سے کم نہیں۔ ہاں ممکن ہے تو صرف اسقدر کہ بعض چیزیں زیادہ افسردہ نظر آتی ہیں اور
بعض چیزیں زیادہ شگفتہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس افسردگی و شگفتگی میں تال کو بہت بڑا دخل ہے۔
یہ تال وہ چیز ہے کہ خالص افسردہ سُروں سے اگر اس کو چسپاں کر دیں تو ان کی افسردگی تک
نسیاً منسیا ہو جاتی ہے۔

ہندوستانی موسیقی کے کمال کا باعث وہ عظیم الشان تاثیر ہے جس کا وجود ہندوستان کے مشہور فلسفے میں پایا جاتا ہے۔
اس موسیقی کی بعض بعض طرزیں ایسی ہیں کہ انسان کو مرغ بسمل کی طرح تڑپا دیں یا دریائے تحیر و تفکر میں
اس قدر غرق کر دیں کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جس کی وجہ سے بعض اکابر ملت نے اشغال
موسیقی کو ممنوع ٹھہرایا ہے۔ اور اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ ہر شخص کو اس نشہ کا استعمال راس نہیں آتا۔
اُمرا جنکو سب کچھ حاصل ہے اور صلحا جو درد کے بڑھنے کو درد کا علاج جانتے ہیں۔ ان اشغال میں
انہماک رکھیں تو مضائقہ نہیں۔ عوام الناس کو اور اُن عوام الناس کو جو ہزاروں دبی آرزوئیں
دلوں میں لئے ہوئے ہیں موسیقی کی ہوا سے بچنا چاہئے ورنہ موسیقی دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دیگا
اور اس کا انجام عشق و دیوانگی ہوگی۔

سید نذیر حسین

شاہوں کا گورستان

ہماری ہی بائیس خواجہ کی چوکھٹ کہلاتی ہے۔ مگر دُنیاوی اعتبار سے بھی یا مین شاہوں کا مخزن ہے۔ اس کی خاک میں ہزاروں مرادمند نامرادی کی شان سے بےخبر سوتے ہیں۔ اندرپست کی زمین جس پر قلعہ دین پناہ کی عظیم الشان مگر بوسیدہ دیواریں سایہ ڈالتی ہیں۔ ہندو شہنشاہوں کی خاکستر سے ڈھکی ہوئی ہے۔ ہر ذرہ میں کورو پانڈو اور اُن کے بعد کے سورماؤں کا خون چمکتا نظر آتا ہے۔ یہاں سے چھ سات کوس آگے بڑھ کے دیکھو قطب مینار چپ چاپ اپنے مسلمان بانیوں کی خواب گاہوں کی دربانی کر رہا ہے۔ شمال مغرب کے گوشہ میں فقیر دوست شمس الدین التمش سُرخ رنگ کے منقش مقبرہ میں خاموش لیٹا ہے۔ سرہانے شارع عام ہے۔ رات دن گاڑیاں وغیرہ آتی جاتی ہیں اور ایک غل شور برپا رہتا ہے۔ مگر ہمارے شہنشاہِ ہند کو ذرا ناگوار نہیں گذرتا۔ جنوب کی طرف عبرتناک منظر ہے وہاں نہ جاؤ۔ یہ اُونچی نیچی پکمسٹی۔ چار دیواری سکندرِ ثانی علاء الدین خلجی کا گورخانہ ہے۔ اور اس کے گرد جو اور دو چار مٹے مٹے نشان نظر آتے ہیں اُن میں شاید خضر خاں شادی خاں سلطان کے شہید فرزند اور قطب الدین خلجی کی ہڈیاں ہونگی۔ اُفوہ۔ نہ یہاں قبر کا نشان ہے نہ تعویذ کا پتہ چند گڑھے ہیں اور گُنجان و سرنگوں جھاڑیاں آس پاس جدھر دیکھو چونہ سے چمٹے ہوئے پتھروں کا ڈھیر نظر آتا ہے۔

یہ جو سامنے بہت سی کوٹھریاں ہیں۔ یہاں مدرسہ تھا کیونکہ اس زمانہ میں ہر بادشاہ کی قبر کے پاس ایک مدرسہ ہوتا تھا جہاں دین دنیا کے علوم پڑھا کر مرحوم بادشاہ کو ثواب پہنچایا جاتا تھا۔ قطب مینار کے شرق میں خانقاہوں اور محلات کے شکستہ آثاروں کو پھلانگتے ہوئے ذرا

آگے چلے چلو۔ وُہ دیکھو نیک دل غلام بادشاہ غیاث الدین بلبن کی شق شدہ مسہری نظر آتی ہے۔ اِسی کے برابر لاڈلا شہزادہ محمد خاں شہید آرام کرتا ہے۔ یہ نشان بھی کچھ دم کا مہمان ہے عنقریب ٹوٹ پھوٹ کر مٹنے والا ہے۔ کیسا سناٹا ہے۔ کہ اچھے بھلے آدمی کو خفقان ہو جاتے۔ انہی کھنڈروں میں تلاش کرو تو اَور بھی کئی بادشاہ بے غل وغش سوتے نظر آئینگے۔ دو میل کے فاصلے پر تغلق آباد ہے۔ یہاں غیاث الدین تغلق اور محمد تغلق بیکسی کے عالم میں بیخود پڑے ہیں۔ یہ تنہائی یہ سکوت یہ سنسان جنگل۔ اور بالکل ویران مقام محمد تغلق نے کیونکر پسند کیا۔ اسے جگا دو شاید اس کو اپنی حالت کا علم نہ ہوگا۔

فیروز تغلق کے احسان نامے[۱] سرہانے کے محفوظ صندوق میں دفن ہیں مگر محمد تغلق انکو بھی نہیں دیکھتا۔

ان سب نظاروں کے بعد ذرا نئی دہلی کی طرف دو میل بڑھ جاؤ۔ شاہراہ سے ایک میل غرب میں سُلطان فیروز شاہ کا مقبرہ چند خوبصورت تالابوں کے بیچ میں گردن اٹھائے دیکھ رہا ہے۔ برسات کا موسم ہو اور چوٹ کھایا ہوا دل۔ پھر یہاں کے زمرد کے کٹوروں میں موتی سے پانی کا چمکنا دیکھے۔ اور دیکھتا دیکھتا ہمارے شوقین شکاری بادشاہ کی قبر پر چلا جائے۔ گنبد میں ابابیلوں کے بولنے کی صدا۔ اور فرش پر مزار کے بالکل متصل حقہ نوشی کے سامان۔ اُپلے کی راکھ کا انبار۔ اور ایک دو ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں بھی۔ دیکھے اور جی ہی جی میں مزے لے۔

اس مقبرے کے سامنے نہائیت عظیم الشان حوض ہے اور اس کے کنارے پر

[۱] محمد تغلق نے جن لوگوں پر ظلم کئے تھے اُن کے وارثوں کو فیروز تغلق نے کچھ دیکر رضامند کر لیا تھا۔ اور معافی نامے لکھوا کر محمد تغلق کے سرہانے ایک صندوق میں دفن کرا دیے تھے جو غالباً اب تک ہیں۔ دیکھو فتوحاتِ فیروز شاہی +

فیروز کے مدرسہ کا دارالطلبہ (بورڈنگ ہوس) اس دارالطلبہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ صدیاں پہلے مسلمانوں نے کس عمدگی سے طلبہ کی رہائش کا انتظام کیا تھا۔

غرضکہ اسی طرح سید اور لودھی بادشاہوں کے مقبرے افسوسناک کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہیں۔

لارڈ کرزن نے اگر سلوک کیا تو مغلوں کی عمارتوں کے ساتھ کیا۔ مگر اچھا ہوا کہ مذکورہ گورستان کو ہاتھ نہ لگایا ورنہ جاہ طلب بادشاہوں کے لئے دہلی میں عبرت کا کوئی ذریعہ نہ رہتا ÷

حسن نظامی

کسی عنواں صبر آتا نہیں مجھ ناشکیبا کو — الٰہی کیا کروں اس خاطرِ محوِ تمنا کو

کرے ناحق نہ یوں بدنام میرے شوقِ رسوا کو — ذرا سمجھاؤ اپنے حسنِ رسوائی تقاضا کو

نہ تھی واقف جو میرے اشتیاقِ بے نہایت سے — نگاہیں ڈھونڈتی ہیں اب اس نگاہِ بے محابا کو

فراقِ یار کی بیتابیاں بھی لطف رکھتی ہیں — گوارا کر دیا الفت نے ان کی ناگوارا کو

وہ خوابِ ناز میں تھے اور نہ تھے اے شوقِ پابوسی — نہ سمجھی پستیِ ہمت نری اس لطفِ ایما کو

تمہیں بھی یاد ہوگا وہ زمانہ عیشِ ماضی کا — تمنا چاہتی ہے پھر اسی لطفِ تماشا کو

بھر آئے اشکِ دُرد افتادگانِ بزمِ ساقی سے — مئے رنگیں سے خالی دیکھ کر آغوشِ مینا کو

نگاہِ شوق میں چمکا دیا ہے آو بھی ۔ ظالم — ترے ظلمِ نمایاں نے ترے حسنِ خود آرا کو

عیاں سب حال ہو جاتا ہماری بیقراری کا — وہ خود بھی دیکھ سکتے کاش اپنے ناشکیبا کو

کہے ناصح نہ پھر رنگینیِ جنت کے افسانے — کبھی گر دیکھ لے اس نازنیں کے روئے زیبا کو

چھپانے سے کہیں آثار چھپتے ہیں محبت کے — نہ دو الزام میرے اضطرابِ آشکارا کو

گذاری عمر شغلِ عاشقی میں مرحبا حسرت — نہ پاس آنے دیا غمہائے بے پایانِ دنیا کو

محبت

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے

قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
ابھی واقف نہ تھا گردش کے آئینِ مسلّم سے

ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے ابھری ہی تھی دنیا
مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے

کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشمِ خاتم سے

سنا ہے عالمِ بالا پہ کوئی کیمیاگر تھا
صفا تھی جس کی خاکِ پا میں بڑھ کر ساغرِ جم سے

لکھا تھا عرش کے پایہ پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشمِ روحِ آدم سے

نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیاگر کی
وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسمِ اعظم سے

بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنائے دلی آخر بر آئی سعیِ پیہم سے

پھرایا فکرِ اجزا نے اسے میدانِ امکاں میں
چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے

چمک تارے سے مانگی چاند سے داغِ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے

تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفسہائے مسیحِ ابنِ مریم سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی
ملک سے عاجزی افتادگی تقدیرِ شبنم سے

پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے

مہوس نے یہ پانی ہستیِ نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے

ہوئی جنبش عیاں، ذروں نے لطفِ خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے

خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

لوازم شاعری

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

جہاں ہیں جیسے کہ ان کے انگریزی نظم سب شیریں ۔۔۔ کہ جن کے سنتے ہی سامع کو جوشش ہو پیدا

نکات ٹھیک ہیں اتنا کہ اہل ذوق بھی خوش ہوں ۔۔۔ بلیغ اصل مضامین سلیس طرز ادا

بعینہٖ کیا ان کی ضرور کیسا تقلید؟ ۔۔۔ کہ مقتضا بھی تو ہر ایک ملک کا ہے جدا

ہر ایک چیز کو اس کی جگہ پہ غور کرو ۔۔۔ کہ مقتضائے طبیعی ہے اس جگہ کا کیا؟

یہاں کا ذوق سلیم اس کو جب کرے تسلیم ۔۔۔ تو ویسی بات کی تقلید ہو سکے گی روا

وہ شے تو خوب ہو لیکن بحالت تقلید ۔۔۔ وہ رنگ و آب سلامت نہ رہ سکے اصلا

مزید یہ کہ نہ ہو مقتضائے طبعی ملک ۔۔۔ پھر اہل ذوق بھی اس کا اٹھا سکیں نہ مزا

اتارنے کو اتارے کسی اصل کی یوں نقل ۔۔۔ کہ اصل شے کا بھی بالکل بدل گیا نقشا

تو ایسی نقل کا حاصل نہیں بجز اس کے ۔۔۔ کہ اصل شے سے بھی ہو اہل ذوق کو ابرا

رہی یہ بات کہ اردو کی نظم کیسی ہو ۔۔۔ کہ خاص و عام کے دل پر اثر کرے پیدا

تو اس پہ رائے وہی ہے جو صاف ظاہر ہے ۔۔۔ سیاق نظم کو دیکھو میں کہہ رہا ہوں کیا

مذاق ملک کو سمجھے ضرورتیں دیکھے ۔۔۔ کرے وہ امر جو ہو مقتضا زمانے کا

نہ ہو زبان میں آوردی و تصنع ہو ۔۔۔ مفید خلق ہو مضمون و حاصل معنیٰ

بیاں کرے جو کوئی بات نظم میں اپنی ۔۔۔ تو اصل حال کی تصویر کھینچ دے گویا

طریق نظم سخن کا وہ اختیار کرے ۔۔۔ کہ مان لیں اسے طرز قدیم کے شعرا

غزل میں صرف کرے حسن و عشق کے مضموں ۔۔۔ نصیحتیں بھی رہیں گو نہ اس کے ہوں شیدا

یہ حسن و عشق مجازی نہ ہو حقیقی ہو — [illegible] عبادت روحی سمجھتے ہیں خوف [illegible]

اگر مجاز کا پہلو کوئی ہو تو ایسا ہو — کہ اہل حال سنے دل پہ ضرب [illegible]

جو ہوں ادب کے مخالف وہ لفظ ترک کرے — پھر [illegible] فان [illegible]

مجاز کے لئے جو بات ہو فقط شایاں — [illegible] سے حقیقت کو وہ نہیں [illegible]

غزل میں صرف کرے حکمت [illegible] کو — [illegible] کا نظم [illegible]

سلیس لفظوں میں لے آئے فلسفی عمیق — [illegible] مسائل [illegible]

کہاں مسائل حقانیت کہاں یہ روش — کہ جس کو پڑھ کے ہو پیدا خود اپنے دل میں [illegible]

یہ مانتا ہوں کہ اگلوں نے ذوق [illegible] ہو مگر — نتیجہ اُن کا [illegible] کرے صورت گیا

بیان اصل حقیقت کرے مگر کیونکر — کہ ہو مجاز کا ہلکا سا [illegible] میں پردہ

علاوہ اس کے قصیدوں میں کیا ضرورت ہے — کہ ہر امیر کو [illegible]

بخیل اصل میں وہ ہو مگر بحکم طمع — بنائیں نظم میں ہم اُس کو [illegible]

نہ اُس کے دل پہ اثر ہو نہ اپنے دل میں اثر — نتیجہ یہ کہ ہنسیں دیکھ دیکھ کر [illegible]

ازاں قبیل سمجھ لو بہت سی باتیں ہیں — کہ جنکو پڑھتے ہی بیزار ہوگا ہر دانا

اثر زیادہ ہو سامع پہ نثر کی نسبت — اسی لئے ہے فقط شعر و شاعری کی بنا

خلاف فطرت و انسانیت ہو جو مضمون — تو اُس میں قوت جذب قلوب [illegible]

کچھ اُن سے بحث نہیں جو نہیں ہیں داخل بحث — کلام ہوتے ہیں [illegible]

غرض مری ہے اُن ایسوں سے ہیں جو فہمیدہ — سمجھ کے چلتے ہیں وادیٔ نظم کا رستا

بہت سے ان میں ہیں طرز قدیم کے عاشق — بہت سے اُن میں ہیں طرز جدید کے شیدا

بہت سے وہ ہیں کہ جنکی غرض یہی ہے صرف — محاوروں میں فقط شوخیاں کریں پیدا

تو دست بستہ مری عرض ہے قصور معاف — کہ اب زمانے نے بدلا ہے اور پیرایا

میں برخلاف نہیں شاعری کے بلکہ اسے — کئی فنوں سے سمجھتا ہوں اشرف و اعلا
بشرطِ آنکہ نتیجے ہوں شعر کے معقول — نہ یہ کہ سلسلہ اس میں فقط ہو لفظوں کا
ہو استعاروں کی فرضی بناؤں کی بھرمار — اُن استعاروں میں ایہام کا رہے پردا
کہ جس کو سُن کے تعجب تو ہو اثر بہ خلاف — کہے یہ عقل کہ ان کاوشوں کا حاصل کیا؟
فراق و وصل و گل و بلبل و بہار و خزاں — جنون و عشق و جفا و وفا و ناز و ادا
کمالِ حُسن و دل آویزیِ کرشمۂ حُسن — جنونِ عاشق و جوشِ زمانۂ سودا
ریا بھرے ہوئے پند و نصائحِ واعظ — شراب و ساقی و مہر و مہ و ساغر و صہبا
قصور و حور و جنان و آسمان و زمیں — بہشت و دوزخ و رندی و توبہ و تقوا
یہ سب اگر ہوں مناسب جگہ پہ مستعمل — اساتذہ نے کیا اِن کو جس طرح املا
اساتذہ بھی وہ عارف جو اپنے وقت کے تھے — غرض کچھ اَور نہ تھی جنکی معرفت کے سوا
تو شاعری نہیں اک قسم کی عبادت ہے — اسی کا نام ہے مرقاتِ مصعدِ اعلا
جو اس طرح کے مضامیں ہیں صاف کھلتے ہیں — ہزار ڈھانکیے اُنپر مجاز کا پردا
مگر جو اس کے مخالف ہے نیتِ شاعر — تو اُس کے شعر سے ہوتا ہے خود بخود پیدا
کہ معرفت نہیں یہ ہے فقط ہوسناکی — کجا مسائلِ حقانیت یہ طرز کجا
وُہ شعر کیا؟ کہ بزرگوں کے سامنے جو پڑیں — تو اس کی شوخیِ مضموں سے خود ہو دل میں حیا
کہیں بہارِ جوانی کا شعر میں ہو نظم — کہیں دوپٹے کا آنچل کسی جگہ اُلجھا
مرے زمانے میں اخلاق سوز کیوں ہے یہ فن؟ — نفاق و کبر میں بدنام کیوں ہوئے شعرا؟
ہر اک زباں پہ ہے بانگِ انا و لاغیری — کسی کا کوئی مُعترف نہیں ہے اپنے سوا
غضب یہ ہے کہ ریاضت کے بعد بھی اکثر — ہے سب میں عیب کم و بیش خود پسندی کا
ہیں شاعروں کو گویوں کی طرح طعن سے کام — اگر کرینگے ثنا بھی تو اس میں ہوگی ریا

سبب یہ ہے کہ ہوا جہل آکے عالمگیر — کیا ان کو تعصب نے مبتلائے بلا
صفائی قلب سے کوسوں الگ ہوا یہ فن — ہر ایک ہو گیا ہے بروئے نفاق کا پتلا
بس انتہا ہے یہ اس کی کہ غیر تو ہیں غیر — جو دیکھئے تو مخالف ہے باپ سے بیٹا
خدا کرے کہ مری قوم سے ہو دفع یہ بات — کسی طرح نہ رہے شاعروں میں کبر و ریا
یہ اپنی رائے ہے ظاہر کیا ہے جو یہ — کسی پہ جرح سے مطلب نہیں ہمیں بخدا
یہی خیال ہے چالیس سال سے دل پر — اگرچہ ان میں ہے شعور شعر کجا

علی محمد شاد

ترجمہ اینک آرڈن

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

جب صبح بلا نے منہہ دکھایا
بشاش رہا وہ صورت گل
فرقت کا ملال جو تھا جی میں
تھی اسکو نہ اور کوئی بھی فکر

رخصت کا وقت سر پہ آیا
مردوں کی طرح کیا تحمل
وہ ٹال دیا ہنسی ہنسی میں
اپنی کو ملال ہو یہی فکر

لیکن اسپر بھی پیش غفار
شرط طاعت بجا وہ لایا
اس حد میں جب آگیا کہ ہوا[1]
کی حق سے دعا کہ خدایا
لیکن پہنچے یہ اور بی بی

مانند بہادران دیندار
سر کو رہ عجز میں جھکایا
انسان ہیں خدا خدا میں انسان
جو جا ہے وہ ہو حشر میرا
دیتا ہوں امان میں تیری

[1] اس حد میں جب آگیا غم ۔ مراد اس مقام راز سے ہے جہاں خدا اور بندے میں راز و نیاز ہونے لگتا ہے اسی کی طرف مصرع ثانی میں اشارہ ہے ۔ یہ مضمون بائبل سے شاعر نے اقتباس کیا ہے ۔ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حسب حیثیت الوہیت و بشریت خدا اور انسان میں مشترک ہیں ۱۲

ہر چیز کو ٹھیک ٹھاک رکھو | گھر مثلِ جہاز پاک رکھو"
ہونا مجھے بحر سے نہ خطر | ہر دم ہے نظر خدا پر"
"لطف و کرم خدا ہی اکرم | ہے لنگرِ کشتی دو عالم"
کیا اسکا گذر نہیں وہاں پر | ہے جلوہ گہِ سحر جہاں پر[۱]
"جاؤں بالفرض میں وہاں تک | اُس سے جو وہاں لگی ہے تک
"دریا ہے اسی کا بحر اسی کا | ان سب کو اسی نے ہے بنایا

ماں سے نہ جو ہم جگانا چاہا | بیٹک نے اسے گر پڑا رکھا
سوتے ہی میں کہہ کے کیا آیا | سونے دو نہ کرو نہ بیدار آیا"
بچہ ہے اگر ہوا بھی شب آیا | اس حال میں ہوگا کیا خبردار
تب اپنی زبان سے بچی کی نانی | دی باپ کو بیٹے کی نشانی
لیں وہ یادگار اپنیم | پاس اسکے جو تھے بچے یتیم
اٹھا وہ بافعل مرد رستہ | رخصت ہوا الوداع کہکر

. . . .

یہ کہہ کے وہ نیک مرد اٹھا | پہلوئے نشانِ زن سے اٹھا
الفت سے گلے میں ہاتھ ڈالا | گرتی ہوئی ابنی کو سنبھالا
وحشت زدہ بچوں کو کیا پیار | لیکن سوتا تھا طفل ہمیار

ضامن کنتوری

دولت

مرا جاتا ہے پتلا خاک کا فکرِ معیشت میں | اڑی ہے سانس سینہ میں ہری ہر جان دولت میں
جسے دیکھو اُسے سودا ہے دنیا میں امارت کا | لگا دیتا ہے اپنا نقدِ جان بھی اسکی قیمت میں
مگر ہے جنسِ دولت کون سے بازار میں ارزاں | گراں ہر مشتری اکثر پڑا رہتا ہے غفلت میں
کوئی کہتا ہے دولت صنعت و حرفت میں ملتی ہے | کوئی کہتا ہے یہ سودا ہے بازارِ تجارت میں

[۱] جلوہ گہِ سحر سے مراد اقصائے مشرق (چین) جہاں اینک جاتا ہے۔ اس مضمون میں بائبل کے اِس فقرہ کی طرف اشارہ ہے۔ "اگر میں صبح کے پر لگاؤں اور سمندر کے انتہائی سرے پر جا کے رہوں جب بھی تیرا ہاتھ میری رہنمائی کریگا"

کوئی کہتا ہے دولت دستِ قدرت سے نکلتی ہے اُسی کے ہات چڑھتی ہے یہ اُتری جسکی قسمت میں
یہ باتیں جھوٹے سکّوں کی طرح خود چل نہیں سکتیں مجازاً راست ہوں لیکن یہ جھوٹی ہیں حقیقت میں
جہاں لہو ولعب ہے واں کبھی دولت نہیں ہوتی جو رہتے ہیں ہمہ تن کھیلوں کے [illegible] میں بازراعت میں
جو ہے مہماں سرائے عام وہ بھی گھر نہیں اسکا عبث کہتا ہے جو کا [illegible] اسکی سکونت میں
جہاں بزمِ حسیناں ہے جہاں رنگے وخشاں ہے وہاں دولت نہ معنی پر ہویدا ہے نہ صورت میں
کرن جوتی میں ۔ ٹوپی میں جہاں سلمہ ستارہ ہے وہاں کبھی مہرِ دولت آ نہیں سکتا بطلعت میں
اُگلتی ہے زمیں دولت ۔ زمیں بنکر برستی ہے یہ پھل لگتا ہے اے طالب فقط نخلِ ریاضت میں

حکایت برسبیلِ تمثیل

روایت ہے قدیمی اس طرح ظاہر کتابت میں کہ تاجر کا کوئی بیٹا تھا [illegible] کی ولایت میں
وہ تاجر خاندانی تھا بہ رنگِ خانداں بھی تھا گھرانے کا بڑا مفخور گر تھا چھوٹی نیت میں
بزرگوں سے چلی آتی تھی ترکے میں جو مہیا شی لٹا دی جائداد اپنی جو پائی تھی وراثت میں
دعا تھی یا الٰہی دے تو چھپّر پھاڑ کر مجھ کو کڑی چاندی کی سل ہو لعل لگ جائیں مری چھت میں
کوئی سونے کی چڑیا ہاتھ آجائے تو چاندی ہے کہیں سونا میسر ہو ۔ کنارے سیم طلعت میں
دعائے غیر اجابت نے نہ کچھ تاثیر پیدا کی نہ ابھرا ڈوب کر وہ شخص دریائے فلاکت میں
کنارا کر گیا ساغر جو شیشہ ہو گیا خالی نہ ٹھہرا ہم پیالہ ہم نوالہ کوئی صحبت میں
وفورِ غم میں تسکین دینے کو آنسو نکل آئے یہی تھے دوست جو کچھ کام آئے اس مصیبت میں
یہی کہتا تھا ہر دم با دلِ مضطر کہ لے داد نہ پھولیگا کوئی گل کیا کبھی اس نخلِ حسرت میں
لحد میں ہو گیا جو دفن ساتھ اپنے دفینے کے الٰہی کیا یہ دولت تھی اُسی قارون کی قسمت میں
جوانی میں ملے دولت تو لطفِ زندگانی ہو جواب دیتا نہیں یارب تو کیا دیگا قیامت میں
تحکم کیا اُٹھائے جاہ کا جو شخص خوگر ہو غضب ہے اس پہ عسرت ہو [illegible] جو کہ عشرت میں

خیالِ خام نے اُس کو کیا آشفتہ سر ایسا
کہ مجنوں ہو رہا تھا اُلفتِ لیلیٰ دولت میں

رہی الجھن میں آخر آنکھ اُسکی لگ گئی دم بھر
تو کیا دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے خوابِ غفلت میں

کہ اے تاجر عبث گردابِ کلفت میں غوطہ کھا
سرِ بالیں ہے آیا وہ تو پڑا ہے بحرِ حیرت میں

اسی تیرے مکاں کی زیرِ دیوار۔ اک دفینہ ہے
کہ جس سے گنجِ قاروں بھی نہیں ہے اسکی کثرت میں

اُٹھ اور کھدوا زمیں۔ قبضہ کر اپنا اُس خزانے پہ
نہ آئے گردشِ قسمت تری ایوانِ راحت میں

ہوا جب وہ حریص اس خواب سے بیدار تو فوراً
دکھا دی پختگی اُس خام نے اپنے ارادت میں

غرض کھدوائی ہر دیوار کی بنیاد تک اُس نے
مقدر نے دکھایا قصرِ پستی حرصِ رفعت میں

اُٹھایا فائدہ آخر ہوس کا یہ کہ کھد کھد کر
وہ گھر بھی گر پڑا سب جو بنا تھا ایک مدت میں

ہوائے زر میں ایسا ہو گیا تھا آپ سے باہر
کہ گھر بھی کھو دیا آفت بپا کی اور آفت میں

لگا وہ بوالہوس سر پیٹ کر آہ و بکا کرنے
صدائے غیب آئی ناگہاں اسکی سماعت میں

کہ اے غافل نکال چھوڑ دے محنت مشقت کر
پس اندازی کو تھوڑی راہ دے اپنی طبیعت میں

اگر دولت کی حسرت ہے تو اسکی قدر لازم ہے
کلامِ "لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْمُسْرِفْ" ہے آیت میں

یادِ حبیب

یہ چند اشعار اُس کی یاد میں ہیں جس کی طبیعت ڈھونڈھتی ہر امر نہیں پاتی۔ جس کا شیوہ محبت تھا اور جس کے لئے دوستی ایک ایسا ہی قدرتی اور طبعی جوشش تھا۔ جیسا بلبل کے لیے سرود۔ وہ جس کا سینہ کینے سے ناآشنا تھا اور جس کی پیشانی چین سے بیگانہ تھی۔ وہ ایک غنچہ تھا جو

مسکراتے مسکراتے مرجھا گیا۔ **کوثری** ! تو چلا گیا لیکن نہیں گیا۔ کیونکہ تیری سریلی آواز میرے کانوں میں ہے۔ تیری پیاری صورت میری آنکھوں میں ہے اور تو خود میرے دل میں۔ (قیصری)

یادِ حبیب ہے مجھے میں مستِ خواب ہوں ۔۔۔ کیا بے نیاز محفل و جام و شراب ہوں

رکھتا ہوں سینہ حرفِ الم سے بھرا ہوا ۔۔۔ ہر چند میں خموش مثالِ کتاب ہوں

کہتی ہے اُسکی نیند سے یہ میری بیخودی ۔۔۔ تو ہے مرا جواب میں تیرا جواب ہوں

کرتا کمی نہ بہرِ خدا اے فراقِ یار ۔۔۔ جب تک جل کے آتشِ غم سے کباب ہوں

لذت ملی وہ گریۂ شب میں کہ بے [illegible] ۔۔۔ سرتا بپا میں آنکھ مثالِ حباب ہوں

اللہ رے فیضِ عشق کہ خاکِ حبیب کا ۔۔۔ ہر ذرہ کہہ رہا ہے کہ میں آفتاب ہوں

چھوڑا ہے جب سے اُس نے وہ سوتا نہیں [illegible] ۔۔۔ میں اُس کی آنکھ ہو گیا یعنی خراب ہوں

یہ کہہ کے آج اُٹھ گئی دنیا سے دوستی ۔۔۔ جب کوثری نہیں ہے تو میں کیوں خراب ہوں

اُف رے جنوں! کہ ہستی کا خیال ہے ۔۔۔ مثلِ فریبِ خود وہ بحرِ سراب ہوں

ہاں لب کشا کہ بادشاہِ توقیصری
شد از غمت چراغِ مزارِ توقیصری

راز اثیب [illegible]

مگس

کیوں کفِ افسوس ملتی ہے دمبدم ہے اے مگس ۔۔۔ نعمتِ الوانِ دنیا پر نہیں کیا دسترس

غم نہ کھا محرومیِ عیشِ جہاں کا زینہار ۔۔۔ ہے بظاہر تو یہ امرت اور بباطن زہرِ مار

لذتِ دنیا کا چسکا اسقدر اچھا نہیں ۔۔۔ کچھ خبر تجھ کو مآلِ کار کی اصلاً نہیں

بارہا چکھا مگر دیکھی نہیں ایذا کبھی
اس لئے تو ذائقہ پر دیتی ہے شکر کے جی

اور رکھ لذت پسندی کی یہ لت اچھی نہیں
اور بھی چیزیں ہیں میٹھی ایک شکر ہی نہیں

لذتِ دُنیا میں دیکھو اچھا نہیں یہ انہماک
اے مگس ہونا پڑے گا ایک دن تجھ کو ہلاک

نیش کچھ ایسے بھی ہیں جو بشکلِ نوش ہیں
اے مگس ہموار راہوں میں چہِ خس پوش ہیں

کھینچ لیجائے گا ذوقِ تند اک دن سوئے عسل
کیا ہوا اگر بچ گئی تو آج پھنس جائیگی کل

شہد خالص آبِ حیواں بھی اگر ہو فی المثل
ڈوبنے والے کے حق میں ہے وہ خوابِ اجل

لُطف کے کُشتے کو کچھ حاجت نہیں ہے زہر کی
گُڑ سے جو مر جائے اسکو کیا ضرورت زہر کی

ہو گئی آ ہے بوالہوس آخر اسیرِ دامِ حرص
اب کفِ افسوس مل دیکھ لے مگس انجامِ حرص

جانِ شیریں کے عوض پایا ہی تو نے شہد آہ
خوب اب جی بھر کے پی لے نہیں ہرگز گناہ

لے ٹھکانے لگ گئی ہاں آگیا کیا جی کو کل
اے مگس اب تا دمِ آخر ہے تو اور ہے عسل

رشتۂ طولِ امل خود بن گیا زنجیرِ پا
لذتِ عیشِ جہاں کی بس یہی ہے انتہا

اب کفِ افسوس ملنا اور رگڑنا ایڑیاں
بعدِ قطعِ رشتۂ جاں یہ کٹینگی بیڑیاں

دیدنی ہے ہمتِ پروانۂ آذر پرست
کر گئی ہے عرصۂ ہستی کو جسکی ایک جست

واہ اس ننھی سی جاں میں کتنی ہے تاب و تواں
طُورِ شعلہ پر چڑھا پروانۂ آتش بجاں

جل کے سوزِ عشق سے دم بھر میں ٹھنڈا ہو گیا
اس کی خاکستر ہے یا گلزار ابراہیم کا

شاطر

دُوریِ منزل

دُوریِ منزل سے گھبرایا ہوا جاتا ہوں میں
چھوڑ کر دل ہر قدم پر بیٹھتا جاتا ہوں میں

کس بلا کی ہو رہی ہے دامنِ دل پر کشش جانبِ کوہِ ندا گویا کھنچا جاتا ہوں میں
ہے مہارِ ناقہ دستِ سارباںِ شوق میں جس طرف لیجائے ہے مجھ کو چلا جاتا ہوں میں
منزلِ مقصود کی راہوں سے ہوں نا آشنا جس طرف سے آتی ہے بانگِ درا جاتا ہوں میں
کارواں سالار کے دامن پہ ہے میری نظر گرچہ پس پس کر غبارِ رہ ہوا جاتا ہوں میں
سرزمینِ آرزو مُردہ ہے وُہ ابرِ کرم تا درِ آرام گاہِ مصطفےٰ جاتا ہوں میں
چھوڑ کر ظلمات کو شرمندۂ تر دامنی جانبِ سرچشمۂ آبِ بقا جاتا ہوں میں
کشتیِ عُمرِ رواں ہے اور مَیں بے ناخدا موجِ دریا کے اشارے پر بہا جاتا ہوں میں
ہے سکوں راہِ ترقی میں تنزل کی دلیل وادیِ کوشش میں اُٹھتا بیٹھتا جاتا ہوں میں
جاٹ تو اچھی تھی پر چھپ چھپ کے پینا تھا حرام اس لئے اب میکدے کو برملا جاتا ہوں میں
صُوفیِ صافی ہوں دُرد و صاف سے مجھ کو غرض دستِ ساقی سے ملے جو کچھ۔ اُڑا جاتا ہوں میں
مُرغِ دانا کی طرح پیرِ خرد کے دام سے کیا نکل جانے کی راہیں صاف پا جاتا ہوں میں
عُمرِ دو روزہ پہ آتنا ہاؤ ہو و گیر و دار خاکِ صحرا میں بگولا سا اُڑا جاتا ہوں میں
اے سوارانِ رہ کوئے طریقت المدد تھک کے آخر دشتِ غربت میں رہا جاتا ہوں میں

قُلزمِ ہستی میں ہو صادق بپا طُوفانِ نُوح
ناخُدا کو چھوڑ کر سوئے خدا جاتا ہوں میں

محبّت کے دریا کی لہریں

نسیم! تیرا تو ہوتا ہے ہر جگہ پھیرا زمانے بھر میں نہیں ہے کہاں گذر تیرا

مرے خیال کی گلیوں میں آپ جائے اگر — تو میرے دوست سے کہنا کہ او ستودہ سیر
کوئی فراق کے صدموں سے زار و مضطر ہے — کسی کا حال جدائی میں تیری! بتر ہے
ملے تو چین ملے کس طرح جدائی میں — کہیں قرار کی صورت نہیں خدائی میں
ہنسی خوشی وہ محبت بھری ملاقاتیں — وہ لطف خیز مشاغل وہ پیار کی باتیں
وہ تیرا دستِ حمائل جو یاد آتا ہے — مرے کلیجے پہ اک سانپ لوٹ جاتا ہے
نہیں نہیں نہ کہوں گا کہ وہ دمِ رخصت — ہوئی ہے دونوں طرف ہائے کیا بری حالت
اُدھر سکوت کہ اب دیکھئے بنتی کیا ؟ — اِدھر یہ فکر کہ بس کام ہو گیا اپنا
اُدھر اٹھائے سے اٹھتے نہیں تھے سر آنکھیں — اِدھر جواب میں تھیں آنسوؤں سے تر آنکھیں
ق
وہ تیرا کہنا یہ جاتے ہوئے ملا کے ہاتھ — سوار ہونے کی جلدی میں اضطراب کے ساتھ
چلے ہم آپ سے رخصت ہوئے۔ خدا حافظ — ملینگے پھر بھی جو جیتے رہے۔ خدا حافظ
اُدھر جہاز چلا۔ اس طرف سے ملے رومال — تڑپ کے پہلو میں دل نے کہا بنال بنال
دھواں سا اُٹھنے لگا دِل سے آہ آہ کے ساتھ — یہ چاہتا تھا چلوں اُڑکے خود نگاہ کے ساتھ
عجیب درد تھا کچھ میری آہ و زاری میں — قرار تھا کسی پہلو نہ بیقراری میں
اُٹھا دیا مری شورش نے آنکھ ملتوں کو — پکڑ لیا مرے نالوں نے راہ چلتوں کو

جہاں کھڑا تھا وہیں رہ گیا کہاں جاتا
گزار پار نہ تھا میرے غم کے دریا کا

مائل (دہلوی)

مُفلسی

مفلسی کی زندگانی کچھ نہیں! — اس کی طفلی اور جوانی کچھ نہیں!
وُہ بھی جینا ہے کہ جس میں مر مٹیں — ٹھوکریں کھائیں پھریں در در پٹیں!
بے زری کیا اک وبالِ جان ہے — دشمنِ دیں دشمنِ ایمان ہے
سینکڑوں عیب اک تہیدستی میں ہیں — ذلتیں لاکھ اس کی اک پستی میں ہیں
مفلسی میں عزت و وقعت کہاں! — فاقہ مستی میں جلا راحت کہاں؟
یہ مٹاتی ہے شرافت کا نشاں! — ہے وجاہت کی اُڑاتی دھجیاں!
"پیٹ سے فاقہ طبیعت خوش" غلط — مُنہ سے کہنے کی ہیں یہ باتیں فقط
تنگ رہتا ہو جو محتاج سے — پُوچھو حالِ زیست اُس محتاج سے
فکرِ دُنیا اور خیالِ دیں کسے؟ — خوفِ دوزخ شوقِ علیّیں کسے؟
طاعت و زُہد و عبادت. اتقا ۱ غیرت و شرم و حمیت اور حیا
اتفاق۔ ایثار۔ ہمت۔ ہوش۔ عقل ۲ اعتقاد۔ ایمان۔ استقلال۔ عدل
دل لگی۔ شوخی۔ شرارت۔ ولولے ۳ فارغ البالی کے ہیں سب چوچلے
جو مصیبت میں ہو اپنی مُبتلا — دوسروں کی وہ کرے گا فکر کیا
ہو نہ جس عاجز کو کھانا تک نصیب ۱ رنج سہتے جو گیا ہو تھک غریب
فکر جس کو پیٹ کی ہر دم رہے ۲ بھوک کے صدمے جو بیش و کم سہے
اُس کو کیا؟ دُنیا ترقی گر کرے ۳ اُس کو کیا؟ گر قوم فاقوں سے مرے

صورتِ مفلس سراپا انتشار ذاتِ مفلس محض ہیچ و بے وقار!
قلبِ مفلس۔ مخزنِ صد آرزو چشمِ مفلس صرفِ بے حد جستجو
ہستیٔ مفلس عبث۔ بے سود حشو قولِ مفلس۔ بے اثر۔ بے وزن۔ لغو
کوئی کل۔ اسکی غرض سیدھی نہیں بات مفلس کی کوئی اچھی نہیں

مفلسی! تونے ڈبویا قوم کو! تنگدستی: تونے کھویا قوم کو!!

علمدار حسین

تازہ غزلیں

"یاد آتا ہے"

کبھی وہ جان کا دشمن وہ قاتل یاد آتا ہے کبھی پہلو سے خالی دیکھ کر دل یاد آتا ہے
چلے جاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے ہم دشتِ غربت میں وطن اپنا ہمیں منزل بمنزل یاد آتا ہے
پھنسے اک اُن سے اُلفت کرکے ہم دوہری مصیبت میں ادھر وہ یاد آتے ہیں۔ اُدھر دل یاد آتا ہے
رہا پہلو میں جب تک۔ ہم اُسے سمجھا کئے دشمن گنوا بیٹھے ہیں تو کمبخت اب دل یاد آتا ہے!
گذرتا ہے نظر سے جب کوئی پھولا پھلا گلشن تو پہروں ہم کو اپنا رنگِ محفل یاد آتا ہے
مزے کی نیند گو آتی ہے آغازِ جوانی میں مگر انجام میں یہ وقتِ غافل یاد آتا ہے
کبھی جب دل کو ظالم دمبدم تو یاد آتا تھا اب اپنا ہم کو وہ آیا ہوا دل یاد آتا ہے!
ہماری بیگناہی پوچھتی رہتی ہے قاتل سے کبھی تم کو کوئی ناکام بسمل یاد آتا ہے؟

بُرا ہوتا ہے صدمہ ہمنشیں کے ہجر کا اے آہ
کلیجہ کوئی مل دیتا ہے جب دل یاد آتا ہے

ابو النصر آہ (از بغداد)

آتشِ عشق کا بُجھ کر بھی دُھواں باقی ہے — خاک ہو کر بھی وہی سوزِ نہاں باقی ہے
نہ چمن ہے نہ گلستاں کا نشاں باقی ہے — پھر یہ کیا دیدۂ بلبل میں سماں باقی ہے؟
لُٹ گیا قافلہ شوق و متاعِ اُمید — رُوح میں کش مکشِ سود و زیاں باقی ہے
سرِ محمود کے کاسہ میں بھری خاکِ لحد — حرصِ سلطانی و چشمِ نگراں باقی ہے
ہے دمِ خوابِ سحر وقتِ غنیمت اے دل — کہ ابھی فرصتِ گلگشتِ جہاں باقی ہے
بڑھ گئی ہونے سے کم قیمتِ مالِ مُسرف — بس غنیمت ہے کوئی دم جو یہاں باقی ہے
خوفِ رسوائی نہیں کوچۂ نظربازی میں — جب تلک دیدۂ صاحب نظراں باقی ہے
جب سے دیکھا تجھے اے بحرِ کرم [illegible] جناب — اپنی ہستی کا ہمیں وہم و گماں باقی ہے
اے دلِ خام نہیں شرطِ فقیری کچکول — رنج کالا نہ سہی - پر غمِ ناں باقی ہے
ہے دمِ بادِ بہاری سے لرزتی بلبل — چمنستاں میں ابھی رنگِ خزاں باقی ہے
سرِ تسلیم ہے تسلیم رضامندیِ دوست — فکرِ دوزخ نہ تمنائے جناں باقی ہے
اپنے نالوں کو بھی ترسے گی کبھی تو بلبل — اب چہک لے کہ ترے منہ میں زباں باقی ہے
ورقِ سادہ پہ ہے گوہرِ مضموں یاقوت — خط میں رنگِ دلِ خونابہ فشاں باقی ہے
بزمِ یاراں میں شگفتہ ہے معانی کی بہار — جب تلک ناظرِ اعجازِ بیاں باقی ہے

مر کے بھی ہے سرِ صادق میں ہوائے کشمیر
ہوسِ خاکِ رہِ پیرِ مغاں باقی ہے

منتظمین مخزن نے

ارادہ کیا ہے کہ مخزن کی گذشتہ نو جلدوں میں سے جنکی توصیف میں ملکی اخبارات کے صفحات بھرے پڑے ہیں تمام قابلِ قدر نثر کے مضامین کا عطر نکالا اور حصہ نظم سے چوٹی کی برجستہ و دلنشین نظمیں اور اشعار وغیرہ لیکر تقریباً دو ہائی سو صفحے کی ایک کتاب مع تصاویر سربرآوردہ اراکینِ انجمن ترقیٔ اردو مثل جناب شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی۔ ملک الشعرا مولوی حالی۔ مولینا شبلی۔ نواب محسن الملک بہادر۔ نواب وقار الملک مسٹر آرنلڈ صاحب نہایت عمدہ اہتمام سے نفیس کاغذ پر اعلیٰ درجہ کی لکھائی چھپائی سے تیار کیجائے

اس کتاب کی **قیمت** عوام سے عمہ لیجائیگی۔ لیکن ہر نئے خریدار کو یہ کتاب علاوہ محصولڈاک صرف ۸ میں دیجائیگی۔

مخزن کے قدیمی معاونین کے لئے بھی یہ کتاب بجائے خود اپنی دلچسپی میں کسی طرح کم نہ ہوگی اور علاوہ ازیں جنکے پاس فائل مکمل نہیں اُن کے لئے فائل کا کام دیسکیگی۔ یہ کتاب انکی خدمتمیں بلاقیمت نذر ہوگی۔ **بشرطیکہ** وہ ایک نیا خریدار عنایت فرمائیں۔

جن اصحاب کو صرف کتاب کی ضرورت ہو عمہ علاوہ محصولڈاک بھیجکر دفتر مخزن سے منگوالیں

نوٹ: اس عایت سے مستفید صرف وہی لوگ ہو سکینگے جنکی فرمایشیں اس دفتر میں یکم اپریل ۱۹۰۶ء تک پہنچ جائینگی اور اس اشتہار کا حوالہ دینگی۔ مخزن اُن کے نام جنوری ۱۹۰۶ء سے جاری ہو جائیگا۔ اور چندہ کے ساتھ کتاب کی قیمت بھی وصول کر لیجائیگی۔ تاکہ انکو دوبارہ منی آرڈر کی تکلیف نہ دینی پڑے۔ کتاب جو ابھی زیر طبع ہے۔ ایک مہینہ تک تیار ہوکر انکی خدمت میں پہنچ جائیگی۔

مینیجر مخزن لاہور

ملنے کا پتہ یہ ہے - ایس - اے - بی - بخشی - اینڈ کو - کوٹھی نمبر ۱۲ - ہالیڈے اسٹریٹ شہر کلکتہ

اس پتے سے منگائے - ایس - اے - بی - بخشی - اینڈ کو - کوٹھی نمبر ۱۲ - ہالیڈے اسٹریٹ کلکتہ

جلد (۱۰) فروری ۱۹۰۶ء نمبر ۵

ایڈیٹر

شیخ عبدالقادر بی۔ اے

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

مضامین نثر

مضامین نظم

تصویر جناب شمس العلما مولوی محمد ذکا اللہ

نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں۔ اور اسی تعداد کے ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے۔ ان شہروں میں اردو مروج ہے۔ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے۔

شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر نے اپنے مخزن پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

قیمت سالانہ معہ محصولڈاک قسم اول ... فی پرچہ ... قسم دوم ... فی پرچہ ...

مخزن

لڑکیاں اور یورپی تربیت

دو لڑکیوں میں خط و کتابت

حیدرآباد - دکن - ۲۴ ستمبر ۱۹۲۵ء

میری پیاری سلما جان - جو باتیں میں کسی سے کہہ نہیں سکتی وہ تمہیں لکھنا چاہتی ہوں ہائے وہ مدرسے کے دن - کہ جب مجھے کوئی تکلیف ہوئی یا مرضی کے خلاف کوئی بات ہوئی اور میں تمہارے کمرے میں پہنچی - اگر تم کسی کام میں مشغول بھی ہوئیں تو بے تحاشا تم سے لپٹ گئی - گلے میں باہیں ڈالکر - تمہارا منہہ چوم کے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اپنا دردِ دل تمہیں کہ سنایا اور دل کی بھڑاس نکال لی - حیدرآباد! آہ کتنی دور ہوں - پھر اللہ رکھے تم میاں رکھتی ہو - بال بچے رکھتی ہو - گھر کے کام دھندوں میں مشغول ہو - دیکھوں تمہیں اس خط کے پڑھنے کا وقت بھی ملتا ہے یا نہیں -

مجھے یہ خط "میں خیریت سے ہوں اور تمہاری خیر و عافیت کی خواہاں" سے شروع کرنا چاہئے تھا - مگر طبیعت یکسو ہوتی تو کرتی - تمہاری طرح تھوڑی ہوں - تمہاری زندگی میں نہ کوئی شے زیادہ نہ کوئی شے کم - جو تم چاہتی تھیں وہ سب موجود ہے - مجھے دیکھو؟ مجھ پہ کیا بپتا پڑی! پوچھو تو سناؤں اور دل نہ پھرے - پوچھو پھر بھی میں سناؤں گی -

میں نے تمہیں نہیں لکھا۔ تین مہینے ہوتے ہیں دلہن ہوگئی۔ وہ عذرا جسے تم ہمیشہ دیوانی لڑکی کہا کرتی تھیں اب عقل والی عورت ہے مصیبتوں نے سنجیدگی سکھا دی۔

ابھی آدھ گھنٹہ ہوا۔ ایک دیو گھر سے باہر گیا ہے۔ اور میں نے ایسا سانس لیا ہے گویا بڑے ضیق سے نجات پائی۔ میرے ہول دل کو تھوڑا سا آرام ہوا تو میں نے یہ خط لکھنا شروع کیا۔ ان تین مہینوں میں ہر روز تمہیں خط لکھنے کا ارادہ کرتی تھی۔ مگر پریشانیوں سے جو سستی۔ اور خوف سے جو عطالت بدن میں پیدا ہوجاتی ہے اس نے اس ارادے کو پورا نہ ہونے دیا۔ صبح نہیں ہوتی۔ کہ شام ہوجاتی ہے۔ صبح کھانے کے وقت ہم اپنے کمرے سے نکلتے ہیں۔ اور اس وقت میرا پیارا دیو بچہ دیو جثہ۔ اپنی ٹوپی عجب لاابالی ڈھنگ سے آدھے سر پر رکھکر۔ کوٹ عجب بے پروائی سے پہنکر باہر جاتا ہے۔ میری جان میں جان آتی ہے کہ اتنے میں عورتیں ملاقات کے لئے آجاتی ہیں۔ ان سے سر کھپاتی ہوں۔ تیسرے پہر کو میں کپڑے بدل کے تازی ہوا کھانے کے لئے۔ اپنے ایک قفس سے نکل کر۔ دوسرے قفس میں بیٹھ کر جسکی جھلملیاں بند ہوتی ہیں۔ باغ عامہ کی نظارہ کرتی ہوں۔ شام ہوتے ہی گھر پہنچتی ہوں۔ لیکن وہ مجھ سے پہلے وہاں موجود ہوتا ہے۔ رات کو گھر میں زنانہ ہوجاتا ہے۔ اور اس خوفناک قوی ہیکل بت سے میری نفرت اور بڑھ جاتی ہے۔

یہ شادی! کس طرح ہوئی۔ اس کی تاریخ میں تمہیں نہ لکھوں گی۔ کیا فائدہ۔ صرف ان تین مہینوں کی زندگی کی تصویریں ایک ایک کرکے پیش کرتی ہوں۔ انہیں دیکھو۔ اور میری سلمیٰ! مجھ پر دل دکھاؤ۔

وہ لڑکپن کی امیدیں ایک لال کی ہلکی پرواز کی طرح غائب ہوگئیں۔ اڑ گئیں۔ ایک چھوٹی چڑیا کی طرح ان کا خون ہوگیا۔ بیاہ کے بعد تیسرا یا چوتھا دن تھا۔ میں پیانو

کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ مجھ سے ذرا دور آرام کرسی پر ڈھیر ہو رہے تھے۔ میں یونہی بیٹھی
بیٹھی پیانو کو بجا نہیں رہی تھی۔ بلکہ کھیل رہی تھی کہ میرے کانوں میں وہ بھدی اور
کرخت آواز آئی۔

"ہم سنتے ہیں آپ بہت اچھے گانے گاتی ہیں۔ اگر دو ایک آپ ہم کو سنائیگا۔
تو بڑی مہربانی ہوگی"۔

میں رک گئی۔ اور استعجاب آمیز سوال کی نظر سے انکی طرف دیکھنے لگی۔ معلوم نہیں
کہ اس نظر کے انہوں نے کیا معنے لئے کہ کہنے لگے:۔

"کوئی راگنی۔ کوئی ٹپہ۔ کوئی غزل ہمارے واسطے ہو تو۔ ہم یہ نہیں کہتا کہ کیا
سناؤ۔ آپ کو جو پسند ہو وہ سناؤ۔..........

میں مبہوت نظر سے دیکھ رہی تھی اور اس تقریر کو سن رہی تھی۔ وہ پھر فرمانے لگے:۔

"اچھا اور کچھ نہیں تو یہ غزل تو سناؤ۔ دونوں ہاتھوں میں مہندی لگا لے پری۔
لگا لے پری۔ ہاں لگا لے پری"۔

میں کیا جواب دیتی۔ حیران تھی۔ وہ مسلسل گانے کے لئے چیزیں پیش کرتے جاتے تھے

"اچھا صاحب۔ غزل نہیں تو کوئی ناٹک کی چیز ہے۔

دیتا ہوں تجھ کو تخت سلیمان کی قسم۔ (اور اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر پورے جوش اور
نہایت محبت اور حرص بھری نظر سے مجھے دیکھ کر) سائل مجھ سے اے پری تجھے
انسان کی قسم:۔

مجھے چپ لگی ہوئی تھی۔ آخرکار وہ اٹھے اور پیانو کے قریب آکر فرمانے لگے:۔

"صاحب۔ کیا غضب ہے۔ میں اس قدر التماس کیا ہوں۔ آپ قبول نہیں کرتے
ہیں۔ مہربانی کریں۔ [illegible] ہمارا بات کی کوئی چیز آپ سنا دینگے تو کیا ہوگا"۔

میں نے بہت چاہا کہ ان کا خیال کسی اور طرف ہٹ جاوے۔ لیکن [illegible]

انکا اصرار بڑھتا ہی جاتا ہے۔ آخر میں نے مجبور ہو کر کہا۔

"مداری لال - اور امانت کون ہیں میں نے تو کبھی انکا نام بھی نہیں سُنا"

یہ میں نے سچائی سے جواب دے دیا تھا۔ تم ہی بتاؤ تم نے بھی کبھی انکا نام سنا ہے۔ ہم نے تو نہ مدرسے میں۔ نہ گھر میں۔ نہ کسی کتاب میں یہ نام دیکھے۔ مگر انہوں نے اسے بناوٹ سمجھا اور فرمانے لگے :-

"ایں! آپ نہیں جانتے پھر میں تو جانتا ہوں۔ ہندوستان کیا۔ دکن کیا ہر جگہ انکا نام مشہور ہے"۔ اور تھوڑی سے سکوت کے بعد۔ ایک پُر نزاکت مگر معنے دار تبسم کے ساتھ فرمایا :-

خفا نہ ہو صاحب! جو گیت آپ کو پسند ہوں وُہی ہم کو سُناؤ۔ البتہ وہ اچھے ہونگے۔ پیاری سلما! پیاری بہن! تم ہی خیال کر سکتی ہو کہ میں کس مصیبت میں تھی۔ میرا چہرہ کچھ شرم۔ کچھ غصہ سے تمتما اُٹھا۔ اور قریب تھا کہ میں بیہوش ہو جاؤں۔ مگر ضبط کیا اور طبیعت کو تھاما۔

آہ! مس میری - آیئے۔ اور اپنی چہیتی شاگرد کو دیکھئے کہ پیانو کے سامنے عاجز و گم بیٹھی ہے۔ وُہ انگلیاں جنہیں آپ پیانو بجاتی ہوئی دیکھ کر تعجب کیا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ خدا نے انہیں محض موسیقی کے لئے پیدا کیا ہے۔ آیئے اور ان انگلیوں کی ذلت کو دیکھئے۔ سات برس متواتر اسی دن کا خیال کر کے۔ اسی دن کے لئے تیاری کی تاہم ان تمام کوششوں کا نتیجہ دیکھئے۔ مداری لال اور امانت آتے ہیں اور آپکی تعلیمات سب بیکار رہ جاتی ہیں! کیا یہ ہوتا تھا۔ کیا اسی لئے میں نے اتنی محنت اُٹھائی تھی۔ اگر یہ تمام تعلیم بے سود تھی۔ یعنی اگر مینڈلسون[1] اور وگنر[2] مداری لال کے حضور میں سر جھکا کر بھاگ جانے والے تھے۔ تو یہ تعلیم ہی کیوں دی گئی تھی۔ میری سلما بتاؤ۔ آخر کیا فائدہ۔ بتاؤ میں اپنے امانت کے شیدا خاوند سے کیا کہوں۔ کیا عذر کر دوں۔

[1] [2] یورپ کے مشہور موسیقی۔ (ن میں)

ہاں میرا خاوند مجھ سے "دونوں ہاتھوں میں مہندی لگانے پڑی"۔ یہ کل محبت آپ پردہ سمجھیے "نسان کی قسم" کا طالب ہے۔ میں کیا جواب دوں، مجھ ان چیزوں سے واقف نہیں۔ "مجھے ہندی گانے نہیں سکھائے گئے" میں نے سات برس انگریزی گانے سیکھے ہیں"۔ یہی جواب تھے جو میں سیکھتی تھی اور یہی دیتے۔

اس پر انھوں نے نہایت اخلاق اور نرمی سے کہا۔ "بہتر انگریزی گانے ہی سنائیے میرے کو وہ بھی پسند ہوتے ہیں"۔

میں تھوڑی دیر تک انکار کرنے سے شرما رہی تھی۔ میں نے سوچا۔ جو کچھ میں جانتی ہوں انہیں سنانا چاہیے اس لئے میں نے پوچھا "کونسا گانا گاؤں"۔

"صاحب جو آپ کی خوشی ہوگا وہ میں کیا کہوں"۔

اس جواب سے میرا دل بجھ گیا۔ مگر میں نے پھر ہمت کر کے کہا۔ میں "Bulbul and the rose"[51] سناتی ہوں۔

یہ کہ کے میں نے پیانو کے نوٹ پر نظر گاڑ کر بجانا شروع کیا۔

پیانو سے ایک دردانگیز فریاد (یاد ہے۔ یہ مس میری کے الفاظ ہیں۔ وہ اس گانے کے بجانے کے وقت کہا کرتی تھیں کہ پیانو سے plaintive cry[52] نکلتی ہے) نکلنا شروع ہوئی اور میں اس میں محو ہو گئی۔ غیث الدین (میرے خاوند نواب غیاث الدولہ غیاث الملک کا یہ نام ہے۔ معاف کرنا بھول گئی۔ میں اب انٹروڈیوس[53] کرتی ہوں) کچھ دیر تک پیانو کے قریب آ کر کھڑے رہے۔ پھر آنکھیں اس طرح کھولدیں۔ گویا پیانو کے شور سے گھبرا گئے ہیں۔ لیکن سننے کی وضع قائم رکھی۔ دو ایک منٹ سنا بھی۔ آخر اس حالت میں نہ رہا گیا۔ بیٹھے اُٹھے۔ پھر بیٹھے۔ پھر اُٹھے۔ ایک سگرٹ جلایا پھر آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنا شروع کیا میں نے جب یہ دیکھا تو راگ کے پہلے ٹکڑے کو تو خواہ نخواہ پورا کیا۔ اور آخری الفاظ کے لئے پردوں پر نہایت زور سے انگلی مار کر ختم کیا۔ ختم ہوتے ہی فرمایا۔ ماشاءاللہ بہت خوب۔ لیکن اب

[51] گیت بلبل اور گلاب۔ [52] دردناک فریاد۔ [53] معروف انگریزی لفظ بمعنی تقریب تعارف۔

سونا چاہیئے"۔ کیو نکہ ان کا وہ ہے۔ اسکے بعد ابا دیگر کپڑے بدلنے کے لئے چلے
گئے اور وہاں سے بلی کی خرخر کی طرح یہ آواز آنے لگی ؂

مَیں قربان زلفوں کے لٹکانیوالے
مرے دل کو کلیوں میں پھٹکانیوالے

اور میری نظروں میں یہ تصویر پھر گئی - کہ مس میری اور وِگنر کو مراری لال نے کیچڑ میں پھینکدیا ہے
اور خود بنگلہ پر کھڑا ہوا زور زور سے قہقہہ لگا رہا ہے -

سلمیٰ جانی ! ذرا خیال کرنے کا مقام ہے - مَیں کہ دیوانہ وار ہوس کے ساتھ موسیقی کی
عاشق ہوں - سات آٹھ برس سے اسے سیکھ رہی ہوں - ہندوستانی راگ کتنے جانتی
ہوں ؟ مولانا حالی کا :-

"اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے" اور غلام احمد خاں احمدی کا :-

"اے ہمت مردانہ ! جگر میں تری جا ہے
مت آنکھ چُرا مجھ سے اگر شرطِ وفا ہے
تو ہو مرے ہمراہ تو پروا مجھے کیا ہے
سایہ ترے شہپر کا بہ از بالِ ہُما ہے"

یا شاد یا مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی اور ایک آدھ نظم - جسے مس میری نے بدقت تمام
اجازت دی تھی کہ ہم لوگ یاد کر لیں - اور پیانو یا ہارمونیم پر بجائیں - کیونکہ وہ کہا کرتی تھیں کہ
ہندوستانی راگ یاد کرنے سے تمہارا انگریزی مذاق بگڑ جائیگا -

وہ ہیں کہ رات دن ہندی راگوں میں محو ہیں - اب بنے تو کیسے بنے -

لطف تو جب آتا ہے - جب مَیں اتفاقاً خیال میں مستغرق ہو کر اولڈ لینگ سائین
(Old Lang Syne) گانے لگتی ہوں - تو وہ فوراً کوئی گیت شروع
کر دیتے ہیں - جس میں ہجر - وفا - وصل - زخم - تیر - یار - تولیا - رسیا - جوبن - سیاں -
پیاں وغیرہ لفظوں کی بھرمار ہوتی ہے - نہ وہ میری گَت کو سنتے ہیں - نہ مَیں اُن کی کہی کو
سمجھتی ہوں - کمرہ منارۂ بابل ہو جاتا ہے - ایسے وقت میں اگر کہیں وہ دانہ خانم (یہ ایک
ایرانی ماما ہے - جسے والد ماجد کربلا معلی کی زیارت سے واپسی کے وقت اپنے ساتھ لائے

سلہ ایک مشہور پنجابی گانے کے الفاظ ہیں۔

تھے۔ تو جس نے مجھے پالا ہے، کمرے میں آگئی اور اس نے مجھ سے فارسی میں باتیں شروع کر دیں۔ تو غیاث کا چہرہ پُر غضب ہو جاتا ہے۔ [illegible] ایک دن تو برس پڑے۔ میں سمجھی کہ یہ پہنچی تھی۔ [illegible] ہوئی تھی [illegible] آواز دی۔ اس نے سنا نہیں۔ مجھے غصہ آگیا۔ تو میں [illegible] سے چلائی۔

"چلا۔ ایک بات بہت متصل صدا [illegible] پھر [illegible]"

وہ نہ معلوم کب کے [illegible] بیٹھے تھے۔ [illegible] کمرے سے نکل پڑے۔ کہنے لگے: "یا اللہ ہمارے کو سمجھ میں نہیں آتا۔ [illegible] کہ [illegible] ہیں۔ اب ہم کو تعجب آتا ہے کہ ہندوستان میں نہیں ہوں۔"

میں چُپ ہو گئی۔ اور سخت نادم ہوئی۔ مگر یہ کیا قصور تھا۔ خیر مگر آئندہ سے میں اُن کے سامنے دُردانہ خانم سے کبھی کسی کام کو نہ کہتی تھی۔

ایک دن خود لہر میں جو آئے تو دُردانہ خانم سے فارسی میں گفتگو فرمانے لگے۔ مگر فارسی کے گلے پر وہ کُند چھری پھیری کہ مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ اور میں اٹھ کے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

. . . .

سلمیٰ! سلمیٰ! آہ میرے حالِ زار کو دیکھ! کھانے کے بعد متواتر زور سے ڈکار لینے والے آدمی کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہوں۔ کل خیال جو آیا تو دن بھر رویا کی۔ پیٹ پر ہاتھ پھیر کر "عا۔ عا" اونٹ کی طرح ڈکار لینا! اُف غضب۔ غضب۔ یہ میں سوائے تمہارے کسی کو نہیں لکھ سکتی۔ اور اگر تم نے کوئی تدبیر نہ بتائی۔ تو تمہاری عذرا گھُل گھُل کے مر جائیگی۔ . . . .

• ایک دن نہ معلوم کس طرح ادبیات کا ذکر آگیا۔ پوچھنے لگے۔ تمہارے کو اُردو کا کونسا شاعر اچھا معلوم ہوتا ہے؟ یہ ایسا بیڈھب سوال تھا کہ میں بہت گھبرائی۔ صاف یوں ہے

کہ میں نے اُردو کی ادبیات سے بہت ہی کم فائدہ اُٹھایا ہے۔ میں تو یہی سُنا کرتی تھی کہ اُردو کی ادبیات بہت خراب ہیں۔ اخلاق بگاڑتی ہیں۔ مدرسے میں سوائے مولانا حالی کے (کہ انکا بھی کلام نہایت مختصر اور منتخب پڑھایا جاتا تھا) اور کسی شاعر کا نام سُنا نہیں۔ پس میں نے بغیر اس خیال کے کہ دُوسرے شاعروں سے مقابلہ کیا نہیں۔ یہ کہدیا۔

"مولانا حالی کو"

"حالی کو پسند کرنے کی وجہ؟"

! !

؟ ؟

! !

سمجھیں؟ یعنی وُہ ہمہ تن سوال تھے۔ اور میں ہمہ تن استعجاب۔ اور اس طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

میرے پاس کیا جواب تھا۔ کہ میں دیتی۔

آخر کہنے لگے۔ "میں حالی کو تو کچھ بھی نہیں پسند کرتا۔ ہم قافیہ نثر لکھتے ہیں۔ میرے کو "پیام یار" میں غزلیں لکھنے والے سب پسند ہیں۔ اور داغ کے کلام کا تو کیا کہنا۔ واہ واہ سب سے اچھا ہے۔ کیا ہجر۔ کیا وصل کی تصویریں ہیں۔ کیا معاملہ ہے۔ کیا چوچلا۔ آغا شاعر بھی بہت اچھا ہے"۔

پھر کہنے لگے۔ "یہ کیا بات ہے تم مدرسے میں پڑھی ہو۔ لیکن داغ کو نہیں جانتیں"۔

اس پر مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے جواب دیا۔ "بیشک! لیکن آپ بھی تو شکسپیئر اور ملٹن سے واقف نہیں"۔

اُنہوں نے تڑپ کے جواب دیا "میں انگریز ہوتا تو بیشک واقف ہوتا"۔ بس اس پر ہم دونوں چُپ ہو گئے۔ میرے ہونٹوں کو داغ نے سی دیا۔ اُنکے ہونٹوں پر ملٹن نے مہر سکوت لگادی

غرض یُوں بسر ہوتی ہے۔ مَیں تو سمجھتی ہُوں کہ کسی غیر ملک کے باشندے کے ساتھ میری
شادی ہوئی ہے۔ وُہ سمجھتے ہیں کہ انہیں ہندوستانی بیوی نہیں ملی۔

. . . .

ابا جان کی بے پروائی سے تم واقف نہیں۔ عجیب بے پروا آدمی ہیں۔ اماں جانی
نمائش پرست۔ دولت پرست ہیں۔ مَیں یہاں کیوں بیاہی گئی؟ اس سوال کے جواب کی
غالباً اب ضرورت نہ رہی ہوگی۔

اس شادی پر جب کبھی غور کرتی ہُوں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ مَیں کنوئیں میں دھکیل
دی گئی۔ اور ماں نے مجھے کنوئیں میں دھکیلا۔ پہلے یہ ارادہ کر لیا کہ مجھے کنوئیں میں دھکیلیں گی
اور پھر پہلا موقع جو انہیں ہاتھ آیا اسے نہ جانے دیا اور میری پیٹھ پر ایسے زور سے دھکا مارا
کہ مَیں سر کے بل اندر گر پڑی۔ زندگی کچھ نہیں؟ ہاں بیشک۔ گو زندگی سب کچھ ہے، ہم
لئے بھی ہاں بیشک۔ بات یہ ہے کہ مَیں اپنی عقل ہی نہیں رکھتی کہ کسی چیز میں تمیز کر سکوں۔

کیا عجب بات ہے میری اماں۔ کیا عجب بات ہے کہ جس شخص کی دولت۔ حالت
تربیت ایسی ہو کہ یہ کہا جا سکے کہ یہ دُنیا میں ضرور خوش قسمت اور خوشحال رہیگا۔ وُہی بدبخت۔
ناکام۔ ناشاد رہتا ہے۔ اور آخر میں اس نتیجہ کو پہنچتا ہے کہ دُنیا میں خوبی۔ امید و سعادت
نہیں ہے۔ برخلاف اس کے۔ وُہ جو ہر طرح سے ناقص ہے۔ ناکارہ ہے۔ بے علم ہے۔
وُہ خوش قسمت رہتا ہے۔ اپنی زندگی میں کامران۔ شادمان۔ اور ہر طرح کی خوبی اس کے
لئے دوڑی ہوئی آتی ہے۔ مثلاً مَیں خُدا کے فضل سے اچھے گھر میں پیدا ہوئی۔ اچھی طرح
پلی۔ تعلیم پائی۔ بیاہی گئی تو سب کہتے تھے کہ کیا قسمت ہے۔ واہ! ایسا بڑا گھرانا۔
ایسی بڑی ثروت۔ ایسی بڑی دولت۔ یہ لڑکی بہت خوش رہیگی۔ لیکن میری حسرت یہی رہی
ہوا کہ کاش غیاث نے میری طرح اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کی ہوتی۔ لیکن وُہ ہیں کہ شام
کو نوکروں پر گالیوں کی بوچھاڑ۔ ناٹک کے گانوں کے عاشق زار۔ گھوڑ دوڑ کے۔ اور

اُس میں جُوا کھیلنے کے دلدادہ - یہ حالت دیکھ کر تمام اُمیدوں کا خون ہو جاتا ہے -

مَیں خوش قسمت ہوں یا بد قسمت تم مجھے ان تین مہینے کے واقعات جو مَیں نے تمہیں لکھے ہیں پڑھ کر مجھے بتاؤ - اور یہ بھی بتاؤ کہ مَیں کیا کروں - کس راستے پر چلوں - اُسے اپنے راستے پر لاؤں - یا اس دیو پر اپنی جان نثار کر دوں -

بعض لحاظ سے دیکھا جائے تو میرا خاوند بُرا نہیں - نہایت امیر ہے - اور چُونکہ اُس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے - اس لئے کل دولت کا خود ہی مالک ہے - حیدر آباد کے مدرسے میں کچھ دن گذارے ہیں - اس لئے پڑھ لکھ بھی سکتا ہے - اس کی شکل کی کیفیت شاید مَیں اوپر لکھ چکی ہُوں - ویسے بھی تم نے اس خط سے اس کی تصویر ذہن میں کھینچ لی ہوگی - سراپا صحت ہے - اس قدر قوی کہ پہلوان معلوم ہوتا ہے - آواز بھاری گویا ہاتھی پانی پی رہا ہے - بال موٹے موٹے - بڑی بڑی مُوچھیں - چوڑی چوڑی بیچ میں باہر کو نکلی ہُوئی بڑی بڑی آنکھیں سیاہ اور چمکیلی اور خوفناک - اس کے جسم و طبیعت کی تمام ہیئت مادی ان آنکھوں میں آ کر جمع ہو گئی ہے - دن کو جب وہ باہر چلا جاتا ہے تو بھی میں ڈر ڈر کے نفرت کر کرکے ان آنکھوں کا خیال کیا کرتی ہُوں جو مجھے گھورتی ہُوئی نظر آتی ہیں - کیونکہ غیاث مجھے بے انتہا بیتابی کے ساتھ چاہتا ہے - اور اس کی محبت سے مجھے اور وحشت ہوتی ہے - تم جانتی ہو کہ مجھے انسان کے کل اعضا میں آنکھیں بہت پسند ہیں - خدا نے اچھی آنکھیں کچھ عجب شئے بنائی ہیں - لیکن سکو دیکھئے کہ آنکھیں ہی مجھے نفرت اور خوف دلا رہی ہیں -

یہ آنکھیں - یہ ڈکار - یہ آواز - یہ دونوں ہاتھوں میں مہندی لگا لے پری کا عشق کچھ نہیں سُوجھتا کہ کہاں پناہ لوں -

اب ان کی طبیعت کا حال سُنیئے - نچلا خاموش کبھی بیٹھا ہی نہیں جاتا - ہر بات میں دخل در معقولات کا بے انتہا شوق ہے - سیاہ ابر کی طرح گھر پر چھایا ہُوا معلوم ہوتا ہے -

بے انتہا باتونی۔ مگر شاید میں دوسرے حصے کو بھی کان دھر کر نہیں سُنتی۔ کیا تمام حیات
یوں ہی زندگی گذر جائیگی؟ میں اس بوجھ کو یوں ہی اُٹھاؤں گی۔ میں ایسے خاوند کی تمنا
نہ رکھتی تھی۔ ایسا خاوند نہ چاہتی تھی۔ مگر انسان جو نہیں چاہتا وہی اُسے ملتا ہے۔
ممکن ہے کہ میرا جسم اس کے جسم سے نفرت نہ کرے۔ مگر میں تمہیں یقین دلاتی ہوں
کہ میری رُوح۔ میری طبیعت۔ اس کی روح اور طبیعت سے ہمیشہ ہمیشہ اور پوری پوری نفرت کریگی۔
باقی تم سے ملنے اور تمہیں ہزار بار چومنے۔ ورنہ اپنا درد دل سنانے کی تمنا +

تمہاری
عذرا

(جواب)

راولپنڈی۔ ۳۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء۔

میری شریر عذرا۔ تم نے اپنے خط میں عقل والی عورت بننے کی کوشش تو بہت
کی۔ لیکن ہر سطر سے صاف ٹپکتا ہے۔ کہ تم وُہی شریر عذرا ہو۔
سب سے اوّل شادی کی دلی مبارکباد دیتی ہوں۔ یقین مانو۔ میں اپنی عمر کے
چند برس اس بات پر فدا کرنے کو تیار ہوں۔ کہ تمہارے سُرخ رخساروں کو جن پر تمہارے
سیاہ بال آپڑے ہوں، دیکھوں۔ اُن رخساروں کو نہیں جو مدرسے میں تھے۔ بلکہ اُن
رخساروں کو جنہیں ہوا کے تاہل نے اور دمکا دیا ہوگا۔ آہ پیاری عذرا۔
تمہیں چومنے۔ دیوانہ وار چومنے کی اور تم سے چومے جانے کی تمنا رکھتی
ہوں۔ لو میں نے کاغذ پر اس جگہ (   ) کو
چوما ہے۔ اور میں خیال کرتی ہوں کہ میری رُوح محبت کا ایک ٹکڑا۔ اس جگہ چپک کے
رہ گیا ہوگا۔ اس مقام کو تم بھی چومنا۔ تاکہ اسی طرح سے میرے ہونٹ تمہارے
ہونٹوں سے ایک جگہ ملیں۔ اور میری رُوح کو مسرت پہنچے۔

تم نے اپنے خط میں کیا کیا کہہ ڈالا ہے۔ تمہارے خیالات نے (معاف کرنا بعض ان میں سے پراگندہ ہیں) تو مجھے حیرت میں ڈالدیا۔ تم نے خذف اور الماس کو خوب ملایا ہے۔

تمہارا خط پڑھتے وقت میں کس قدر ہنسی ہوں۔ میری شوخ۔ تناطر مندز اسی بھڑک۔ اسی بھڑک۔ اسی چنچل پن سے میری آنکھوں میں پھر گئی۔ وہی ممدو۔ جو اپنی شرارتوں اور ہٹوں سے کبھی مجھے غصہ دلا دیا کرتی تھی اور کبھی بے تحاشا ہنسا دیا کرتی تھی۔

لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میں صرف ہنسی ہی ہنسی۔ یا میں تمہارے خط کو ایک ادبی تحریر سمجھی نہیں مجھے اس خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تم نے حقیقت میں اپنا درد دل لکھا ہے۔ اور اس لئے میں نے تمہاری تحریر پر جداً نظر ڈالی۔ اور کئی دن تک اسی کے متعلق سوچتی رہی۔ تمہاری اور اپنی حالت کا موازنہ کرتی رہی۔ میری اور تمہاری تربیت میں بہت ہی کم فرق ہے۔ ہم دونوں نے ایک ہی مدرسہ میں تعلیم پائی۔ لیکن ہاں چونکہ میرے والد خود شاعر اور اردو کے بڑے حامی اور دلدادہ تھے۔ اس لئے کچھ ان کی کوشش سے کچھ اپنے شوق سے۔ مجھے اردو میں تم سے زیادہ مصروفیت رہی اور یہی وجہ ہے کہ میں انگریزی تو تمہارے برابر نہیں جانتی۔ مگر اردو ضرور تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ بولنے میں نہیں۔ کیونکہ تمہاری رواں اور پیاری زبان اور وہ بھی دلی کی کہاں سے لاؤں۔ ہاں لکھنے میں۔ کیونکہ والد کے مضامین۔ اور ان کے کتبخانے کی کتابیں کثرت سے پڑھتی رہی ہوں۔ اس لئے طبیعت تحریری اردو سے آشنا ہو گئی۔ پیانو۔ موسیقی۔ نقاشی۔ اس میں ہم دونوں برابر ہیں۔ پھر بیاہ کا زمانہ آیا۔ قسمت نے بیاہ کے قرعہ میں میرے نام کے ساتھ۔ ولایت کے پاس شدہ انجنیر مسٹر حامد کا نام نکالدیا۔ تمہارے نام کے ساتھ نواب غیاث الدین کی چٹھی نکلی۔ اور ہمارے ماں باپوں نے ہمیں اپنی آغوش سے جدا کر کے ان لوگوں کے پہلو میں پھینکدیا۔

دل چاہتا ہے کہ اس مسئلۂ ازدواج پر کچھ تھوڑا سا وعظ کہوں۔ پہلے بیاہ شادیوں میں کیا دیکھا جاتا تھا۔ ذات پات اور گھر بار۔ ہم کفو ہیں یا نہیں۔ ایک برادری کا ہے یا نہیں۔ اس کفو اور برادری پر سب چیزیں قربان کر دی جاتی تھیں۔ پھر اصلاح ہوئی۔ کفو کا خیال ترک کر دیا گیا۔ تعلیم کا زور ہوا۔ بر تعلیم یافتہ ہو۔ چاہئے تعلیم یافتہ ہو چاہئے۔ کا شور بلند ہوا۔ تھوڑے دنوں کے بعد اخلاق کی چھان بین ہونے لگی۔ بس یہاں پہنچ کے اصلاح رخصت ہوئی گویا اب کوئی کام باقی نہیں رہا۔ لیکن مجھ سے پوچھو تو کوئی کام ہوا ہی نہیں۔ اصلی اصلاح تو جب ہے۔ جب لڑکے لڑکی کے مزاج۔ و طبیعت کی مناسبت کی پوری پوری چھان بین کیجاتی ہے۔ لحاف اور تلائی دوہرے کپڑے کی ابری استر ہیں۔ ابری۔ استر کے رنگ کی مناسبت کا کتنا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ دونوں ایک ہی رنگ کے ہوتے ہوں۔ نہیں۔ یکرنگی میں کوئی زینت نہیں۔ خیال یہ کیا جاتا ہے کہ ایک رنگ دوسرے سے جوڑ کھاتا ہو۔

بس اسی طرح۔ لڑکے لڑکی کے مزاج کا خیال لازمی ہو۔ امتزاج کے اسباب موجود ہیں یا نہیں طبیعتوں میں ایسا تو تضاد نہیں کہ میل کھانا مشکل ہو۔ میرے نزدیک تو سب سے زیادہ اہم یہ سوال ہیں۔ حسن جمال۔ مال دولت۔ تعلیم و تربیت۔ سب کو میں دوسرے درجہ پر رکھتی ہوں۔۔

شاید تمہاری طبیعت اس وعظ سے گھبراتی ہوگی۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ میں اس بحث کو ترک کئے دیتی ہوں۔ مگر کیسے ترک کروں۔ آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں کہ تم سے میں ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ مزاج میں سنجیدگی نہیں۔ الھڑ ہے۔ اور میں تجھے تم ہمیشہ خیال پرست sentimental شاعر مزاج کہا کرتی تھیں۔ ہم دونوں ایسے خاوندوں کے پالے پڑیں۔ کہ اگر ان لوگوں کے ساتھ شادی نہ ہوئی ہوتی۔ تو چاہے یہ بھائی ہی ہوتے۔ ہم انکے پاس دس منٹ بیٹھنے سے گھبراتے اور شاید وہ لوگ

ہمارے ستنے ایسا ہی خیال رکھتے ہو نگے۔ عدالت ہو یا انصاف ہے؟ کہو ہاں سوائے اس سنے اور کیا کہنا ممکن ہے۔ لیکن اس تضاد کا سبب کون ہے۔ ان خواہیوں کا جواب وہ اسکو دراور بنا چاہئے۔ تب تو بلا پس و پیش مانتی ہوں۔ بارے ان باتوں کو۔

اگرچہ خدا مبارک کرے تمہیں پریشان کرونگی۔ مگر میں بھی تمہیں اپنی زندگی کا مرقع دکھاتی ہوں۔ یہ مسٹر حامد کیسے آدمی ہیں؟ ان کے حیات۔ اور خیالات کیا ہیں۔ افکار کیا ہیں؟ ان کے حیات۔ اور خیالات یہ ہیں۔ (۰ × ۰ = ۰)۔

آہ! تم ایسا خاوند چاہتی تھیں۔ جو رات دن تمہارے ساتھ ہنسا کرے تمہارے کھیلوں میں شریک ہوا کرے۔ مجھے ایسے شوہر کی تمنا تھی۔ جو کسی باغ کے تختہ میں کھلتی ہوئی چنبیلی یا کسی پژمردہ کلی کو دیکھ کر میرے ساتھ روتے۔ میرے ساتھ ہر دم عالم خیال میں رہے۔

حال یہ ہے کہ مسٹر حامد۔ جب رات کو گھر میں تشریف لاتے ہیں۔ تو اس خوف سے کہ کہیں انکی نیند نہ اڑ جائے۔ میری باتوں کا جواب بھی نہیں دیتے۔ اگر کسی دن تعطیل کے ایام میں گھر میں کچھ ٹھہرے بھی۔ اور میں نے ان کی خاطر کچھ بجانا شروع کیا۔ تو وہ فوراً آرام کرسی پر لیٹ کر سونا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ان کے اوقات کا نقشہ ہے جو میں نے کھینچا ہے:

سونا	۹ گھنٹے
سرکاری کام	۷ گھنٹے
سیر و تفریح و ریاضت	۶ گھنٹے
گھر میں	۲ گھنٹے
میزان	۲۴

ذرا دیکھنا! ۲۴ گھنٹوں میں دو گھنٹے مجھے دیتے ہیں۔ کہ اس حساب سے سال میں میری ان کی ملاقات صرف دو مہینے ہوتی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ ان دو گھنٹوں میں

گھر کے معاملات۔ بچوں کا دیکھنا بھی شامل ہے۔ غرضکہ مسٹر بجنیر نے یہ حساب پورا پورا جما رکھا
ہے۔ اور اس پر بہت باقاعدہ عمل ہوتا ہے۔

عذرا۔ تمہیں بھی قسم ہے۔ اس تقسیم اوقات کے متعلق ذرا اپنی کہے دو۔

گھر کے تمام انتظامات اور معاملات میرے متعلق ہیں۔ خانہ داری کے متعلق ذرا ذرا سی چیزوں
میں پھنسنا نہیں چاہتے۔ میں جو چاہوں کروں۔ مجھے پوری آزادی ہے۔ بچوں کو پڑھاؤں۔ یا
مار ڈالوں۔ گھر تبدیل کر دوں۔ اسباب بیچ ڈالوں۔ اور خرید لوں۔ نوکروں کو مقرر کروں۔ برخاست
کروں۔ غرضکہ جو چاہوں کروں۔ مختار ہوں۔

وہ گھر کو ہوٹل سمجھتے ہیں۔ اور کھانے پینے اور سونے کے لئے یہاں آتے ہیں۔ ان
تین باتوں کے انتظام میں وہ خلل نہیں چاہتے۔ اگر میں بیمار بھی پڑ جاؤں تو ان کے مقررہ اوقات
میں فرق نہیں پڑتا۔ خود طبیعت ناساز ہو تو ظاہر ہے کہ ان معمولات میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

کم سخنی کا وہ عالم ہے کہ بات ان کے دہان مبارک سے اول تو نکلتی ہی نہ۔ اور جب نکلتی ہے
تو تل تل کے رتی رتی نکلتی ہے۔ میری تعلیم و تربیت معمولی تعلیم و تربیت نہ تھی۔ مدرسے کے
علاوہ گھر پر بھی مجھ پر تربیت کی بوچھاڑ رہی۔ کورس ختم کیا۔ اور کیا۔ سب سے گہری بی۔
پھر دلہن بنی۔ اور ایسے شخص کو سونپی گئی۔ جو بڑا تعلیم یافتہ۔ سات سمندر پار سے پڑھ کے آیا تھا۔
اور اللہ! کن کن امیدوں کے ساتھ میں اپنے خاوند کے پاس گئی۔ پہنچی تو عالم کچھ اور ہی
پایا! کیا عالم امید اور عالم حقیقت۔ عالم خیالی اور عالم اصلی میں ہمیشہ اتنا فرق ہوتا ہے؟

حامد نے تمہارے خاوند کی طرح ہر دم میرے ساتھ رہنے سے مجھے پریشان نہیں کیا۔
بلکہ مجھے وہ آزادی دی جس سے میرے حق میں بے پروائی کی بو نکلتی تھی۔

تم جانتی ہو میں ایسی بدشکل تو نہیں۔ میری ملاقاتنیں اور آئینہ اس کی شہادت دیتے
ہیں۔ جب یہ بات ہے تو کیوں میں اپنی تعلیم و تربیت و حسن کے شایان۔ باکمال عزت زندگی بسر
نہ کروں۔ کیوں میری قسمت میں یہ بے پروائی لکھی ہوئی ہے؟ اسے سوچتے سوچتے میں کبھی چلا

ــــه انگریزی مضمون

اُٹھتی۔ "یہی بے پروائی ہے۔ تو میں بھی۔ ناولوں کی سی زندگی شروع کیوں نہ کر دوں۔ یہ شخص جو میری تحقیر کرتا ہے۔ اُس کا جواب تحقیر سے دوں"۔ میری معتوبات۔ اور میری ماتّیات میرا بازو پکڑتے تھے۔ اور ایک اپنی طرف کھینچتی۔ اور دوسری اپنی طرف۔ آدھی رات تک اپنے خاوند کا انتظار کرتے ہُوئے۔ اپنی لڑکی کو تھپکاتی ہُوئی۔ اس کشمکش میں ماکرتی تھی۔ میں سوچتی تھی۔ کہ میں اپنے خاوند کی سیر۔ اُس کی باندی ہو سکتی ہوں۔ مگر اُس کی طرف سے باندی کرنے کی کوشش تو دیکھوں؟ وہ گیا۔ خدا کا ری محبت۔ مگر اس کا وہاں نام و نشان نہیں تھا۔ شاید میں نے پڑھا لکھا نہ ہوتا تو یہ خیالات میرے ذہن میں نہ آتے۔ شاید میری نظر سطحی ہوتی۔ اور اس لئے میں زیادہ متحمل۔ زیادہ صابر ہوتی۔ شاید میرے ذہن میں نہ آتا کہ حقارت کا مقابلہ حقارت سے کیا جا سکتا ہے۔ شاید میں یہی نہ سمجھتی کہ میری حقارت کی جا رہی ہے (اگر نہیں تعلیم پاتی تو اور بھی زیادہ وحشی ہوتی۔ سوچنے۔ موازنہ کرنے۔ اور طبیعت کو رو کنے کا مادہ نہ ہوتا)۔

ایک دن ایک عورت اپنا دُکھڑا سُنا رہی تھی۔ میں نے ہمدردی کے طریقہ سے کہا۔ صبر کرو۔ صبر۔ اچھی چیز ہے۔ وُہ شکایت آمیز آواز سے کہنے لگی "بیشک۔ صبر۔ مگر صبر کے بعد قبر" سوچتی ہُوں تو اسے صحیح پاتی ہوں۔ اِنسان دومرتبہ دُنیا میں نہیں آتا۔ شباب عود نہیں کرتا۔ فرض کرو کہ یہ بے اعتنائی میری طرف سے ہوتی تو کیا انہیں شکایت کا موقعہ نہ ہوتا۔

یہ باتیں تمہیں لکھ رہی تھی۔ کہ میری چھوٹی لڑکی جمیلہ۔ دوڑی دوڑی میرے پاس آئی اور اپنی پیاری پیاری۔ ننھی ننھی آواز سے کہنے لگی۔ "اماں جان! آج تم نے مجھے چُوما نہیں"۔ اور یہ کہہ کے کُرسی پر چڑھ کر میری گود میں آبیٹھی۔ اور اس نے تمام میرے دل کی جراحتوں پر مرہم کا کام دیا۔ عذرا۔ پیاری۔ خدا تمہیں بھی بال بچہ دے۔ اولاد بڑی نعمت ہے ساری دُنیا کے غم اُس کے سامنے بھاگ جاتے ہیں۔ اپنی بچیوں کو دیکھ کر یہ زندان مجھے بہشت معلوم ہوتا ہے۔ یا میں اپنے تئیں ایک باغ تصوّر کرتی ہُوں جس میں یہ پھول کھل رہے ہیں۔ جُوں جُوں پھول کھلتے ہیں۔ باغ کی مسرت بڑھتی جاتی ہے۔

پیاری عذرا۔ میں دیکھتی ہوں کہ علم میں میرا خاوند چاہے مجھ سے بڑھکر ہو چاہے میرے برابر ہو۔ ایک بات میں تو میں قطعی طور پر اُس سے بڑھی ہوئی ہوں۔ اور وہ بات محبت اور شفقت ہے۔ میں اپنی بچیوں کو جُو متے وقت۔ اپنی محرومیت۔ اور اپنی بدنصیبی سب بھُول جاتی ہُوں۔ حامد نے شفقت۔ اور محبت کا نشان تک نہیں۔ اُس نے نہ اقلیدس میں اُسے پڑھا۔ نہ جبر و مقابلہ میں اس لفظ کو دیکھا۔ آج میں ان لڑکیوں کو لیکر چلی جاؤں۔ تو اگر میری ضرورت اُسے نہ ہو تو کبھی بھُول کر بھی لڑکیوں کا خیال نہ کرے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ یہ حسن شفقت میرے لئے اپنے خاوند پر تفوق کا باعث ہے۔ لیکن غور سے دیکھو تو یہی تفوق۔ میری اور کل عورتوں کی ذلت کا باعث ہوتا ہے۔

حامد کو گھر میں اگر کسی چیز سے دلچسپی ہے تو اس سے کہ لڑکیوں کو نقشہ کشی سکھائے۔ کسی دن تعطیل کا پُورا دن اسی میں صرف ہو جاتا ہے۔ بڑی لڑکی سعیدہ ابھی سال بھر ہوا۔ علی گڈھ بھیجدی گئی۔ وہاں لوگوں نے اُس کی نقشہ کشی اور مصوری کی لیاقت دیکھ کر بہت تعجب کیا۔ کبھی دونوں لڑکیوں کو ساتھ لیجا کر انہیں بائیسکل پر چڑھنا سکھاتے ہیں)۔

(میں دُعا کرتی ہُوں ان دو لڑکیوں کی قسمت میری سی نہ ہو۔ یہ تصویریں کھینچنے والی بائیسکل پر سوار ہونے والی لڑکیاں۔ ساکن و راکد اور ٹھوس طبیعت والے خاوندوں کے پالے نہ پڑیں)۔

بارہ برس سے میں حامد کی بی بی ہوں۔ مجھے تو یاد نہیں پڑتا مکانوں کے نقشے یا کھینچنے کے تاش کے علاوہ کوئی کاغذ میں نے اُن کے ہاتھ میں دیکھا ہو۔ نقشے کھینچنا۔ ایک۔ تاش کھیلنا۔ دو۔ یہ اُن کے شغل ہیں۔ کبھی کوئی بحث۔ کبھی کوئی بات جس سے دل میں حرکت۔ دماغ میں چمک پیدا ہو۔ میں نے اُن سے نہیں سُنی۔

اُن سے ملنے دوست بھی آتے ہیں۔ تو چُپکے چُپکے تاش کھیل کے چلے جاتے ہیں۔ دُنیا میں انہیں کسی چیز کے متعلق جوش نہیں آتا۔ اِن دو شغلوں کے علاوہ دُنیا کے کسی واقعہ کا اُن کے دماغ میں گذر نہیں ہوتا۔ ان کھیلوں۔ اِن شغلوں کو بھی مقررہ اوقات میں کرتے ہیں۔ غرضکہ اُن کا فلسفہ حیات نباتات کی طرح خاموش زندگی بسر کرنا ہے۔ ہاں یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ زندہ ہیں۔ کبھی کبھی تاش کھیل لیتا ہے۔

وُہ دِن نہ بھُولوں گی کئی برس ہُوئے۔ اِس سکوتِ مطلق سے عاجز آکر میں ایک دن اُن سے خُوب لڑی۔ اِس طرح :-

"اِس ٹھیرے پانی جیسی زندگی سے تو میں اُکتا گئی۔ خُدا کے لئے کچھ حرکت کرو۔ کوئی بات کہو۔ اور نہ سہی مجھ سے لڑو۔ شور مچاؤ۔ مجھے معلوم تو ہو کہ تمہاری رگوں میں خُون دوڑتا ہے۔ اور میں ایک مرد کی رفیقہ ہُوں۔ جاؤ کسی بیگانی عورت سے محبت کرو۔ تاکہ اس حالت کو دیکھوں۔ ورنہ اسی طرح اس یکرنگ۔ یک آہنگ زندگی میں کچھ فرق آئے۔ ورنہ یہ مکان قبرستان سے بدتر ہو رہا ہے۔ یہ مَوت جیسی زندگی کب تک رہیگی۔ اچھا۔ یہ نہیں تو آؤ۔ مجھے مارو۔ میرے بال نوچو۔ آؤ۔ کچھ تو کرو۔ میں کیا کیا باتیں تمہیں سُنا رہی ہُوں۔ سُنتے ہو۔ سمجھتے ہو کہ نہیں"۔

مَیں اِس چیخنے چلّانے سے تھک کر چُپ ہو رہی۔ مگر انکی طرف سے کوئی جواب نہ تھا۔ نہ استہزا۔ نہ غُصہ۔ نہ حدّت۔ کہا تو یہ کہا (وُہ بھی نہایت آہستہ سے) "ذرا میرا کوٹ لا دیجئے۔ شمیل کے ہاں جانا ہے۔ اُن سے آج تاش کھیلنے کا وعدہ کیا تھا"۔ یہ کہہ کے باہر چلے گئے۔ میں کُرسی پر گر پڑی اور بڑی دیر تک روئی۔

ساتھ ہی اِس کے یہ خیال رہے۔ وُہ میری کسی طرح کھُلی کھُلی تحقیر۔ تذلیل کبھی نہیں کرتے۔ کبھی "تم" کا لفظ میں نے اُن کی زبان سے نہیں سُنا۔ ہمیشہ "آپ" کا استعمال کرتے ہیں۔ نہایت عزت اور احترام کا برتاؤ کرتے ہیں۔

لیکن بہت سے امر کچھ خصوصی احترام نہیں طبیعت کی اُفتاد وہی طرح ہوئی ہے۔ گویا ایک کل کا
آدمی ہے۔ جسے اسی طرح کی کوک ملی ہے۔ اور اُس کوک کے مطابق چل رہا ہے۔
باہر والے ہمیں سمجھیں گے کہ ہماری زندگی بڑی اچھی۔ اور قابل رشک زندگی
ہے لیکن اگر اس پوشیدہ حقیقت کو دیکھیں تو . . . .

پیاری عذرا۔ تم نے اپنے خاوند کے حال میں لکھا ہے۔ خاموش نہیں
بیٹھا جاتا۔ ہر بات میں دخل دیتا ہے۔ حرص بھری نظروں سے مجھے دیکھتا ہے
وغیرہ وغیرہ۔ میں اس کے جواب میں تمہیں صاف کہا دیتی ہوں۔ اُس کی لالچی
نظریں۔ غرورِ نسوانی کے لئے غذا ہیں۔ میں تم سے کہتی ہوں۔ خوشی خوشی
زندگی بسر کرو۔ تمہاری۔ اور تمہارے خاوند کی تربیت میں اختلاف ہے مزاج
میں بھی تھوڑا سا اختلاف ہے۔ مگر نہ اتنا کہ کوشش کرکے ایک دوسرے کے
موافق نہ ہو جائے پس اس کے ساتھ ہنسی خوشی بسر کرو۔ تمہارے خاوند کی ایک
زندگی تو ہے۔ کچھ پرواہ نہیں۔ اگر وہ شور مچاتا ہے۔ ڈکار لیتا ہے۔ ناک کے
گلے سے گاتا ہے۔ یہ باتیں اس قدر تحمل فرسا نہیں۔ جیسی میری گھر کی بے حرکت
بے مآل زندگی۔ میں ان احترامات کی کیسی برداشت کروں۔ تمہیں یاد ہوگا شادی
سے پہلے میں کہا کرتی تھی کہ میں اپنے خاوند پر حکم کیا کروں گی۔ اُس کی آمر مجبور
ہوں گی۔ لیکن اب دیکھو میرے تمام خیالات بدل گئے۔ میں چاہتی ہوں۔ کہ وہ میرا احترام
کرے نہ کرے۔ لیکن مجھ سے اپنا احترام کرائے۔ اور دل میں ایسا گھر کرلے۔ کہ چاہے
مجھے اذیتیں دے لیکن میں اُس کی مطلوب مشتاق رہوں۔ ان اذیتوں سے لذت
اُٹھاؤں۔

اُف! سنسان۔ بے صدا جینا کچھ جینا نہیں۔ اُردو کا شیکسپیئر غالب۔
کیا صحیح کہ گیا ہے:- ع

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی +

سکون کی خواہش ہو تو اس کے لئے قبر موجود ہے۔ مرنے سے کوئی روکتا نہیں۔ یہ سمجھ لو۔ کہ فکر کی لذت۔ خیال کی لذت۔ شور و شغب کی لذت سے بڑھکر ہے مگر نہ حس نہ حرکت۔ نہ عالمِ خیال میں میرے ساتھ شرکت۔ نہ عالمِ وجود میں میرے ساتھ شرکت! اس کو زندگی کہتی ہو؟

باقی تمہاری پیاری آنکھوں۔ تمہارے سیاہ بالوں۔ تمہارے سرخ گلگوں رخساروں سے اشتیاق اور حسرت کے ساتھ لاکھوں کروڑوں بوسے لینے کی آرزو

تمہاری غتون سلی

سجاد حیدر (از بغداد)

جناب خان بہادر شمس العلما مولوی محمد ذکاءاللہ صاحب کے ہم بیحد ممنون منت ہیں کہ انہوں نے نہ صرف اپنے معلومات سے بھرے ہوئے مضامین سے اس رسالے کو مستفید فرمایا۔ بلکہ ہماری درخواست پر ہمیں اپنی تصویر بھی عنایت کی۔ جس کی نقل اس پرچے کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ کار آمد اور مفید مضامین کی بہت سی کتابوں کے ترجمے انگریزی سے اردو میں صاحب موصوف کی توجہ سے ہوئے۔ ان تراجم میں سے کئی کتب مدارس میں شامل ہیں۔ اس کے سوا آپکی تالیفات اور تصنیفات کی تعداد کثیر ہے جنمیں تاریخ ہند اور حیات وکٹوریہ آپکی ضخیم کتب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ آپ کی تالیفات کے اوراق کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی ہے اور اب اسی شغل میں معروف ہیں۔ خدا کرے آپکا فیض جاری رہے +

اُردو تحریر کی ابتدائی مشق کے چند نمونے

شیخ عبدالقادر صاحب ایڈنبرا کی سیر کو آئے تو راقم کو بھی ان سے ملنے کی مسرت
حاصل ہوئی۔ ان صاحب سے ہندوستانی دنیا اس طرح واقف ہے کہ اس موقع پر مجھے
انکی محبت جو انہیں اُردو یا انڈیا کی عام بولی سے ہے۔ جتانے کی مطلق ضرورت نہیں۔ تب
انکی فرمایش کو پورا کرنے کے خیال سے۔ اور ایسا کون ہو سکتا ہے جس سے انکی
فرمایش نہ ہوتی ہو۔ ذیل کی چند سطریں لکھیں۔ جن میں میری اپنی اُردو کو غلطیت پر نام چارہ
کا دخل ہے۔

یہاں ایڈنبرا یونیورسٹی کے شاندار کتب خانے میں سات سو سے اوپر عربی اور
فارسی علوم کی کتابیں فراہم ہیں۔ جن میں چند اُردو تصانیف بھی شامل ہیں۔ انکی آمد غالباً
۱۷۶۴ء سے بھی پہلے سے شروع ہوئی (اور اب تک جاری ہے) ضرور بعض قلمی نسخے
بھی ان میں موجود ہوں۔ بجز چند طلائی خوشرنگ با تصویر فرمانوں اور کتابوں کے
جو شیشے کے صندوقوں میں بند۔ ع (دیکھتا جا مرے مرقد سے گذرنے والے)
کسی امریکن یا یورپین سیاح کی نظر حیرت کو چند لمحوں کے لئے اپنی طرف... ان کی بقیہ جماعت
باقی جیسی تین الماریوں میں بند ہوتی گئیں۔ کتب خانے کے ملازم تو معذور تھے۔ لیکن
جن غیر لوگوں کو انکا پتہ ملا ان میں سے چند نے انکو ترتیب دینے اُنکا حال لکھنے کا
گراں مگر دلچسپ بار اپنے ذمے لیا۔ اس آخری زمرہ میں ایک پردیسی ہندوستانی کا
نام بھی داخل ہے اور وہ نام راقم کا ہے۔ واضح رہے کسی اور نام کے اضافہ کی
گنجایش اب نہیں رہی۔ شروع شروع میں جن صاحب نے فہرست لکھنے کی تکلیف اٹھائی اور

پانچ سو میں سے چار یہ سو قلمی نسخے انکی طبع رسا کے خاموش گواہ ہیں۔ اُسکا نمونہ قابلِ غور ہے۔ اِس لئے ایک یہاں بھی ترجمہ کیا جاتا ہے :-

"تفسیرِ خاقانی۔ کتاب پرانی نادر غریب۔ قیمت کچھ زیادہ نہیں۔ تاریخی علم کی تصنیف۔ منجملہ مسلمانوں کے ولیوں کے حالات پر۔ مصنف اپنے آپ کو لکھتا ہے حقیر فقیر اور نفرت کے قابل۔ اور اخیر میں لکھتا ہے تم تم تم یعنی کتاب ختم ہوئی ختم ہوئی ختم ہوئی"

یہ تو جانتے تھے امام خاقانی کے قصاید دقیق ہاں یہ اُن کے سمجھنے کے لئے کسی تفسیر کا پڑھنا مناسب لیکن یہ بات اب کھلی کہ تفسیر قصاید سے بھی زیادہ مطلب خیز ہو سکتی ہے۔ مثال لکھنے کو تو میں لکھ گیا لیکن جس طرح مستثنا سے کوئی احکام قایم نہیں ہو سکتا عام رواج کا جتا دینا ضرور ہے۔ اور وہ یہ کہ برطانیہ اعظم تو کیا مہذب یورپ کے کل بڑی بڑی شہروں میں مشرقی علوم و فنون کے اکثر ایسے شوقین ملینگے جنہوں نے اپنی عزیز عمروں کے بیس بیس تیس تیس برس برٹش میوزیم۔ بوڈلین۔ پیرس (یا بقول شیخ عبدالقادر "پری") سینٹ پیٹرسبرگ یا انکی شان کے اور کتب خانوں میں متواتر بسر کئے ہوں۔ سبب یہ ہے اُنکے مذاقوں کے موافق مصالح اکٹھا ہے۔ ؎

ہر کجا چشمہ بود شیریں   مردم و مرغ و مور گرد آیند

اعلیٰ سے اعلیٰ معلموں کے فیضانِ صحبت اور ہر فن کے نفیس سے نفیس نسخوں کی تلاوت سے موثر ہونے کی اُنکو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اور حقیقت میں بات یہ ہے ایک ہندوستانی کو آج جسقدر عمدہ موقعہ ذرا سے وسیلہ سے نیم جان عربی اور فارسی اور مُردہ سنسکرت کی نایاب کتابوں کی چھان بین کا یورپ میں میسر آسکتا ہے اور کہیں تو ناممکن ہے۔ مجھے ایک قسم کا اچنبھا ہوتا تھا۔ جب میں کچھ عرصہ ہوا۔ برٹش میوزیم کے عظیم الشان کتب خانے کے علوم مشرقی کے حصہ میں اپنے سامنے داہنیں اور بائیں چند

سفید کھال بھورے بال۔ سیاہ پوش صاحبوں کو سیدھی طرف سے لکھی جانے والی زبانوں کے
بعض بوسیدہ نسخوں کو بہت غور اور احتیاط سے دیکھ بھال کرتے دیکھتا تھا۔ تو یہ
گندمی رنگ اور سیاہ سر نوجوان کا بیرونی سیر سپاٹے کو چھوڑ کر عالم سکوت میں مشغول رہنا
رہنا انکو بھی تھوڑی دیر کے لئے متحیر کرتا ہوگا۔ یورپ کے کتب خانے جن شان کے
لئے شہرہ آفاق ہیں اس کے پیدا کرنے میں صدیاں لگی ہیں۔ اب تو آپ کی مطبوعہ
جلدیں جن سے وہ پٹے پڑے ہیں۔ صرف چند بار کی خرید سے پیدا ہو نہیں سکتیں۔ بلکہ
زیادہ تر مال وصول ہوا نذرانوں کی بدولت جو اُن کے مربی اپنی حمایت سے بغیر
کسی طلب کے وقتاً فوقتاً زندگی میں خود پیش کرتے گئے اور مرتے بھی تو بہت کچھ چھوڑ گئے۔
ہندوستان کی قومیں بھی جنکی سخاوت ہمیشہ ضرب المثل رہی۔ یورپین کی طرح دولتمند اور
روشن خیال ہوتیں تو یقین تھا کہ آج علی گڑھ اور بنارس میں مشرقی علوم کا ایسا ذخیرہ اکٹھا
ہوتا کہ تیس کروڑ رعایا میں تیس لاکھ جلدیں تو ٹوٹل ہو سکتیں۔ اردو زبان کو علم سے آراستہ
کرنے کے لئے عربی فارسی اور سنسکرت کے علمی دریا کو کھنگولنا اور در نایاب کی طرح الفاظ
کو چن کر انکو اردو کی زینت کی ترقی میں پرونا کس قدر ضروری ہے۔ میں نے سنا تھا
شمس العلما مولوی حافظ نذیر احمد خاں ال ال ڈی نے "گلمنز ہیونز" ایک نجوم کی کتاب کو
انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے میں کثرت سے عربی لغت کا استعمال کیا۔ کیونکہ اردو
میں نجوم کے سوا اور بہت سے علوم بالکل معدوم ہیں۔ اردو جو اس وقت ہندوستان کی
عام بولی ہونے کا فخر رکھتی ہے۔ اردو جو انگریزی کے ہم پہلو برٹش مقبوضات میں پھیلتی
چلی جاتی ہے۔ اردو جو ہندوستان کی سب سے زیادہ شستہ زبان ہے۔ اس کا
حق سارے خیرخواہان قوم پر ہے۔ اس زبان کو دنیا کی اعلیٰ زبانوں کے مرتبہ کو پہنچنے
کے لئے ہمیں مغربی علوم شریک کرتے وقت ان قدیم ذرائع کو ہاتھ سے نہ کھو دینا چاہئے
جن سے وہ پیدا ہوئی۔ پس تمنا ہر علم کے جویوں کو عموماً اور اردو کے بہی خواہوں کو

خصوصاً یہ تمام ذرائع علیگڈھ اور بنارس کے صدر قومی کُتب خانوں سے بہم پہنچ سکیں -

مجھے خوف ہے میری تمہید بہت بڑھ گئی - انگلستان کے نامی - کیا اسلامی اور کیا ہندوانی علوم کی کتابوں کے مجموعوں کا مختصر حال میرا اپنا لکھا ہوا عرصہ ہوا علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے کالموں میں چھپ چکا ہے - اور موجودہ مضمون کی غایت یہی ہے کہ ایڈن برا کے مجموعہ کی چند نادر تصانیف میں سے کچھ نقل کر کے پیش کروں - سارے مجموعہ کی مرتبہ فہرست ترتیب دینے میں میرا ایک سال بسر ہوا - اب وُہ یونیورسٹی لائبریری کے پریس سے زیر طبع ہے اور شیخ عبدالقادر اور چند روز ہوئے عبداللہ المامون سہروردی جو برطانیہ کے طلبا میں عربی استعداد میں پیش پیش ہیں میری مجوزہ فہرست کے چند ورق کے مطالعہ اور بعض بے نظیر قلمی کتابوں کا معاینہ بھی کر گئے ہیں -

(۱) پہلی کتاب جس کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کیجاتی ہے "مراثی ہاشم علی" ہے - یہ دو جلدوں میں ہے - کل ورق ۳۴۷ اور ۹ × ۴½ انچ ہیں - اچھے نسخ تعلیق خط میں سنہ ۱۱۹۳ھ مطابق سنہ ۱۷۷۹ء میں نقل کی گئی - ہاشم علی کا حال ہندوستان کے شعراء کے تذکروں میں ضرور لکھا ہوگا - مجھے یہاں اسی قدر معلوم ہوسکا کہ یہ اُن شعراء میں سے ہے جس نے اُس زمانے کے رواج کے موافق فارسی میں نظم لکھی اور اچھی لکھی - اس کے سوا جس خصوصیت سے اس کا نام اب تک مشہور رہا اور کبھی بھی اس کو فراموش نہ ہونے دیگا - وُہ اُس کی اُردو نظم تھی - کیونکہ ولی اور حاتم سے بھی پہلے اُردو میں نظم لکھنے کی رسم سب سے اوّل اسی نے ڈالی - ہاشم نورالدین جہانگیر کے عہد حکومت میں برہان پور میں رہتا تھا اور ایک تاریخ سنہ ۱۰۴۶ ہجری مطابق سنہ ۱۶۳۶ عیسوی جو اس قلمی نسخہ کے بتیسویں ورق پر سرخ روشنائی سے کسی کرامت کے متعلق جو ہاشم کو محسوس ہوئی تھی لکھی ہوئی ہے - اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اس شاعر کی اُردو میں طبع آزمائی کا یہی زمانہ تھا - پہلا بند جو اس کتاب میں لکھا ہوا ہے یہ ہے :-

کوئی نہ تھا بیگانہ از ہند و خطا — ظلم تھا سب خویش سب اقوام کا
ختم ہے یو امتحان و یو بلا — ختم ہے جون حق ستین پیغام کا
تھا برادرزاد شفیع المذنبین — ظلم بیحد ہند جہان اقسام کا
زخم لاگا مرتضیٰ کے سر اوپر — کر پڑا جون آفتاب اس بام کا
فاطمہ کے درد دل کا کربیان — مین لکھوں نہیں مصلحت اتمام کا
زہر دے مارے حسن کوں مکر سیتی — سبز تھا وہ چہرۂ گل فام کا
کربلا مین تھے حسین ابن علی — آرزو مین نیر کے یک جام کا
ماتم آل نبی ہاشم علی — آج اک ہیکا اوسی ایام کا

ہماری کتاب کی دوسری جلد میں چند بند نہایت خوشخط ایک اور قدیم شاعر کے بھی لکھے ہوئے ہیں۔ جس کے متعلق صرف اسی قدر معلوم ہو سکا کہ اس کا تخلص "کاظم" تھا۔ اس کا بھی ایک بند یہاں نقل کیا جاتا ہے:-

ای نابکاران دین کا چھتر گرانا کہاں روا — سرور نبی کے آل کوں یو دوکہ مین لیانا کہاں روا
رکھنا امام دین کے تئین جنگل منے بے آب و نان — طفلاں کوں اون کے بیگنہ غم مین ولانا کہاں روا
خورشید برج دین کوں دنیا منے کرنا شہید — روز قیامت مین سیدی لیجانا کہاں روا
جن کو بٹھلاتے تھے نبی دوش مبارک پر مدام — نیزہ پر اون کے سر کے تئین کر کر پھرانا کہاں روا
وہ اصغر معصوم کوں سرور حسین کے ہاتھ پر — پیکان کے آب زہر سوں شربت پلانا کہاں روا

(۲) دوسرا دیوان ولی کا ہے۔ بہت بوسیدہ مگر خوشخط لکھا ہوا۔ اس شاعر سے تو سارے اردو دان واقف ہیں۔ ولی گجرات کا رہنے والا تھا لیکن اس کی زندگی کا بڑا حصہ دکن میں گذرا۔ عالمگیر اول کے زمانہ میں زندہ تھا۔ اس کا دیوان جو اردو کا سب سے پہلا دیوان تھا دہلی آیا تو آناً فاناً گلی کوچوں میں اس کے اشعار گائے جانے لگے۔
شیخ ظہیر الدین حاتم نے جو سنہ ۱۱۱۱ ہجری مطابق سنہ ۱۶۹۹ عیسوی دہلی میں پیدا ہوا۔

ولی کی رس میں سب سے اول اُردو میں نظم لکھنے کی وہاں ابتدا کی۔ پھر تو آنجی مضمون اور آبرو نے بھی تقلید کی اور اس طرح اُردو شاعری کا عام چرچا ہو گیا۔ موجودہ دیوان میں غزلیات ترجیع بند مخمسات اور رباعیات قلم بند ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے:۔

کیتا ہوں تیری نانو کون میں ورد زبان کا کیتا ہون تیری شکر کون عنوان بیان کا

ولی نے چند ریختہ اشعار ایک اور بیاض میں بھی لکھے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلی غزل اُس میں سے یہاں نقل کی جاتی ہے:۔

جس وقت ای سریجن تول بی حجاب ہوئیگا ہر ذرہ تجھ جھلک سون جون آفتاب ہوئیگا
مت جا چمن میں لالن بلبل پہ مت ستم کر گرمی سون تجھ نگہ کی گلگل گلاب ہوئیگا
مت آئینہ کون دکھلا اپنا جمال روشن تجھ مکھ کی آب دیکھی آئینہ آب ہوئیگا
نکلیگا وہ ستمگر تیغ اداکوں لے کر سینے کا عاشقاں کے اب فتح باب ہوئیگا
رکھتا ہے کیون جفا کون مجھ پر روا ای ظالم محشر میں تجھ سون میرا آخر حساب ہوئیگا
مجھکون ہوا ہے معلوم ای مست جام غفلی تیری انکھیان کی دیکھی عالم خراب ہوئیگا
ہاتف نے یون دیا ہے مجھکون ولی بشارت اُس کی گلی مین جا تون مطلب شتاب ہوئیگا

(۳) میر جعفر زٹلی نارنول کا ایک سید تھا۔ مرزا بیدل دہلوی کا ہم عصر۔ اُس نے عظم شاہ پسر اورنگ زیب کے عہد میں ایک شاہنامہ ریختہ میں لکھا تھا ۱۱۲۵ھ ہجری مطابق ۱۷۱۳ء میں اُس نے فرخ سیر کی تخت نشینی پر تمسخرانہ نظم لکھی جس کے جرم میں قتل کر دیا گیا۔ ع اسے روشنی طبع تو بر من بلا شدی۔

غزل میں اُستاد تھا۔ اُس کا مرثیہ عالمگیر کی وفات پر اس وقت میری نگہ کے سامنے ہے جس کے آخر کے چند ملوان جلوان شعر اسی سلسلہ میں لکھے ہوئے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:۔

عسل تلخی پزیرفت از فراقش نمک ترشی گرفت از نداقش
کہاں اب پائی ایسا شاہنشاہ مکمل اکمل و کامل دل آگاہ

رکت کی انجھوان جگ روتاہے — نہ میٹھی نیند کوئی سوتاہے
فلک سقاص بازی آنچنان کرد — زہر کس از غلل نقتل مکان کرد
صدای توپ و بندوق است ہرسو — بسر اسباب و صندوق است ہرسو
دوا دو ہر طرف بھاجر پڑی ہے — جدھر دیکھون تدھر چاچر پڑی ہے
کٹا کوٹ و لٹا لوٹ ہت ہرجا — چھٹا چھوٹ و پھٹ پھوٹ ہت ہرجا
بہر سو مار مارو دھار دھار ہت — اوچھل چپال و تبر خنجر کٹار ہت
ازان سو اعظم و زین سو معظم — جھرا جھر دھر دھرا دھر ہر دو باہم
بہ بینم تا خدا از کیست راضی — بخواند خطبہ بر نام کہ قاضی
بیا جعفر زبان را مختصر کن — ز دور مختلف در دل حذر کن

(۴) انوار سہیلی کا اُردو ترجمہ بھی قابلِ دید ہے۔ جس کا مترجم منشی محمد ابراہیم ابن ملک حسین خان ابن شیخ محمد بیجاپوری ہے۔ اس شخص کی اُردو تحریر سارے دکن میں مقبول تھی :-

کوا بولیا بول گئے ہیں زیر باد کے ملک کے ہاتھیوں کے جنگل میں ایک برس تھیون نین پڑیا حور بادل سون ایک بوند نین ٹپکا۔ ایسا وکال پڑگیا کہ گنٹے باولیاں سب سوکھ گئے۔ ہاتیان پیس سون لاچار ہوکر اپنے پادشاہ کے پاس قریب فریاد گئے بادشاہ بولدیا کہ پانی کے خاطر چوطرف دوڑو حور بہت ڈھونڈھو۔ ہاتیاں اوس ملک اوپسن چوپس اہیں دھونڈ وھنڈول کر ایک گنٹا نکالے کہ اوس کا ناون چند گتھا تھا اور بہت ڈونگا حور اوس میں لئی پانی تھا۔ بادشاہ اپنا لشکر لے کر اوس میں پانی پینے گیا۔ اوس کے آس پیس تھوڑے خرگوشان بستے تھے۔ ہاتیان کے کدھن سون وہ بہت ستائے جاتے تھے جس کے سر پہ پاؤں رکھتا اتے ہو بیچ فورا مرجاتا۔ فرد

ھلّو چلاتوں گھوڑے کورن میں اکہ ہوتے ہیں   سیساں ہزار گھوڑے کے سمتوں میں پائمال

(۵) بنگال میں میر آمن لطف دہلوی نے اٹھارویں صدی عیسوی کے شروع میں اوّل اوّل اُردو میں چند فارسی کتابوں کے ترجمے کئے اور وہاں اُردو کے رواج کا اسی کو موجد سمجھنا چاہئے۔ باغ و بہار ترجمۂ چار درویش وغیرہ کی اُردو آج کے محاورے سے بیشک خالی ہے پھر بھی زیادہ اجنبی نہیں۔ اِس لئے ذیل کی چند سطریں میر آمن کے کسی معتقد کی سمجھنی مناسب ہیں:۔

دو کبوتر ایک کو ندیہ کہ تلہ رہتے تہہ اور آپس کہ بیچ بیچ وراحت کہ شریک تہہ غیر کہ غبار سوں انہوں کہ خاطر کہ دامن پر گرد ایک اور زبان کی محنت ستی انہوں کہ دلوں موں درد ایک نہیں تھی اور دانہ اور پانی موں قناعت کر کہ گوشہ نشین درویشوں کہ مانند توکل کرتہ تہہ۔ الخ

(۶) یہ نمونہ طول کے خیال سے آخری ہے۔ جس کتاب میں سے نقل کیا اس کا کاتب اور مترجم ایک بنگلوری ہے:۔

"دو عورتاں ایک بچے کے واسطے لڑتے تھے۔ ہور شاہد دونو نہیں رکھتے تھے۔ اور دونو عورتاں لڑتے ہوئے قاضی کے پاس گئے۔ ہور انصاف چاہے۔ قاضی جلاد کو بلایا حکم کیا اس بچے کو دو ٹکڑے کر کر اس دونوں عورتوں کو دے۔ ایک عورت یہ بات سُن کرکے خاموش رہی پر دوسری گریہ ہور واویلا کرکے پوکاری جو واسطے خدا کے بچے کو دو ٹکڑے مت کر۔ گر ایسا ہی انصاف ہے۔ بچے کو چہتی نہیں۔ قاضی تب یقین سمجھا جو ماں بچے کی یہی ہے۔ بچا اسی عورت کو دیا ہور دوسری عورت کو لدی مار کرکے چلا دیا"۔

مشرّف الحق (از اڈنبرا)

میری تصنیف کا مقدمہ

ستر خدا کہ عارفِ سالک بکس نگفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

اہلِ قلم ہوں یا اہلِ سیف۔ جب انکی آنکھیں بند ہوگئیں اور موت کے فرشتے نے اُنکے قوا بیکار کر دیئے تو افرادِ انسانی میں بہت ایسے خدا کے بندے پیدا ہو گئے جنہوں نے اُن کے کارہائے نمایاں کو ضائع نہ جانے دیا اور اپنے پر ہنر ہاتھوں کو اُن کے کمالوں کی اشاعت میں مصروف کر دیا تاکہ پیچھے آنے والی نسلوں میں مرے ہوئے بزرگانِ قوم کی حیرت انگیز ترقیاں پوشیدہ نہ رہیں۔

یہ طریقہ مغربی تعلیم یافتوں میں عموماً اور ایشیائی اہلِ قلم میں خصوصاً پایا جاتا ہے اور اس بنیاد پر یورپ کے کاملوں کی فہرست ایشیائی اہلِ کمال سے زیادہ لمبی چوڑی نظر آتی ہے۔ مغرب میں کسی کامل الفن کی سوانح عمری لکھنے کا طریقہ موجودہ قوم کی ترقی کا سبب سمجھا جاتا ہے اور ایشیائی شاعر اپنے ہمعصر اہلِ کمال کی موت پر فقط اوپرے افسوس کرنے کے بعد بالکل خاموش ہو جاتے ہیں۔

جس طرح دریا کی پے در پے آنیوالی موجیں ایک دوسرے کا نشان مٹاتی چلی جاتی ہیں اُسی طرح انقلابِ زمانہ مشاہیرِ عالم کا نام و نشاں مٹا رہا ہے۔ ہمارے ملک کی کم ہمتی اور کوتاہ قلمی کے سبب سے کسی کامل کی تاریخ مکمل دستیاب نہیں ہو سکتی جو متوفی کی حالت پر پوری روشنی ڈال سکے۔ بزرگانِ قوم اور ماہرانِ علوم و فنون کے فنا ہو جانے پر موجودہ نسل اُن کے بقائے دوام کا سلسلہ توڑ دیتی ہے اُس لگاؤ میں جبکہ مر جانے والے کے غمِ فراق کا اثر تمام اندرونی قوتوں کو جنبش دے رہا ہو۔ قومی ہمدردی کے جذبات کامل سے کام لیا جائے تو تاریخ کے صفحاتِ زریں پر مشاہیر ہند کے

نام نامی آفتاب محشر کی طرح جگمگاتے نظر آئیں اور وہ حیرت انگیز ترقیاں جو ابقائے عناصر تک محدود رہی ہیں کاغذی دنیا کی آبادی میں تا ابد الآباد محفوظ رہ سکتی ہیں۔ اہل قلم کی کوشش سے واقعات ماضیہ کی تجدید کچھ دشوار بات نہیں۔ حادثات اور سوانح کی یادگار قائم رکھنا اک ایسا ضروری مسئلہ خیال کیا گیا ہے کہ جب فن کتابت مروج نہ تھا تو سنگین اور قابل قدر واقعات دماغ میں محفوظ رکھے جاتے تھے جب قوت حافظہ بھی اس کی حفاظت کے لئے ناکافی ٹھہری تو فرضی نقوش کی ایک ترکیب مصری یا چینیوں نے اختراع کی جس کے ادائے مطالب کے لئے مختلف اشکال سے مدد لی جانے لگی۔ اب طریق ابجد نے فن کتابت کو بہت آسان کر دیا۔ ہمارے وقت میں کچھ مشکل نہیں کہ ہم کسی واقعہ کا خاکہ قوت حافظہ کی مدد سے اپنے دماغ میں فوراً اتار لیں اور قلم کی زبردست قوت سے اس میں تشریح و توضیح کا رنگ بھر دیں۔ اسباب و آلات کے موجود ہونے پر بھی ہماری کاہلی اور جاہل انگاری کچھ نہیں کرنے دیتی۔ یہ ہماری خواب غفلت میں سونے والی قوم کے لئے اک قابل افسوس بات ہے۔

دنیا میں اس وقت جس قدر مشہور و معروف آثار و اذکار ہیں ان سب کو شرف تاریخ کے صفحوں سے ملا ہے اگر مورخ خاموش رہتے اور قلم اپنی زبان بند رکھتا تو قصر بیضا طاق کسریٰ دیوار خطا۔ آثار مصر کے عجائبات سے کوئی واقف نہ ہوتا رفتار زمانہ کتاب عالم کے ورق الٹ رہی ہے مگر تاریخ کی ورق گردانی سے مٹے ہوئے نقش و نگاریاں روشن ہو جاتے ہیں جس طرح فصل بہار کے روح پرور جھونکے سبزہ افسردہ اور گلہائے پژمردہ کو شاداب کر دیتے ہیں۔

والمیک۔ کالیداس شیکسپیر۔ رینالڈس۔ ملٹن۔ بیکن۔ لٹن وغیرہ کے کمالوں کی مجسم تصویریں تاریخ ہی کے آئینہ میں جلوہ افروز ہیں۔ رستم جس کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ فقط حکیم ابوالقاسم کے زور قلم میں ایک اعجاز تھی یا فوق الاقتدار بشری قوت کا مالک بن گیا جو آجتک شعرا کے قصائد مدحیہ میں مشبہ بہ کا کام دے رہا ہے۔ مرجانے والوں کے کمالوں پر گم نامی کا پردہ نہ ڈالو۔ ورنہ امتداد زمانہ انکے جوہروں کو خاک میں ملا دیگا۔

یہ بات نہیں ہے کہ مغرب ہی کی سرزمین کو قدرت کی جانب سے یہ شرف بخشا گیا ہے کہ یہاں خاک سے پیدا ہونے والے اپنے مرکزِ اصلی کی جانب رجوع ہونے کے بعد اپنے افسانے آبِ زر سے لکھنے کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے مردم خیز خطہ کو بھی یہ فخر حاصل ہے۔ اس خاک پاک سے بڑے بڑے مشاہیرِ عالم پیدا ہو کر آسمانِ علم و کمال کے آفتاب بنکر چمکے اور آج وہی خاک اُن کی آرامگاہ ہے۔ اس خاک میں وہ بیش بہا جواہر چھپے ہوئے ہیں جو سلاطینِ عظیم الشان کے تاجِ سلطنت کے زیب و زینت تھے۔ وہ اس گلزارِ عالم میں نسیمِ سحر کے جانفزا جھونکوں کی طرح پژمردہ دلوں کی کلیاں شگفتہ کر گئے اب وہ خاموش ہیں اور قومِ اسلام کے طبقۂ آخر کے اہلِ قلم نے انکی دوامی ہستی کمال پر گمنامی کا پردہ ڈال دیا ہے۔ محنت کش مزدوروں کے پھاوڑے کی ہر ضرب کے ساتھ ہندوستان کے پرانے کھنڈروں سے کتابِ تاریخ کے بوسیدہ ورق نکل آتے ہیں جو خاک میں مل جانے والے مکین و مکان کا پتہ بتا رہے ہیں۔ رنگین خیال زندہ دلوں کی کوئی انجمن ایسی نہ ہوگی جسکو شہرِ خموشاں کے باشندوں پر رشک نہ آتا ہو وہ خاموش ہیں مگر ان کی خاموشی میں رنگا رنگ ترانہ سنجیوں کا مزا ہے۔ اُن کے قوا آج معطل ہیں مگر ان کی گذشتہ پُرحیرت ترقیاں ابتک اپنا کام کر رہی ہیں۔ سطحِ زمین سے چند ہاتھ نیچے ایسے بہت سے خزانے ہیں جو اپنے فیضانِ سخن سے دُنیا کو مالا مال کر گئے۔ اُن دفینوں پر تاریخِ وفات کی مُہریں لگی ہیں۔ علم و ہنر کی وسیع دُنیا میں انکی تصانیف کی زبردست بنیادیں ایشیا سے یورپ تک روشنی پھیلا رہی ہیں مقدس مزاروں کے سونے والوں پر خدا کی رحمت سایہ گستر ہے اور انکی یاد ہمارے دل میں ہمارے جگر میں خون کی طرح دورہ کر رہی ہے وہ اس قابل ہیں کہ انکو یاد رکھو اور ان کی یاد رکھنے کے لیے بہترین طریقِ عمل یہ ہے کہ اُن کے واقعاتِ زندگی اور معلوماتِ علمی کو کتابی دُنیا کی سیرگاہ بنادو کہ ہمارے بعد آنے والی نسلیں بھی فائدہ اُٹھائیں۔ مخلوقاتِ عالم میں شاعر ایک خاص ہستی ہے اور اس کا دماغ رنگا رنگ خیالات کا خزانہ ہے۔ وہ خدا کے زمین و آسمان کا نکتہ چیں

شاعری کی دُنیا میں کسی چیز کا محتاج نہیں اور نہ اُس کا مستغنی دل کائنات کی بے بہا اجناس لٹ نے پر افسوس کرتا ہے۔ اجرامِ فلکی اس کی مانع نہیں اور موالیدِ ثلثہ اس کا مصرف نظامِ عالم اس کے قلم کی ایک گردش۔ وُہ اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کو نہ دولتمندوں کا محتاج ہے نہ بادشاہوں کا منت کش۔ اس کے فیاض ہاتھو ہمیشہ علم و ہنر کا خزانہ لٹانے کو تیار رہتے ہیں۔ بادشاہانِ جلیل القدر کے درباروں کی عظمت و جبروت تو اک خاص عہد تک محدود رہتی ہے۔ مگر یہ اقلیم کاغذی کے شہنشاہ اپنی زبردست بنیادِ علم کو تا قیامِ قیامت یادگار چھوڑ جاتے ہیں۔ انہیں کے قلم کی اک ادنیٰ جنبش نے کشورستانیوں کے جذبات بادشاہوں کے دلوں میں پیدا کر دیئے جس سے وہ عظیم الشان مملکت کے وارث ہو گئے۔

(ویسٹ منسٹر اے بی) جسکی چپہ چپہ زمین پر شاہانِ لنڈن کی آرامگاہیں بنی ہیں اور اس خاموش آبادی میں بڑے بڑے اہلِ کمال کا مجمع ہے۔ ایک عبرت خیز نظارہ ہے کہیں حصہ میں سلاطین گردنکش و دشمن کُش کی انجمن ہے اور کہیں تلوار کے وُہ دھنی ملے ہیں جن کے معرکتہ الآرا منچلوں نے روم و شام کے عرصہ مصاف پر لہو کے دریا بہا دیئے مگر سب سے زیادہ قابلِ تعظیم و اہلِ قلم ہیں جنہوں نے اپنے علوم کی روشنی سے موجوداتِ عالم کی ماہیت پر ایسی غائر نظر ڈالی کہ جس سے فلسفہ قدرت کے اہم مسائل حل ہو گئے۔ اس لئے شعرا اور مُصنفین کے مقدس مزار کمال ادب کی نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہیں۔ ان روشن خیال عالی دماغ شعرا نے کتابِ عالم کا ترجمہ کر کے ہماری نظروں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ جس میں ہم آسمان و زمین کے نوادر کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ بادشاہوں کی قبر پر تو کوئی پھول چڑھانے نہیں آتا۔ مگر (چارلس ڈکنز) کی قبر پر فصلِ بہار کے پھولوں کا ایسا ڈھیر دکھائی دیتا ہے جس کی خوشبو شہرِ خموشاں کے سیر کرنے والوں کا دماغ معطر کر دیتی ہے۔ اہلِ کمال کے لئے یہ ہر دل عزیزی خداداد ہے۔ ڈکنز۔ ٹینیسن۔ مکالے اپنی شاعری کی قوت اعجازی سے ہنستے بولتے نظر آتے ہیں۔ اور بہت سے سلاطین ایسے ہیں جنکی شہرتِ ملک رانی بھی اُن کے

اجسامِ مُردہ کی طرح اس قبرستان کی چار دیواری میں دفن ہے۔ ملکہ الزبتھ قبرستان کے جس گوشہ میں سو رہی ہے اُسی کے قریب ایڈیسن بھی خوابِ راحت میں ہے۔ الزبتھ کا اقبال لوحِ قبر سے نمایاں ہو کر نہ ہو مگر ایڈیسن کے تعویذِ مزار سے آج بھی علمی شعاعیں نکل نکل کر مغرب سے مشرق تک پھیل رہی ہیں۔ نادانوں کا خیال ہے کہ شاعری ایک فعلِ عبث اور سعی لاحاصل ہے شاید وہ حسن و عشق کے بے سروپا داستانوں کو شاعری سمجھے ہوئے ہیں۔ مگر شاعری کا بلند ترین پایہ (جس کا ذکر انشاء اللہ اس کتاب میں کسی موقع پر کیا جائیگا) دریافت کرتے ہیں اُن کی حد عقل جامد ہے۔ شاعری اظہارِ علوم و توسیعِ خیالات کا آلہ ہے۔ شاعری سے طبیعتِ انسانی کو تعلق خاص ہے اور مسائلِ مختلفہ کو نظم میں قید کرنے میں ذہن کو ایک خاص لذت ملتی ہے اور وہی لذت قوتِ متخیلہ کو متحرک کرتی ہے اور یہی حرکت قوتِ متخیلہ مظاہرِ قدرتی کو نظم کے سانچے میں ڈھالتی ہے اور یہی نظم انسانی شہرت کا ذریعہ ہے اور یہی شہرت اُسکی بقائے دوام کا باعث۔ دُنیا میں دائمی زندگی کون پسند نہیں کرتا۔ بقائے عنصر کے ساتھ بقائے حیات ایک وقت محدود ہے مگر شہرتِ کمال جو کوئی مادی قوت نہیں اُس کو فرشتۂ موت کا جابرانہ عمل کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ؎

زندہ است نامِ فرخِ نوشیرواں بعدل گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نماند

بناءً علیہ ایک زمانہ میں میرے پاس کثیر التعداد خطوط آئے کہ میں میر انیس مرحوم کی سوانح عمری قلمبند کروں۔ مگر اس کام کی ہیبت سے نتیجہ ناکامیابی مرتب ہوتا تھا اِس لئے کبھی حوصلہ نہ ہوا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ افسانہ نگاری اور تاریخ نویسی میں فرق بیّن ہے۔ تذکرہ یا سوانح عمری کا مابہ الامتیاز راستی اور تکمیلِ تحقیق پر مبنی ہے۔ قصہ یا ناول کا معیار مبالغہ اور صنائعِ شاعری ہے۔ واقعات اصلی کے بیان میں رنگینیِ خیالات اور شاعرانہ بلند پروازیوں کو دخل نہیں۔ نہ تشبیہات و استعارات کے جواہر کام آسکتے ہیں۔ نہ نصاب و لغات سے اقتباسِ مطالب کیا جا سکتا ہے۔ میری زندگی کی خوشنما راتیں اس مشکل مسئلہ کی فکر میں گذرنے لگیں۔ مگر وہ تمام خیالات جو رات بھر فضائے دماغ

میں چکر لگاتے تھے۔ صبح کو اک خواب پریشان کی طرح محو ہو جایا کرتے تھے۔ آخر ایک مدت کے بعد ذہن منتقل ہوا کہ ابھی تک وہ آنکھیں کھلی ہیں جنہوں نے سید مرحوم کا دور دیکھا ہے اور وہ کان قوتِ سامعت سے خالی نہیں جن میں اُس بلبلِ ہندوستان کے نغمۂ شیریں بھرے پڑے ہیں۔

وہ سلسلۂ ارادت و عقیدت جو مجھے اس خاندان سے خاص طور پر ہے وہ کسی قدر باعثِ سکونِ خاطر ہوا اور میرے اس خیال میں کامیابی کی ایک ضعیف سی جھلک دکھائی دی کہ اس خاندانِ بزرگ کے اعلیٰ ممبروں سے اظہارِ مدعا کروں اور ایسا ہی کیا۔

اخی المعظم جناب میر علی محمد صاحب عارف کی خدمت میں حاضر ہو کر التجا کی۔ مخدوم و معظم جناب بھائی صاحب قبلہ کی جناب میں عرضِ حال کیا۔ دونوں صاحبوں نے کمالِ اخلاق سے میرے حقوقِ ارادت پر نظر کر کے مدد دینے کا وعدہ فرمایا۔ مگر بڑے افسوس سے مجھے ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ وہ کوئی وعدہ سچا نہ ہوا اور بد نصیبی حسن کو دونوں دروازوں سے جواب صاف مل گیا۔ میرے دونوں مخدوم اپنے عنایت ناموں میں اس معاملہ کے متعلق جو کچھ ارقام فرماتے ہیں۔ اس کا انتخاب ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

(جناب عارف کے محبت نامہ کا انتخاب)

۲۹ - جمادی الآخری روز جمعہ

اعز الاخوان سلمکم الرحمٰن

بعد تبلیغ بالشان۔ عالی خاطر کلفت ماثر ہو۔ اس وقت آپ کا بنارس والا خط اور حیدرآباد والا دونوں خط پیشِ نظر ہیں۔ آپ کی شکایت میرے سر آنکھوں پر کیونکہ سچی ہے مگر افسوس کہ آپ میری کاہلی اور سستی کے ذرا بھی معتقد نہیں۔ ایک تو میں درحقیقت کاہل اور سست اور بلغمی واقع ہوا ہوں اور اس پر طرہ کثرتِ مشاغل۔ ۲۲ پنجشنبہ کو آپکا بھتیجا پیدا ہوا جس کو آج آٹھواں دن ہے۔ آپ کو ماشاءاللہ بزرگوں کی وجہ سے امورِ خانگی میں اشتغال نہیں رہا۔ آپ کو میرے افکار کی کیا قدر ہے۔ آپ ہی فرمائیے کہ اس ماہ مبارک

میں فرصت کہاں سے لاؤں۔ آپ کی فرمائش کی انشاءاللہ ضرور تعمیل کرونگا۔ [illegible] کیجیے اور غصہ نہ فرمائیے۔

جاہل المعارف عارف عفی عنہ

انتخاب از نامہ مخدومی جناب رشید صاحب مدظلہ

میں کئی بار جناب والدہ[۱] معظمہ کے پاس قلم دوات لیکر بیٹھا مگر وہ کچھ نہ لکھو سکیں۔ مجبور ہوگیا۔ میں ابتدائی حالات تو کیا جانوں۔ ہاں جس قدر دیکھا ہے اور یاد آسکتا ہے وہ ممکن ہے۔

اس کے بعد کچھ حالات تحریر فرماتے ہیں مگر وہ ایسے مشہور ہیں جو اس سے پہلے میرے نوٹ بک میں موجود ہیں۔ خدا آگاہ ہے کہ فقیر جس ان تحریروں سے ان حضرات کی شرافت نفس پر کوئی الزام نہیں لگاتا۔ مگر اس تحقیقات کے متعلق میری حسرتوں میں یہ بڑی دل خوش کن امید تھی جس کا خون ہوگیا۔ پھر بھی میں اس دشوار گذار راہ کی اس منزل تک پہنچ گیا تھا جہاں سے پلٹنا محال تھا۔ خدا کے فضل سے میرے ارادوں میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی اور نہ میرے جذبات میں کوئی رکاو واقع ہوا۔ جب میں اپنی ملازمت کے ذریعہ سے دنیا کے ہر گوشہ میں سفر کر رہا تھا تو سب سے پہلے میرا فرض یہ تھا کہ میں اس تاریخی تحقیقات کے ذرائع وسیع کروں چنانچہ اب تک میں اپنی کوشش میں مقصر نہیں۔ جہانتک اس کام میں اہمیت پیدا ہورہی ہے اتنا ہی مجھے انہماک پیدا ہوتا جاتا ہے اور یہ ناکامیاں بڑی دلچسپ ہیں۔ جن پر میری زندگی کی آخری خوشی کا مدار ہے۔ مجھے اسوقت بھی اک گونہ مسرت حاصل ہے کہ اس تحقیق کے متعلق میری نوٹ بک کے بہت سے ورق آب زر سے لکھنے کے قابل ہو چکے۔

میں یہ تو نہیں بتاسکتا کہ میری زندگی کا کونسا وہ بیش قیمت وقت ہوگا۔ جب میں اپنی

۱؎ یعنی میر انیس صاحب کی بڑی صاحبزادی جو اسوقت بزرگ خاندان ہیں ۱۲

اس محنت پر فخر کرونگا۔ ہاں یہ غرور ہے کہ میرے اس ارادے کو سوائے موت کے اور کوئی انقلاب انشاء اللہ توڑ سکے گا۔

آخر دنیا پر میں اس طلسم کا راز ظاہر کر دونگا اور میرا دامن تحسین و آفرین کے پھولوں سے بھرا ہوا ہوگا۔ اس مقدمۂ تصنیف کو اک ادبی رسالہ میں شائع کرنے سے اسوقت صرف یہی غرض ہے کہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں میری آواز پہنچ جائے۔ شائد کوئی خدا کا بندہ میرا ہاتھ بٹانے میں مدد دے۔ یعنی سید صاحب مرحوم کے متعلق جو کچھ واقفیت ہو اس سے فقیر احسن کو بذریعہ عنایت نامہ آگاہی بخشی جائے۔ میرا پتہ دفتر مخزن سے ہمیشہ معلوم ہوتا رہے گا۔ والسلام

قضا کیوں ہجر میں آتی نہیں گر آنیوالی ہے — کہ اب ٹوٹے ہوئے دل کی نہایت خستہ حالی ہے

اثر کیونکر رہے کچھ دیر ناصح کی نصیحت کا — مزاج اپنا ہے رندانہ طبیعت لاابالی ہے

مری پھولوں کی محفل میں وہ اپنے دل میں ہنستی ہیں — مگر ظاہر میں صورت دیوانوں کی بنا لی ہے

قلق یہ ہے کہ نازک پاؤں دکھ جائیں نہ قاتل کے — وگرنہ فخر کی جا مجھکو دل کی پائمالی ہے

بہار اس گلبدن کو ہر روش ہر نظر دیتی ہے — دم سیر چمن ہر شاخ گل پھولوں کی ڈالی ہے

اگر ساقی اجازت دے تو اشک سرخ سے بھر دیں — بھرے بیٹھے ہیں ہم محفل میں جب سے جام خالی ہے

غضب کا ہے قیامت کا ہے یہ چلتا ہوا جادو — کیا دیوانہ اس کو تم نے جس پر آنکھ ڈالی ہے

اگر چاہا خدا نے گھر کرینگے غیر کے دل میں — نئی اک راہ ہم نے ان سے ملنے کی نکالی ہے

یہ کس نے اپنے پیارے ناخنوں سے چٹکیاں لی ہیں — کہ دل میں نشان زخم باقی ہے ہلالی ہے

بنی ہے مدتوں میں یوں شہید ناز کی تربت — کہ ہر قاتل نے چٹکی چٹکی اس پر خاک ڈالی ہے

جلا رکھو چراغ اے آہ دل سے اپنے گھر میں تم
اندھیرا ہو چلا شام جدائی آنے والی ہے

ہماری زبان کا اُردو لٹریچر

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

کریٹیسزم (تنقید) علم و ہنر کی ترقی کے لئے نہایت ضروری ہے بشرطیکہ وہ نیک نیتی سے عدل و انصاف کے ساتھ مفید انجام ہو۔ نہ یہ کہ اس سے بدنفسی و کم ظرفی یا کج فہمی ظاہر ہو۔ نوجوان جو کچھ کر رہے ہیں اس کے کرنے کے لئے دو وجہوں سے مجبور ہیں۔ اول جوانی دیوانی تو مشہور عالم ہے۔ دوم یہ امر مسلم ہے کہ شاعری و موسیقی و طبابت کے فنون ایسے ہیں کہ جو کوئی ان میں مہارت رکھتا ہے اسکو ہمچو من دیگرے نیست کا سودا دماغ میں ضرور ہوتا ہے۔

ادب اور علم کی ایک سیڑھی ہے۔ مگر دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے اس لئے کہ ادب سے آدمی مغرور ہوتا ہے اور علم سے منکسر۔ ادب پیشہ کے لئے بہت اچھا عصا ہے مگر بُری شمشیر۔

ہر ذی فہم کی یہ تمنا ہونی چاہئے کہ کاش ہمارے نوجوانوں میں ایسی اصلی اور سچی لیاقت پیدا ہو کہ وہ ہم سے برتر ہوں اور بزرگوں کی خطاؤں اور غلطیوں کو بتلا کے فائدہ عام خلقت کو پہنچائیں اور یہ نہ ہو جو اب ہو رہا ہے کہ دماغ اپنا غلطیوں سے بھرا ہوا ہے۔ جس کے سبب سے وہ صحیح کو غلط بتلا رہا ہے۔ سه دلا تا نیاری بزرگی بدست ۔ بجائے بزرگاں نباید نشست
بزرگ بنکر بزرگوں کی خطائیں بتاؤ۔ یہ ہماری عین تمنا ہے۔

پہلے زمانہ میں اس نیم مہذب و نیم وحشی ملک میں مشرقی خیالات کے نظم و نثر اپنا کامل اثر رکھتے تھے مگر اب زمانہ بدل رہا ہے سررشتہ تعلیم کا علم ادب و مغربی خیالات کی تعلیم یہ دونوں تہذیب و شائستگی کو بتلا رہے ہیں۔ اس لئے اس زمانہ میں نیم مہذب زمانہ کے علم ادب کو جو پہلے ہی سے ضرورت سے زیادہ موجود ہے۔ اضافہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ کسی دوالیہ کی کوٹھی میں بہی کھاتوں کی کتابوں کا زیادہ کرنا۔ یہ رنگ آمیزی اچھی نہیں کہ ایک ہی رنگ پر اس کے

نہیں چڑھاتے چلے جاؤ - یہ کارگری نہیں کہ ایک ہی دھات پر دھات چڑھائی جائے -
جیسے کہ ہر اقلیم کے ساتھ بعض امراض کی خصوصیت ہوتی ہے - ایسی ہی شاعری کے ہر زمانہ
میں تعلّی و تشخص و حسد کی بیماریاں لگی ہوئی ہیں - مگر اس زمانہ میں اس کو ایک نیا مرض یہ
شروع ہوا ہے کہ شاعروں کے قدرشناس جو پہلے سلاطین و امرا ہوئے وہ نہیں رہے - یہ
اتفاقی بات ہو کہ داغ کو سرکار نظام قدرشناس مل گئے جس نے اسکو امیر بنا دیا - بلی کے بھاگوں
چھینکا ٹوٹا - اب شاعروں کو عوام کے روبرو دست گدائی دراز کرنا پڑتا ہے جس سے کوئی
فراغت نہیں حاصل ہوتی - ایک شاعر بھی نہیں جو اپنی تصنیفات کو چھپا کر بیچے اور فارغ البال
ہو جائے -

(ساتواں) قصص و ناٹک کا علم ادب اردو زبان و ہندی بھاشا میں

سب سے زیادہ قصص کا علم ادب پنا سر پریس سے دو دوارہ ہے اور پریسین اور کلیوں کے ہاتھوں
کو تھکا رہا ہے - چھاپے کے دبیز پتھروں سے اپنے اوراق کی جبہ سائی کرا کے انکو ضایع کر
رہا ہے - کاتبوں کے ہاتھوں سے فولادی قلموں کو کاپیوں پر گھسوا کے نکما کر رہا ہے -
کاغذ پر اپنے پاؤں پھیلائے کاغذیوں اور کاغذ کی ملوں کو نہال کر رہا ہے - کسی کتب فروش
کی دوکان کو چلنے نہیں دیتا جب تک اس میں انبار نہ لگے - بعض کتاب فروش ان قصص کی
کتابوں کو الماریوں میں بند کر کے نہیں رکھتے - بلکہ نمائش کے لئے ان کی قطاریں بنا کے
نگینوں میں لٹکاتے ہیں - جن پر ان کے رنگ برنگ گلکار خوشخط ٹائیٹل پیج بڑی بہار دکھاتے
ہیں - ان قصص کی کتابوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ جسکو اعداد میں بتلانے کے لئے چند
نمبروں کے بعد کوئی ہندسہ لکھنا پڑتا ہے - ان کے مصنفوں کے نام اتنے ہیں کہ اگر میں
لکھوں تو میرا بوڑھا دست ناتواں دوات میں سے قلم کے ڈوبے لیتے لیتے تھک جائے -
پہلے تو ایک ہی بڑا قصہ نوطرز مرصع زبان میں شاہ عالم شہنشاہ دہلی نے تصنیف کیا تھا جسکی
زبان ایسی سلیس اور فصیح تھی جیسی کہ چار درویش کی ہے - کلام الملوک ملوک الکلام - بحر شاہ شاہ

سبخن مست۔ اسکے نسخے نہایت خوشخط باتصویر دلی کے کتب خانوں میں تھے وہ غدر میں تلف ہو گئے۔ اب تو ایسے بہت بڑے بڑے قصے اردو زبان میں موجود ہیں۔ الف لیلا کی امیر حمزہ کی داستان کی اور بوستانِ خیال کی کل جلدوں کا ترجمہ اردو میں ہو گیا ہے جو جناب مرحوم نے جو بوستانِ خیال کا ترجمہ کیا تھا اُس کی کل جلدوں کی قیمت سو روپیہ تھی۔ ایسی گراں قیمت تھوڑی ہی کتابوں کی ہوتی ہے۔ شوقین اس قیمت پر بھی شوق سے خریدتے تھے اور جانتے تھے کہ بہت ارزاں ہاتھ لگی ہے۔ اور بہت سے چھوٹے چھوٹے فارسی قصے جیسے کہ یوسف زلیخا۔ لیلی مجنوں۔ شیریں خسرو وغیرہ بھی اردو نظم و نثر میں ترجمہ ہو گئے ہیں۔

سرکاری سررشتہ تعلیم نے بھی بعض انگریزی ناول قصوں کا اردو ہندی میں ترجمہ کیا جیسے کہ روبنسن کروسو۔ راسلاس۔ سینڈ فورڈ مارٹن۔ وکر آف ویک فیلڈ۔ روجرس۔ اور بعض اور قصص۔ اب کئی سالوں سے انگریزی قصوں کے ترجموں کی وہ کثرت ہوئی ہے کہ لنڈن میں بعض کتب فروش کمپنیوں میکملن وغیرہ کو یہ لالچ آیا کہ ان قصص کے ترجموں سے ہندوستان میں ہم فائدہ اُٹھانے کے مستحق ہیں۔ اس لئے اُنہوں نے کوشش کی کہ ہندوستان میں حقِ ترجمہ قائم ہو۔ جس میں وہ کامیاب نہ ہوئیں۔ یہ زمانہ ہی ایسا ہے کہ مہذب قوموں میں بھی قصہ خوانی کا شوق روز افزوں ہے۔ انگلستان میں جو کتابیں چھپتی ہیں اُن میں ۹۶ فیصدی قصص کی کتابیں ہوتی ہیں۔ یعنی جتنی اور علوم و فنون کی کتابیں چھپتی ہیں ان سے وہ دو چند ہوتی ہیں۔ ان قصوں میں پولیٹکل سوشیل و موریل و منٹل۔ کل مضامین ہوتے ہیں انہیں سے ابتک ایک قصہ بھی ہماری زبان میں ترجمہ نہیں ہوا۔ مگر رے نلڈ کی مسٹریز آف لنڈن کا ترجمہ ہوا ہے جس کا چھپنا انگلینڈ میں اس کے فحش ہونے کے سبب سے ممنوع تھا اس کا ایک ترجمہ چھپ کر شائع ہو چکا تھا کہ دُوسرا چھپنا شروع ہوا۔ جس کی ممانعت از روئے قانون ہوئی۔ مگر اس کے نمونے پر ہندوستان کے بعض بڑے بڑے شہروں کی مسٹریز (اسرار) چھپے۔ جن میں فحش اس سے بھی زیادہ تھا۔ اب انگریزی ناول بہت ترجمہ ہوتے

ہیں اور اُن سے زیادہ اچھے نمونے پہلی قصے لکھے جاتے ہیں۔ اُن کے سامنے اب
پرانے قصوں فسانۂ عجائب۔ گُل بکاؤلی۔ قصہ حاتم طائی اور سپاہی زادہ۔ نورتن۔ نوطرز مرصع
طوطا کہانی۔ بیتال پچیسی۔ سنگھاسن بتیسی۔ بدرارت وغیرہ کی قدر و منزلت کم ہوگئی ہے۔
میر حسن کی مثنوی کے چھپنے کی گورنمنٹ نے فحش ہونے کے سبب سے ممانعت کردی
ہے گو وہ اپنے اشعار کو اور قصص میں نظیر دکھاتے نہیں رکھتی۔ بعض قصہ طرازوں اور
افسانہ پردازوں کی تصنیفات کا حجم بوستانِ خیال اور امیر حمزہ کی داستان سے بڑھ گیا ہے۔

ناٹک میں سنسکرت میں سکنتلا دنیا کی مشہور کتابوں میں سے ایک ہے۔ اسکا مصنف
ہندوانی میں شیکسپیر کا ہمسر ہوا۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف بحر العلوم
تھا۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ راجہ نے سارتھی سے کہا کہ رتھ کو تیز چلاؤ تو اس نے ایسا تیز چلایا کہ
پچھلی چیزیں بڑی سے چھوٹی اور آگے کی چیزیں چھوٹی سے بڑی دکھائی دینے لگیں۔
اور گھوڑوں کی کلغیاں ساکن نظر آنے لگیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف علم حرکت
کے اس اصول سے واقف تھا کہ جب حرکت نہایت تیز ہوتی ہے تو وہ محسوس نہیں ہوتی جیسی کہ
لٹو کے بُت بننے کی حالت میں تم دیکھتے ہو۔ اس کا ترجمہ ہماری زبان میں ہوگیا ہے۔
شیکسپیر کے چند ڈرامے پارسیوں نے اپنے تھیٹر کے لئے اردو میں ترجمہ کر لئے ہیں اور
بہت سے ناٹک اردو زبان میں نئے بنا لئے ہیں۔ اس قسم کی کتابوں کی افراط ہے۔

علم ادب کے اصول و فروع

میں نے جو سب سے پہلے علم ادب کے اصول و فروع بیان کئے تھے اُنکی نسبت لکھا تھا کہ
سب کے بعد میں ان کا مختصر بیان لکھوں گا۔ سو اب لکھتا ہوں کہ ہماری زبان کی علم لغت کی
کتابیں مطول و مختصر اتنی موجود ہیں کہ جو الفاظ کے معانی دیکھنے کے لئے کافی ہیں۔ بعض بڑی
بڑی عربی و فارسی لغات کی کتابیں اُردو میں ترجمہ ہوگئی ہیں جیسے کہ منتہی الارب اور غیاث اللغات

بعض ہندی بھاشا کی لغت کی کتابیں بھی موجود ہیں۔ لغت دانی کے لئے علمِ لغت کا سرمایہ ہماری
زبان میں کافی ہے۔ علمِ صرف و نحو کی پچاس ساٹھ کتابیں موجود ہیں اور ہندی بھاشا میں بھی
کئی کتابیں ہیں۔ اُردو کی صرف و نحو کی کتابوں پر اعتراض کرنا بیجا ہے کہ ان میں عربی زبان کی
صرف و نحو کا تتبع کیا جاتا ہے۔ یہ تتبع ایسی حالت میں ضروری تھا کہ اردو صرف و نحو کا کوئی نمونہ موجود
نہ تھا۔ مگر ان اُردو ہندی کی صرف نحو کی کتابوں میں ہماری زبان کا کوئی قاعدہ فروگذاشت
نہیں کیا گیا۔ اب معترضین جو کوئی خود قواعد صرف و نحو لکھینگے۔ انہی کتابوں کی ترتیب
سے اپنی کتاب بنائینگے۔ اور وہ دعویٰ یہ کرینگے کہ صرف ہم نے اُردو کی صرف نحو کے
قواعد لکھے ہیں۔ گو کوئی اب تک قاعدہ یا کوئی نئی بات اضافہ نہ کر سکینگے۔ علم معانی و بیان
عروض و قافیہ کی بھی متعدد کتابیں موجود ہیں۔ حدائق البلاغت کا ترجمہ مولوی صہبائی مرحوم کا
ان سب کتابوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اسی کی خوشہ چینی سے اور کتابیں لکھی گئی ہیں۔ رسم الخط میں
بھی کئی رسالے ہیں۔ تواریخ میں تو بہت سی مستند کتابیں عربی فارسی سے اُردو میں ترجمہ
ہو گئی ہیں۔ تاریخ فرشتہ۔ سیر المتاخرین۔ تاریخ بدایونی وغیرہ بہت سی تاریخیں۔

جیسے کہ سوسائٹی کی یعنی معاشرت و تمدن کی حالت کی بتدریج ترقی ہوتی ہے ویسی ہی علم
ادب کی ترقی بتدریج ہوتی ہے۔ تصنیفات رطب و یابس ہر طرح کی ہوتی ہیں۔ مگر
جو عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی بھی کتابیں ہوتی ہیں۔ ان کے بھی خاص حصوں میں یہ خصوصیت و
جدت ایسی ہوتی ہے کہ وہ سرمایہ علمی پر اضافہ کرتے ہیں۔ ورنہ باقی حصص میں ایسے عیوب و نقص ہوتے
ہیں کہ تصنیفاتِ بشری کے لئے لازمی ہیں۔ کوئی انسان ایسی کتاب نہیں تصنیف کر سکتا کہ وہ بالکل بے عیب
ہو۔ یہ بُرے حصے بھلے حصوں کے ساتھ پیچھے چلے جاتے ہیں۔ کتابوں کی شہرت خود بخود ہی
ہو جائے۔ انکے اچھے حصوں کے سبب قائم رہتی ہے۔ ان ہی کا مطالعہ اہلِ فہم و ذکا کیا کرتے ہیں۔ وہ
انکو اپنے علم کا راس المال بناتے ہیں۔ ان ہی کو اپنے معلومات کا مخزن دل و دماغ میں بناتے ہیں۔
مہذب قوموں کا لٹریچر ان حصص ہی پر مشتمل ہوتا ہے۔ وہ غیر زبانوں سے ایسے حصص کو اپنی

زبان میں ترجمہ کر لیتے ہیں - غرض اعلیٰ درجہ کی مہذب قوموں میں تصنیفات کی اعلیٰ درجہ کی کتابیں
علم ادب ہوتا ہے - ہماری معاشرت و تمدنی حالت میں جس قدر ترقی ہوتی جائیگی ہماری تصنیفات
کا بُرا حصہ اُڑتا جائیگا اور بھلا حصہ قائم رہیگا - بالفعل یہ نہایت افسوس کی بات ہے - کہ ہماری
زبان میں وُہ کتابیں عام پسند ہیں جو تاریخوں اور تذکروں - مثنویوں - دیوانوں - قصوں ناٹکوں
میں حُبِ وطنی و بخشش و محبت کی دلفریب صورتیں صدہا طرح سے دکھاتی ہیں اور دل کو
لبھاتی ہیں - مگر انکے مضامین بداخلاقی و کفر شعاری سے بھرے ہوتے ہیں - ان میں جن
محبانِ دل نواز اور عاشقانِ جانباز کا ذکر ہوتا ہے وُہ اپنی بدافعالی میں خود مختار و شتر بے مہار
ہوتے ہیں - جو چاہتے ہیں وُہ کرتے ہیں - اُنکی ذات بے عیب ہوتی ہے - بدکاروں کی
بدکاری کا نمونہ و مثال ایک چھوٹے سے دائرہ میں ان لوگوں پر اثر کرتے ہیں جو انکو دیکھتے
ہیں - مگر جب یہ بدکاری تحریر میں آکر کتاب کی صورت میں آجاتی ہیں - تو اس کے مضر اثر پھیلنے
کی کوئی انتہا نہیں رہتی - اس قسم کی کتابیں دور دور ان مقامات میں پہنچ جاتی ہیں جو سب سے الگ تھلگ
پڑے تھے اور ان میں بیگناہی اور سادہ لوحی اپنا کام کر رہی تھی - وہ وبا کی طرح ایک جگہ سے
دوسری جگہ پھیلتی جاتی ہیں - ایسی کتابوں کا دم بھرنا زہر ہے - انکا چھونا موت ہے - کسانوں
اور گڈریوں کے جھونپڑوں میں تاجروں کی دکانوں میں امیروں و غریبوں کے گھروں میں جاکر
وہ اپنا مضر اثر کرتی ہیں - خاص کر کم عمروں کو تباہ کر دیتی ہیں - ان کا حال ٹھنٹ
درخت کا سا ہے کہ نہ جس کے پتے ہیں نہ پھول پھل ہیں - سائے میں جلانے کے سوا کسی کام
کا نہیں +

رسیدِ کتب :- مفصلہ ذیل کتب بغرض ریویو ہمارے پاس آئی ہیں - انشاء اللہ آیندہ انپر ریویو ہوگا -
ترکوں کی معاشرت (مصنفہ مولوی محمد حسن خانصاحب) دربار مہاراجہ رنجیت سنگھ (مترجمہ خان محمد المقلب علی محمد صاحب)
تو ینیں پیر کوٹلہ - ذخیرہ (مطبوعہ مطبع عزیزی آگرہ) -

پولیٹیکل ڈراما

"جنگِ روس و جاپان" کے عنوان سے حیدرآباد کے مشہور و مقبول رسالہ دکن ریویو میں ایک
قابلِ قدر و نتیجہ خیز مضمون شائع ہوا ہے۔ جسے اردو میں پہلا پولیٹیکل ڈراما کہہ سکتے ہیں۔ جب
خود ڈراما ہی اردو میں ابھی ایک نئی چیز ہے۔ اور چند تازہ کتابوں کے سوا کامیاب ناٹک
بھی ہماری زبان میں نایاب ہیں۔ تو ڈرامے کی مختلف اصناف کی نوبت کہاں سے آئی
لیکن اس میں شک نہیں کہ روزمرہ کے واقعات اور سیاسی خیالات کے ذہن نشین کرنے
کے لئے واقعات کو افسانے کا لباس پہنانا یا ڈرامے کے دلچسپ مکالموں کی صورت میں ادا
کرنا ایک نہایت ہی موثر پیرایہ بیان ہے اور مغربی دنیا کے صاحبانِ تصنیف اس سے عموماً بڑے
بڑے کام لیتے ہیں۔ دکن ریویو کے باخبر ایڈیٹر محمد ظفر علیخان صاحب بی۔ اے نے اس مثال
سے فائدہ اٹھایا ہے اور جاپان کی نمایاں فتح کی یادگار میں ایک ایسی چیز لکھی ہے جس کا اثر ہندوستان
کے ہر حصے میں محسوس ہونا چاہئے۔ یہ ڈراما ریویو کے دوسو صفحے کے قریب گھیرے ہوئے
ہے۔ اور اس کی اشاعت کی خاطر چار مہینوں کے پرچے یکجا چھاپے گئے ہیں۔ قصے کے
شروع ہونے سے پہلے ایک تمہیدی مضمون مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سابق ایڈیٹر رسالہ
افسر کا لکھا ہوا ہے۔ جو بجائے خود بہت تعریف کے قابل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈراما تو ایک بہانہ ہے
قابل مصنف کا مدعا اپنے ملک میں شوقِ ترقی پھیلانا ہے اور اس مدعا کے حصول کے لئے اس
تصنیف کے بعض حصے نہایت موزوں ہیں۔ ہمارے ذخیرہ ادب کو ایسی کتابوں کی بیحد
ضرورت ہے۔ جو سیاسیات کے مسئلے دلچسپ طریقوں سے اور عام فہم پیرائے میں اردو دان جماعت
کے روبرو پیش کریں اور ہمارے ہموطنوں میں ان مسائل پر غور و فکر کرنے کی عادت ڈالیں اور
انہیں دنیا کے دوسرے ملکوں کی عملی قوت کی تقلید کے لائق بنائیں۔

یہ ڈراما چار باب پر منقسم ہو اور ہر باب میں متعدد سین ہیں۔ پہلا پردہ اُٹھتے ہی شہنشاہ مکاڈو کی مجلس شوریٰ دکھاتا ہو جس میں شہنشاہ اپنے ارکین سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

اگرچہ اقصائے مشرق میں بج رہا ہو کوسِ وقار اپنا — نواحِ مغرب میں لیکن اب تک جما نہیں اعتبار اپنا
مزا تو جب ہے کہ جرمنی اور فرانس مانیں ہمارا لوہا — ہمارے آگے سرِ تفاخر جھکائے مغرور زار اپنا

دربار کے اُمرا شہنشاہ کے ہمخیال اور ہم آہنگ ہیں۔ اور روس سے جنگ ٹھن جاتی ہو۔ دوسرا پردہ محل شاہی سے ہمیں ایک غریب بڑھیا کی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ جو اپنے اکلوتے بیٹے اوکیو کو خدمتِ ملک و قوم کے لئے آزاد کردینے کی غرض سے جان پر کھیل جاتی ہے۔ یہی اوکیو جس سے ہمیں ابتدا سے ہی ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ اس قصّے کا "ہیرو" بنتا ہے۔ اور اسی کی بدولت اس ڈرامے میں حُسن و عشق کی چاشنی پیدا کی جاتی ہے۔ تیسرا پردہ ہمیں مشرق کی سرزمین سے منتقل کرکے دفعتًا مغرب کا نقشہ دکھاتا ہے۔ اور زارِ روس اپنے مشیروں سے سرگرم مشورت نظر آتے ہیں اور اُن کے متکبر اُمرا لڑائی پر آمادہ کرتے ہیں۔ دونو درباروں کا نقشہ کھینچنے میں اُنکی اندرونی حالت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی گئی ہو اور مکاڈو اور زار کے خیالات اور جذبات کا فرق دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح جاپان اور روس دونو ملکوں کے رہنے والوں کی حالت کا مقابلہ جابجا کیا گیا ہو۔ جاپانی اپنے حاکم سے خوش اور اپنے ملک پر جان فدا کرنے کو تیار دکھائی دیتے ہیں اور روسی مدتوں کے ظلم و تعدی سے تنگ آکر زار اور اُس کی حکومت کے تزلزل کے خواہاں ہیں اور جاپانیوں کو زار کے لئے ایک خدا ساز سامانِ تہدید سمجھتے ہیں۔ جاپانی افسروں کا ایثار اس سے ظاہر ہے کہ اوکیو اپنی آیمی کو جس کا وُہ سچا جان نثار اور عاشق ہو۔ خدا کے حوالے کرکے جنگ میں سربازی کو جاتا ہو اور روسی افسروں کی تباہی اُن کی عیاشی سے ہویدا ہے۔ کہ میدانِ کارزار میں بھی ناچ کے جلسے رچاتے ہیں اور وہاں امیر البحر ایک افسر کی بیوی کو بھگانے کی فکر میں نظر آتا ہے۔

دُوسرا باب جس پردے سے شروع ہوتا ہے۔ وُہ آبنائے کوریا کا منظر ہے۔ اور جاپانی

امیرالبحر ٹوگو کے جہاز وہاں مقیم نظر آتے ہیں۔ امیرالبحر اور اس کے افسروں کا مکالمہ پُر حوصلہ خیالات سے لبریز ہے۔ اور دوسرا سین آہن پوش جہاز اساما کی تصویر دکھاتا ہے۔ جہاں کپتان مع اُن سپاہیوں اور افسروں کا جام صحت پی رہے ہیں۔ جو پورٹ آرتھر کو زمانہ بند کرنے والی مہم کے ہمراہ جانے کے لیے نامزد ہوئے ہیں یہ جام صحت شراب کی جگہ پانی کا جام ہے اور کپتان صاحب کی تقریر میں ایک بلا کا کاٹتا ہوا فقرہ اہل یورپ کے شوق شرب نوشی کے متعلق ہے۔ وُہ کہتے ہیں :- "یہ پانی کا پیالہ جو میں اسوقت تمہیں پینے کے لیے دیتا ہوں اس سے مجھے تمہاری جرأت یا حوصلہ بڑھانا مقصود نہیں۔ بلکہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ تم اس آہن پوش کے چیدہ جانبازوں میں سے ہو۔ ہم لوگوں کے لیے اس سے بڑھ کر ذلت اور شرم کی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ مقام ہلاکت میں جاتے وقت اہل یورپ کی اُس مصنوعی جرأت کا سہارا ڈھونڈیں۔ جو شراب کے پیالے کی تہ میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔" دونو حریفوں کے عادات واطوار کے امتیاز کو ایک فقرے میں ادا کر دینے کے لیے اس سے بہتر ترکیب مشکل تھی۔ تیسرا سین ہمیں پھر زار کے محل کی سیر کراتا ہے۔ جہاں اُمرا کی باہمی رقابتیں اور اپنے اپنے رُفقا کی طرفداریاں بڑے زور سے موجود ہیں اور خود غرضی حُبِ وطن کا بہروپ لیے کھڑی ہے۔ اُنکی باتیں سُنو تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اُس کی عزت کے دل سے خواہاں ہیں اور اُن کے طرزِ عمل کو دیکھو تو اپنے ملک کی صاف جڑ کاٹتے معلوم ہوتے ہیں۔ چوتھا سین رُوسی مسلمانوں کی ایک مجلس اور اُنکی بددلی کا نقشہ ہے اور پانچویں چھٹے اور ساتویں میں باغی روسیوں کی سازشیں۔ اور ایک عورت کے سبب سے اُنکی سب سے بڑی سازش کا افشا۔ اس عورت کا قید ہونا اور اپنے عاشق کے ذریعے سے جو فوج میں عہدہ دار ہے اسکا بچ نکلنا بیان کیا گیا ہے۔ آٹھواں پردہ اُس عورت کو مردانہ بھیس بدلے ہُوئے پاتا ہے اور وُہ اپنے رہا کرنے والے عاشق کی نوکری کر کے اُس کے ساتھ لڑائی میں جاتی ہے۔ ان دونو کی سچی دلدادگی کا تذکرہ بھی ضمناً دلچسپی رکھتا ہے۔ اِن سے ہماری آخری ملاقات دریائے

کے خاتمہ کے قریب ہوتی ہے۔ جہاں وہ فوجی افسر زخم کھا کر ہسپتال میں جان دیدیتا ہے اور
اُس کی فدائی محبوبہ بستر مرگ پر اس سے بیاہی جاتی ہے اور خود بھی وہیں جان دیدیتی ہے۔
تیسرے باب میں ہم اوکیو سے پھر روشناس ہوتے ہیں۔ مگر حضرت پہچانے نہیں پڑتے
پہچانے کیونکر جاہیں۔ ایک چینی کسان کے بھیس میں دشمن کے خیموں میں گھس کر جاسوسی
کر رہے ہیں وہ ایسے اُستاد ثابت ہوتے ہیں۔ کہ غنیم کے ہاں سے محوزہ نقشہ جنگ تک
اُڑا لاتے ہیں۔ اس سے مصنف کا مطلب جاپانیوں کے اُس کمال کی داد دینا ہے جو انہوں
نے اپنے محکمہ اطلاع میں دکھایا اور جس کے سامنے روسی محکمہ اطلاع کا انتظام بالکل ناقص تھا۔
جاپانی جان پر کھیل کر ہر طرح کی خبریں لے آتے تھے اور روسی اول تو اُس طرح آنے کی
جرأت ہی نہ کرتے تھے اور اگر کرتے تھے تو مُنہہ کی کھاتے تھے اور اپنے بھدے پن سے
پکڑے جاتے تھے۔ دُوسرا پردہ اوکیو کو اپنے کیمپ میں دیکھتا ہے اور تیسرے میں۔
اس کی محبوبہ سنانزی جو ایک امیر بہیر کی بیٹی ہے اپنی سہیلی سے ہم کلام ہے۔ اور اسی
موقعہ پر انہیں اوکیو کا خط ملتا ہے۔ جس میں فتح یالو کی خوشخبری مندرج ہوتی ہے۔ اور اس باب
کا آخری پردہ اُن خیالات کا اظہار ہے جو قسطنطنیہ میں سلطان المعظم کے ہاں روس کی پے درپے
شکستوں اور جاپان کی فتوحات کو دیکھ کر پیدا ہوئے ہونگے۔

چوتھا باب ہمیں روزونسکی کا وہ بدقسمت بیڑا دکھاتا ہے جو نہایت شدومد کے ساتھ
بالٹک سے روانہ ہوا تھا۔ اور جس سے یہ توقع تھی کہ جاتے ہی جاپانی جہازوں کے دُھوئیں
اُڑا دیگا۔ یہی وہ امیر البحر تھا جس نے چھوٹتے ہی چند انگریزی ماہی گیروں پر تو بزدلانہ
ہاتھ صاف کیا۔ لیکن آگے چل کر فرانسیسی بندرگاہوں میں طرح طرح کے بہانوں سے پناہ
ڈھونڈھنے لگا۔ اور ٹوگو کے مقابلے سے جان چُراتا رہا۔ اور آخر جب اس کے سامنے آیا
تو اس کا بیڑا بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔ مصنف اس سین میں غریب ماہی گیروں پر جو ظلم ہوا وہ
ناظرین کو دکھاتا ہے۔ لیکن توجہ اس تصویر غم سے گھبرا کر دوسرے سین کی طرف بھاگتی ہے۔

جہاں پاکباز آدمی جس کے دل میں ملک کی محبت آوکیو سے بڑھ کر اور اوکیو کی اُلفت ملک سے بڑھ کر باری باری موج زن ہو۔ سمندر کے کنارے بیٹھی سمندر کی لہروں سے باتیں کر رہی ہو۔ اور کہتی ہے:۔

اے دریا کی مصنف لہرو	اُٹھو اُبھرو اُترو ٹھہرو
ختم سفر ہوتا ہے تمہارا	پہنچا دریا کا کنارا
محنت لگ گئی ساری ٹھکانے	تکلیف کی آسان خدا نے
مضطرب و بیتاب ہو پھر کیوں	رنگ رخ سیماب ہو پھر کیوں
ساحل کو ٹھکرانا کیسا	بچتے پہ مل جانا کیسا

یہ باب آخری ہے اور اس میں پچھلے بابوں سے بہت زیادہ سین ہیں۔ قصے کا انجام تو وہی ہے جو دنیا بھر کو معلوم ہے۔ متواتر فتوحات جاپان کے بعد امریکہ کے توسط سے رُوس اور جاپان میں صلح ہو جاتی ہے۔ شخصی معاملات میں سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر یہ بات ہے کہ اوکیو کامیابی کے ساتھ گھر لوٹتا ہے۔ ایکی کا باپ اسے فرزندی میں قبول کر لیتا ہے اور دونوں کی شادی دھوم دھام سے رچتی ہے۔ ابن طالب کے بیان کے لئے چار پانچ سین کافی ہوتے۔ مگر مصنف نے اس باب کو بارہ سین تک پہنچایا ہے اور وہ اس طرح کہ تمام دنیا کے مشہور دارالخلافوں میں جو رائیں اس واقعہ پر دی جا سکتی تھیں۔ اُن کا خلاصہ کیا ہے۔ کہیں کابل کا دربار ہے۔ کہیں لنڈن کا۔ کہیں قیصر ولیم جاپانی فتوحات پر رائے زنی کر رہے ہیں اور کہیں امریکہ کے پریسیڈنٹ رُوزولٹ۔ یہ سب لوگ باتیں تو کام کی کرتے ہیں اور ایک پولیٹکل ڈرامے میں ایسے مکالمے جو ان فصلوں میں درج ہیں جائز بھی سمجھے جانے چاہئیں۔ تاہم یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ ان کے اضافے سے کسی قدر غیر ضروری طوالت پیدا ہو گئی ہے۔ جس کا اثر قصے کی دلچسپی پر اچھا نہیں پڑتا۔

ہم نے اس قصے کا مختصر سا خاکہ کھینچ دیا ہے۔ مگر پھر بھی کئی عمدہ سین رہ گئے ہیں۔

جنکا ذکر نہیں ہو سکا۔ اور مناسب بھی یہی تھا۔ کیونکہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ پورا خلاصہ دے کر لوگوں کو اصل سے مستغنی کر دیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اُردو خوانوں کی کثیر جماعت کے بیشتر افراد اصل کتاب سے مستفید ہوں اور اس لئے ہمارا یہ خیال ہے کہ اگر اسکو علیحدہ کتاب کی صورت میں چھاپ کر عام طور پر ملک میں پھیلایا جاتے تو بہت مفید ہو۔ اور جب تک ایسا نہیں ہوتا۔ شائقین دکن ریویو کا پرچہ بابت ستمبر و اکتوبر و نومبر و دسمبر سنہ ۱۹۰۵ء ایڈیٹر صاحب سے منگوا کر پڑھیں۔ اور مصنف کی محنت اور حبِ وطن کی داد دیں۔

یہاں تک تو تھا اس تصنیف کا خلاصہ اور اسکی خوبیوں کا اعتراف۔ مگر ابھی تنقید کا دوسرا پہلو باقی ہے کہ جو کمی اس میں رہ گئی ہو۔ اس کا اظہار بھی خوبیوں کے ساتھ ساتھ کیا جائے تاکہ قابل مصنف دوسری اشاعت کے موقعہ پر (جس کی امید قوی ہے کہ ضرورت پڑیگی) یا آیندہ اسی قسم کی تصنیف کے وقت اس کمی کی تلافی کر سکے۔

سب سے بڑھ کر جو شکایت اس دلچسپ کتاب کے دیکھنے سے ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسے ڈراما کہا گیا ہے مگر اصلی معنوں میں ڈراما بنانے کی پوری کوشش نہیں کی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی میں کئی ڈرامے ایسے ہیں جو کبھی فی الواقع تماشے کے طور پر ایکٹ نہیں کئے گئے صرف کتب خانوں کی زینت رہتے ہیں اور کمرے میں بیٹھ کر پڑھنے کے کام آتے ہیں۔ اگر ہمارے دوست کا بھی اس ڈرامے سے اتنا ہی مدعا ہے۔ تو خیر۔ انہیں اس ارادے میں کامیابی ہوئی ہے لیکن اگر ڈرامے سے مراد ہو ایسی تصنیف جو سٹیج کے لئے موزوں ہو۔ اور جسے اگر کوئی ہوشیار ناٹک والے تماشے کے طور پر دکھائیں تو ہزار ہا لوگ اسے دیکھنے کے لئے کھنچے آویں۔ تو اس میں بہت کچھ تغیر و تبدل کی ضرورت اور ترقی کی گنجایش ہے۔ مولوی ظفر علیخانصاحب نے جو نظم و نثر دونوں میں مہارت اور مشق رکھتے ہیں۔ اپنی اس دوہری قوت سے کام لیا ہے اور اکثر مکالمے نظم کر ڈالے ہیں۔ اور اس نظم کے حق میں یہ کہنا محض انصاف ہے کہ اکثر ناٹک کے تماشوں میں جو نظم پیش کیجاتی ہے۔ وہ اس کے مقابل میں نظم کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔

اس ڈرامے میں اکثر اشعار اچھے پائے گئے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ ان غزلوں میں سوا کثر سٹیج کی گوں کی نہیں۔ وہاں نہ بڑے بڑے لفظوں کی گنجائش ہے۔ نہ مشکل بندشوں کی۔ اور اگر اشعار بے غرض سے درج کئے گئے ہیں کہ جنکی طرف سے وُہ لکھے گئے ہیں۔ وہ انہیں گائیں تو انکی لمبی غزلیں گاتے گاتے انکے گلے بیٹھ جائیں گے۔

چند مثالیں مندرجہ بالا اعتراض کی توضیح کو کافی ہونگی۔ اس مراسے کو لیجئے جو باب اول کے تیسرے سین میں روس کا وزیر صیغہ خارجیہ زار کو پڑھ کے سناتا ہے۔ اس کے اٹھارہ شعر ہیں۔ اور یُوں شروع ہوتا ہے:۔

اے شہنشاہ فلک پایہ و خورشید رکاب — اے جہاں دار ملک سایہ و ناہید جناب
جس کی شان اور جلالت کے مقابل میں ہوئی — شوکت صدر نشینان زمن نقش بر آب
غیرت ابر گہر بیز ترا لطف و کرم — صورت برق شرر بیز ترا قہر و عتاب

یا ساتویں سین میں اُس نظم کو دیکھئے جو آوکیو مکاڈو سے خطاب کرکے پڑھتا ہے:۔

اے شہنشاہ فلک درگہ و خورشید نشاں — رونق بزم جہاں فخر سلاطین زماں
مرکز دائرہ دولت و اقبال و شکوہ — مصدر قاعدہ مکرمت و شوکت و شاں
منتہائے نظر دانش و تدبیر و خرد — مبتدائے خبر عافیت و امن و اماں

یا جہاں ہر مجسٹی سراج الملة والدین امیر کابل کے دربار میں صدر اعظم یوں افتتاح کلام کرتے ہیں:

چہکنے لگے شاخساروں میں بلبل — چٹکنے لگے غنچے کھلنے لگے گل
زمانہ ہوا محو جشن بہاراں — پیالہ ہوا لالہ شبنم بنی مُل
چمن میں ہیں انبار نسرین و گل کے — مزا دے رہی ہے بہار تقابل
پکارے یہ کہتی ہیں سنبل کی زلفیں — غلط ہے کہ باطل ہے وہم تسلسل
نوا ریز ہیں نغمہ سنجان گلشن — دکھاتے ہیں شان کمال تغزل
ہیں صرف دعا گوئی خان اعظم — ہیں واقف ثنا خوانی شاہ کابل

امیرِ فلک قدر فخرِ اماثل ہیں کنزِ اکرام و گنجِ تفضّل

یہ تینوں ٹکڑے نظم کے جو مثال کے طور پر لئے گئے ہیں۔ قصیدے کے رنگ میں لکھے ہُوئے ہیں اور یہ وُہ رنگ ہے جس کے لئے ہمارے دوست ظفر علی خاں صاحب کی طبیعت خصوصیت سے موزوں واقع ہوئی ہے۔ اگر اُنھوں نے کوئی قصیدہ لکھا ہوتا۔ اور اُس میں یہ اشعار آتے تو ہم ان شعروں کی دل کھول کر داد دیتے۔ مگر اس ڈرامے کے مکالموں میں یہ برمحل نہیں معلوم ہوتے۔ ڈرامے کے مکالموں کے لیے سب سے ضروری چیز ہے اُن کا نیچرل ہونا اور وُہی اِن اشعار میں موجود نہیں۔ اول تو یہی بہت موزوں نہیں کہ نائب السلطنت کے مراسلات منظوم ہوں اور صدرِ اعظم سیاسیات کی گفتگو چھیڑنے کے لئے قصیدہ کہنے لگیں اور پھر قصیدہ بھی کیسا جو فوراً ممدوح کی ثنا سے شروع ہونے کی بجائے ایک لمبی تشبیب سے شروع ہو جیساکہ آخری نمونے سے ظاہر ہے۔ یہ گل و مل۔ یہ سنبل کی زلفیں۔ یہ تغزل یہ تشبیب سب ایک پولیٹکل ڈرامے میں کیونکر کھپ سکتے ہیں۔

جو مثالیں اُوپر بیان ہُوئیں اُن سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے۔ کہ اس ڈرامے میں حصہ نظم سب اسی طرح کا ہے۔ نہیں بعض مقامات میں طبع مصنّف نے سادہ اور پُر زور اشعار لکھنے میں کمال دکھایا ہے۔ اور وُہ اشعار ایسے ہیں۔ کہ اگر یہ ڈراما سٹیج پہ دکھایا جائے تو نہایت موثر ثابت ہوں۔ ایسے اشعار کا ایک نمونہ آپ آیی کی زبان سے سُن چکے ہیں۔ ایک دوسرا نمونہ اُدیکیو سے سُن لیجئے۔ جو اُس سے رخصت ہوتے وقت یُوں سخن سرا ہوتا ہے:۔

تیری آنکھیں ہیں مجھے مست بنانے والی بادۂ ناب کے دو گھونٹ پلانے والی

اس محبت کا بُرا ہو کہ یہ وُہ آتش ہے جو مرے ساتھ تمہیں بھی ہے جلانے والی

شکوہ بے سود ہے آنا تھا طبیعت کو ضرور کہ بلا ٹل نہیں سکتی کبھی آنے والی

کیا عجب ہے کہ محبت تری ثابت ہو جائے مری تقدیر کے لکھے کو مٹانے والی

کیا عجب ہے کہ یہی جنگ بنے آخر میں تجھ کو مجھ سے تو مجھے تجھ سے ملانے والی

یہ وُہ اشعار ہیں جو سٹیج پر کسی خوش گلو اور ماہر فن ایکٹر کی زبان سے نکل کر سینکڑوں دلوں کو بیتاب کر دیں۔ اور جو گائے جانے کے لئے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

مُکاندو کے وُہ اشعار جن میں وُہ ایشیا کے مستقبل کا بیان کرتا ہے۔ اور جاپان کے فرائض اس مقصد کے حصول کے متعلق ظاہر کرتا ہے۔ ہمیں خاص کر پسند ہیں اور پولیٹیکل پہلو سے ہند میں ایک نئی رُوح پھونکنے کے لئے اس ڈرامے کے بہترین اشعار ہیں :-

ہے بننا ہمیں رہ نما ایشیا کا	جلانا ہے ہم کو دیا ایشیا کا
وُہ تہذیب جو ہو گئی ہے پُرانی	اسے کہتے وہ بادہ خوانی
وُہی آگ اگلی سی جس میں بھری ہے	وُہی مے ہے بوتل مگر دوسری ہے
بھرینگے ہم اُسکو نئی ساتگیں میں	پلائینگے بھربھر کے جاپان چین میں
اسے پی کے جو مست و آزاد ہونگے	وُہ حکمت میں یورپ کے اُستاد ہونگے

باوجودیکہ یہ اشعار جوش سے بھرے ہُوئے ہیں۔ اور تاثیر میں نظم عموماً نثر سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ مگر نثر کے بعض سیدھے سادے جُملوں میں بھی کبھی کبھی غضب کا جادو ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے چند جملے اس کتاب میں آئے ہیں۔ مثلاً جہاں اوکیو اپنی ماں کے گذر جانے کے بعد تنہائی میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے :-

"دُنیائے ناپائدار میں میں اکیلا رہ گیا۔ خویش واقربا اور اعزہ واحباب پیوند زندگانی ہو کرتے ہیں۔ میرا نہ کوئی قریبی رشتہ دار ہے نہ کوئی دلی دوست۔ اب جینے میں کیا لطف رہا۔ میرے گھر کی مرادوں اور خوشیوں کی کل کائنات ایک مری بیوہ ماں تھی۔ اُس کا جو حشر ہُوا وہ مُلک میں آشکار ہے۔ وُہ مجھے بتائی گئی ہے کہ مجھے اس دُنیا میں رہ کر کیا کرنا چاہئے۔ وُہ میری مقدر کا پروگرام اپنے خون سے تیار کرتی گئی ھے"۔

جہاں مصنف کے قلم سے ایسے پُر زور جملے نکل گئے ہیں۔ جن پر وُہ ناز کر سکتا ہے۔ وہیں ایک آدھ جگہ نہایت رکیک عبارت لکھی گئی ہے۔ جو باقی کتاب کی شان کے خلاف ہے۔ مثلاً

دُوسرے باب کے چوتھے سین میں جہاں ایک تمسخر آمیز مخمّس لکھی گئی ہے۔ اس میں دُوسرا بند ایسا ہے جو کسی اعتبار سے جائز نہیں رکھا جاسکتا اور خصوصًا اس بند کو نکال ڈالیں۔

ایک اور ضروری امر جتلانے کے قابل ہے۔ اور وُہ یہ کہ گو اس کتاب کا مقصد ہندوستان میں حبِ وطن کی گرمجوشی پیدا کرنا ہے۔ لیکن ہندوستان ہی میں اس کا کوئی سین نہیں رکھا گیا۔ ہندوستان سے اس کا کچھ تعلق پیدا کرنے کے لئے اتنا کیا گیا ہے کہ دو قابل ہندوستانی یعنی اقبال خاں اور مظفر خاں رزمگاہ سے متعلق کر دیئے گئے ہیں اور وہاں اپنے مُلک کی حالت پر گفتگو کرتے ہیں۔ مگر ہمارے خیال میں یہ کافی نہیں ہے۔ چاہئے تھا کہ جیسے باقی دُنیا پر اس عالیشان معرکے کا اثر دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی دکھایا جاتا کہ ہندوستان میں اس کے بعد کیا خیالات اور تحریکیں پیدا ہوئیں۔ اور اُس جوش سے جو اہلِ ہند کے دلوں میں جاپانیوں کی کامیابی دیکھ کر پیدا ہوا۔ پائداری کی کہانتک اُمید ہے۔

ان قابلِ تلافی اُمور سے قطع نظر کر کے بہ حیثیتِ مجموعی مولوی ظفر علیخاں صاحب کی یہ تصنیف نہایت قدر کے قابل ہے۔ اور ہم اُمید رکھتے ہیں کہ مُلک اُن کی حوصلہ افزائی کرنے میں کوتاہی نہیں کرے گا۔

عبد القادر

ہمارا نام کام سے قایم رہتا ہے۔ سال و ماہ کی درازی سے نہیں۔ خیال اور جذبات سے باقی رہتا ہے۔ سانس سے نہیں۔ کاغذی تصویر میں حیاتِ حقیقی نہیں ہوتی۔ جذبات اور صفات سے زندگی ہے۔ ہم لوگوں کو اپنی عمر یا حیاتِ پاک کا اندازہ دل اور رُوح کی حرکت معنوی سے کرنا چاہئے۔ بس وہی سب سے زیادہ زندہ رہتا ہے اور اسی کا نام باقی رہ جاتا ہے۔ جو سب سے زیادہ غور و فکر کرتا ہے۔ سب سے زیادہ پاک اور شریف جذبات کو کام میں لاتا ہے۔ اور خیر و برکت کے کام اور کارنامے دکھا جاتا ہے۔

(دہلی) نذیر ہاشمی

پیغامِ راز

شیخ محمد اقبال صاحب جب سے کیمرج یونیورسٹی کے ٹرنٹی کالج میں پہنچے ہیں اپنے نئے مشاغلِ علمی میں بیحد مصروف ہو گئے ہیں۔ اور نظم کے حصے کا وقت نذرِ جستجو ہو رہا ہے۔ کتبوں کی ورق گردانی باقی سب شوقوں پر غالب ہے۔ ان دنوں میں اُنہیں نظم لکھنے کی تحریک کرتے ہوئے بھی تامل ہوتا ہے۔ خدا بھلا کرے شیخ نذر محمد صاحب بی۔ اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس حلقہ دہلی کا۔ کہ اُن کے ایک خط نے ذیل کے اشعار لکھوا لئے۔ یہ گویا انکے خط کا جواب ہے۔ معلوم نہیں اُنہوں نے خط میں کیا کیا لکھا تھا جس کے جواب میں یہ رنگین شعر نکلے ہیں۔ اسوقت ہم راز دار نہیں۔ محض پیغام بر ہیں اتنا جانتے ہیں۔ ع یہی اشعار زبانوں پہ ہیں رہنے والے +

کیونکر نہ وُہ جہان کو پیغامِ بزمِ راز دے
غم کی صدائے دلنشیں جس کا شکستہ ساز دے

قسمت سے ہو گیا ہو تُو ذوقِ تپش سے آشنا
پروانہ وار بزم کو تعلیمِ سوز و ساز دے

اس عشقِ خانہ سوز کا شانِ کرم پہ ہے مدار
یاں قیدِ کفر و دیں نہیں جسکو وُہ بے نیاز دے

غافل تجھے خبر نہیں لذت فراغ میں ہے کیا
دُنیا ادا پہ کر فدا عُقبیٰ بہائے ناز دے

مانندِ شمع نور کا ملتا نہیں لباس اُسے
جس کو خدا نہ دہر میں گریۂ جانگداز دے

بکتا نہیں جہان میں ارزاں متاعِ کافری
قسمت میں اس کی خرقہ دے تسبیح دے نماز دے

پابندِ یک صنم نہ ہو۔ ہر لحظہ نو نیاز رہ
پُوجا کو اِس روش سے تُو برہمنِ نیاز دے

تارے میں وُہ قمر میں وُہ۔ بجلی میں وُہ۔ شفق میں وُہ
چشمِ نظارہ میں نہ تو سُرمۂ امتیاز دے

رفعت ہی عجز میں نہاں یعنی نیاز کر شعار
وُہ محوِ ناز ہے اگر۔ تو بھی جوابِ ناز دے

ہو شوقِ سیرِ گُل اگر۔ ایسا چمن تلاش کر
ہر غنچے کی چٹک جہاں لُطفِ نوائے راز دے

محفل جو تھی بدل گئی۔ ساقی تجھے خبر بھی ہے
اب نہ خدا کے واسطے انکو مئے مجاز دے

پیر مغاں فرنگ کی مے کا۔ نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیف غم نہیں۔ مجھکو تو خانہ ساز دے

چپ کی داد

(شمس العلما مولانا حالی مدظلہ' کی وہ نظم جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے گذشتہ جلاس میں بمقام علیگڈھ پڑھی گئی)۔

پہلا بند

اے ماؤ بہنو بیٹیو! دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عزت تم سے ہے

تم گھر کی ہو شہزادیاں شہروں کی ہو آبادیاں
غمگیں دلوں کی شادیاں دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے

تم ہو تو غربت ہے وطن تم بن ہے ویرانہ چمن
ہو دیس یا پردیس جینے کی حلاوت تم سے ہے

نیکی کی تم تصویر ہو عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں ایماں سلامت تم سے ہے

فطرت تمہاری ہے حیا طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے

مردوں میں ست والے تھے جو ست بیٹھے اپنا آپ کھو
دنیا میں ہے ستونتیو! لے دیکھئے اب ست تم سے ہے

مونس ہو خاوندوں کی تم غمخوار فرزندوں کی تم
تم بن ہے گھر ویران سب گھر بھر میں برکت تم سے ہے

تم آس ہو بیمار کی ڈھارس ہو تم بیکار کی
دولت ہو تم نادار کی عسرت میں عشرت تم سے ہے

آتی ہو اکثر بے طلب دنیا میں جب آتی ہو تم
پر موہنی سے اپنی یہاں گھر بھر پہ چھا جاتی ہو تم

دوسرا بند

میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک و مختار تم — پر سارے کنبے کی ہیں بچپن سے خدمتگار تم
ماں باپ کے حکموں پہ پُتلی کی طرح پھرتی رہیں — غمخوار بابوں کی ہیں ماؤں کی تابعدار تم
دن بھر پکانا ریندھنا سینا پرونا ٹانکنا — بیٹھیں نہ گھر پہ باپ کے خالی کبھی زنہار تم
راتوں کو چھوٹے بھائی بہنوں کی خبر اُٹھ اُٹھ کے لی — بچہ کوئی سوتے میں رو یا اور ہوئیں بیدار تم
سُسرال میں پہنچیں تو وہاں اک دوسرا دیکھا جہاں — جا اُتریں گویا دیس سے پردیس میں اک بار تم
وہاں فکر تھی ہر دم یہی ناخوش نہ ہو تم سے کوئی — اپنے سے رنجش کے کبھی پاؤ نہ وہاں آثار تم
بدلے نہ شوہر کی نظر سُسرے کا دِل میلا نہ ہو — آنکھوں میں ساس اور نند کی کھٹکو نہ مثل خار تم
پالا بُروں سے گر پڑے بدخو ہوں سب چھوٹے بڑے — چِتون پہ مَیل آنے نہ دو گو دِل میں ہو بیزار تم

غم کو غلط کرتی رہو سُسرال میں ہنس بول کر
شربت کے گھونٹوں کی طرح پیتی رہو خونِ جگر

تیسرا بند

شادی کے بعد ایک ایک کو تھی آرزو اَولاد کی — تم پھنس گئیں جنجال میں خالق نے جب اَولاد دی
دردوں کے دُکھ تم نے سہے جاپے کی جھیلیں سختیاں — جب مَوت کا چکھا مزا تب تم کو یہ دولت ملی
میکے میں اور سُسرال میں سب کے ہوئے دِل باغ باغ — گھر میں اُجالا تو ہوا پر تم پہ بپتا پڑ گئی
کھانا پہننا اوڑھنا اپنا گئیں سب بھول تم — بچوں کے دھندے میں تمہیں اپنی نہ کچھ سُدھ بُدھ رہی
تب تک بھی سمجھو خیر تھی جب تک بھلے چنگے تھے سب — پر سامنا آفت کا تھا گر ہو گیا ماندا کوئی
سُولی پہ دِن کٹنے لگے راتوں کی نیندیں اُڑ گئیں — ایک اِک برس کی ہو گئی ایک ایک پل ایک اِک گھڑی
بچوں کی سیوا میں تمھیں گذرے ہیں جیسے سِن برس — قدر اُس کی جانیگا وُہی دم پر ہو جس کے بنی
کی ہے مہم جو تم نے سر مردوں کو کیا اس کی خبر — جانے پرائی پیڑ وہ جس کی بِوائی ہو پھٹی

تھا پالنا اولاد کا مردوں کے بوتے سے سوا
آخر یہ آئے دُکھیاریو! خدمت تمہارے [illegible]
پیدا اگر ہوتیں نہ تم بیڑا نہ ہوتا پار یہ
رو چیخ اُٹھتے دو دن میں اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ

چوتھا بند

لیتیں خبر اولاد کی مائیں نہ گر بچپن میں یہاں
خالی کبھی کا نسل سے آدم کی ہو جاتا جہاں
یہ گوشت کا اک لوتھڑا پروان چڑھتا کس طرح
چھاتی سے لپٹا کے نہ ہر دم رکھتی گر بچے کو ماں
وہ دین اور دُنیا کے مُصلح جنکے وعظ اور پند سے
ظلمت میں باطل کی ہوا دُنیا پہ نُورِ حق عیاں
وہ علم اور حکمت کے بانی جن کی تحقیقات سے
ظاہر ہُوئے عالم میں اسرارِ زمین و آسماں
وُہ شاہِ کشورگیر اسکندر کہ جسکی دھاک سے
تھے بید کی مانند لرزاں تاجدارانِ جہاں
وہ فخرِ شاہانِ عجم کسریٰ کہ جس کے عدل کی
مشرق سے تا مغرب زبانوں پر ہے جاری داستاں
کیا پھول پھل یہ سب نہیں کمزور پودوں کے نہ تھے
سینچا تھا ماؤں نے جنھیں خُونِ جگر سے اپنے یہاں
کیا صوفیانِ با صفا کیا عارفانِ با خُدا
کیا انبیا کیا اولیا کیا غوث کیا قُطبِ زماں
سرکار سے مالک کی جتنے پاک بندے ہیں بڑھے
وُہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں سب اُوپر چڑھے

پانچواں بند

افسوس دُنیا میں بہت تم پر ہُوئے جَور و جفا
حق تلفیاں تم نے سہیں بے مہریاں جھیلیں سدا
اکثر تمہارے قتل پر قوموں نے باندھی ہے کمر
دیں تاکہ تم کو یک قلم خود لوحِ ہستی سے مٹا
گاڑی گئیں تم مدتوں مٹی میں جیتی جاگتی
حامی تمہارا تھا نہ یاور کوئی جز ذاتِ خُدا
زندہ سدا جلتی رہیں تم مُردہ خاوندوں کے ساتھ
اور چین سے عالم رہا یہ سب تماشے دیکھتا

بیاہی گئیں سوت جب بیاہ سے واقف نہ تھیں — جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچے تاگے سے بندھا
بیاہا انہیں ماں باپ نے بے زر بنوا تن ٹھٹ — جیسے کسی تقصیر پہ مجرم کو دیتے ہیں سزا
گذری جو تو بیوہ و یتیم میں جبتک رہا باقی سہاگ — بیوہ ہوئیں تو عمر بھر پھر چین قسمت میں نہ تھا
محنت سے سخت تھا ان کی رہیں پر رائگاں — کیں تم نے جو خدمت کم خدا ملا تمہیں لیکن بیوفا

گو صبر کا اپنے نہ کچھ تم کو ملا اجر یہاں
پر جو فرشتے سے نہ ہو وہ کر گئیں تم کام یہاں

چھٹا بند

کی تم نے اس دارالمحن میں جس تحمل سے گذر — زیبا ہے گر کہئے تمہیں فخر بنی نوع بشر
جو سنگدل سفاک پیاسے تھے تمہارے خون کے — اُن کی تو ہیں بے رحمیاں مشہور عالم میں مگر
تم نے تو چین اپنے خریداروں سے بھی پایا نہ کچھ — شوہر ہوں ان میں یا پدر یا ہوں برادر یا پسر
اُلفت تمہاری کر گئی گھر دل میں جس بے درد کے — وہ بدگماں تم سے رہا اے بے نصیبو عمر بھر
گو نیک مرد اکثر تمہارے نام کے عاشق رہے — پر نیک ہوں یا بد رہے سب متفق اس رائے پر
جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں — آئی تھی جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجہول اور گمنام دنیا میں رہو — ہو تم کو دنیا کی نہ دنیا کو تمہاری ہو خبر
جو علم مردوں کے لئے سمجھا گیا آب حیات — ٹھیرا تمہارے حق میں وہ زہر ہلاہل سر بسر

آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا وہاں جواب

ساتواں بند

گذرے تھے جو جگ تم پر کہ ہمدردی نہ تھی تم کو کہیں — تھا منحرف تم سے فلک برگشتہ تھی تم سے زمیں

دُنیا کے دانا اور حکیم اِس خوف سے لرزاں تھے سب — تم پر مُبادا علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں
ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق — تعلیم پا کر آدمی بننا تمھیں زیبا نہیں
یہاں تک تمھاری ہجو کے گاتے گئے دُنیا میں راگ — تم کو بھی دنیا کی کہن کا آگیا آخر یقیں
علم و ہنر سے رفتہ رفتہ ہوگئیں مایوس تم — سمجھا لیا دل کو کہ ہم خود علم کے قابل نہیں
جو ذلتیں لازم ہیں دُنیا میں جہالت کیلئے — وُہ ذلتیں سب نفس پر اپنے گوارا تم نے کیں
سمجھا نہ تم کو ایک دن مردوں نے قابل بات کے — تم بیویاں کہلائیں لیکن لونڈیاں بنکر رہیں
آخر تمھاری چُپ دلوں میں اہلِ دل کے چُبھ گئی — سچ ہے کہ چُپ کی داد آخر بے ملے رہتی نہیں

بارے زمانہ نیند کے ماتوں کو لایا ہوش میں
آیا تمھارے صبر پر دریائے رحمت جوش میں

آٹھواں بند

نوبت تمھاری حق رسی کی بعد مدت آئی ہے — اِنصاف نے دُھندلی سی ایک اپنی جھلک دکھلائی ہے
گو ہے تمھارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا — پر حل ہر اک مشکل یونہیں دُنیا میں ہوتی آئی ہے
اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سچائی کی سدا — پر فتح جب پائی سچائی ہی نے آخر پائی ہے

خطاب بہ حامیانِ تعلیمِ نسواں

اے بے زبانوں کی زبانو! بے بسوں کے بازوؤ! — تعلیمِ نسواں کی مہم جو تم کو اب پیش آئی ہے
یہ مرحلہ آیا ہے پہلے تم سے جن قوموں کو پیش — منزل پہ گاڑی اُن کی اِستقلال نے پہنچائی ہے
ہے رائی بھی پربت اگر دل میں نہیں عزمِ درست — پر ٹھان لی جب جی میں پھر پربت بھی ہو تو رائی ہے
یہ جیت کیا کم ہے کہ خود حق ہے تمھاری پُشت پر — جو حق پہ مُنہ آیا ہے آخر اُس نے مُنہ کی کھائی ہے
جو حق کے جانبدار ہیں بس اُن کے بیڑے پار ہیں — بھوپال کی جانب سے یہ ہاتف کی آواز آئی ہے

ہے جو مہم درپیش دستِ غیب ہے اس میں نہاں
تائیدِ حق کا ہے نشاں امدادِ سلطانِ جہاں

(از ... ناتوان علیگڈھ)

لوازمِ شاعری

شعر گوئی میں رہیں پیشِ نظر یہ باتیں | کہ بغیر ان کے فصاحت نہیں ہوتی پیدا
چست بندش ہو نہ ہو سست یہ خوبی ہے | وہ فصاحت سے گرا شعر میں جو حرف دبا
عربی فارسی الفاظ جو اردو میں کہیں | حرفِ علت کا برا ان میں ہے گرنا دبنا
الفِ وصل اگر آئے تو کچھ عیب نہیں | لیکن الفاظ میں اردو کے یہ گرنا ہے روا
جس میں گنجلک نہ ہو تھوڑی بھی صراحت ہے وہی | وہ کنایہ ہے جو تصریح سے بھی ہو اولیٰ
عیب و خوبی کا سمجھنا ہے اک امر نازک | پہلے کچھ اور تھا اب رنگِ زباں اور ہوا
یہی اردو ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے | اہلِ دہلی نے اسے اور سے اب اور کیا
مستند اہلِ زباں خاص ہیں دلی والے | اس میں غیروں کا تصرف نہیں مانا جاتا
جوہری نقدِ سخن کے ہیں پرکھنے والے | ہے وہ ٹکسال سے باہر جو کسوٹی نہ چڑھا
بعض الفاظ جو دو آئے ہیں اک معنی میں | ایک کو ترک کیا ایک کو قائم رکھا
ترک جو لفظ کیا اب وہ نہیں مستعمل | اگلے لوگوں کی زباں پر وہی دیتا تھا مزا
گرچہ تعقید بری ہے مگر اچھی ہے کہیں | ہو جو بندش میں مناسب تو نہیں عیب ذرا
شعر میں حشو و زوائد بھی برے ہوتے ہیں | ایسی بھرتی کو سمجھتے نہیں شاعر اچھا
گر کسی شعر میں ایطائے جلی آتا ہے | وہ بڑا عیب ہے کہتے ہیں اسے بے معنی

استعارہ جو نہ ہو مزے کی تشبیہ ۔۔۔ اس میں اک لطف ہے اس کہنے کا یہ کیا کہنا

اصطلاح اچھی مثل اچھی ہو بندش اچھی ۔۔۔ روزمرہ بھی رہے صاف فصاحت سے بھرا

ہے اضافت بھی ضروری مگر اک دو تو ہوں ۔۔۔ ایک مصرع میں جو ہو چار جگہ بلکہ سوا

عطف کا بھی ہے یہی حال یہی صورت ہے ۔۔۔ وہ بھی آئے جو سوا اس تو قباحت ہے بڑا

لف و نشر آئے مرتب وہ بہت اچھا ہے ۔۔۔ اور جو غیر مرتب تو نہیں کچھ بیجا

شعر میں آئے جو ایہام کسی موقع پر ۔۔۔ کیفیت اس میں بھی ہے گو وہ بھی نہایت اچھا

ہو نہ مرغوب طبیعت جو بری ہو وہ ردیف ۔۔۔ شعر بے لطف ہے گو قافیہ ہو بے ڈھنگا

ایک مصرع میں ہو تم دوسرے مصرع میں ہو تو ۔۔۔ بیشتر گرچہ ہوا ہم نے اسے ترک کیا

چند بحریں جو مقرر ہیں فقط اردو میں ۔۔۔ فارسی اور عربی میں ہیں مگر ان سے سوا

شعر میں ہوتی ہے شاعر کو ضرورت جن کی ۔۔۔ گر عروض اس نے پڑھا وہ ہے سخنور دانا

مختصر یہ ہے کہ ہوتی ہے طبیعت استاد ۔۔۔ دین اللہ کی ہے جسکو یہ نعمت ہو عطا

بے اثر کے نہیں ہوتا کبھی مقبول کلام ۔۔۔ اور تاثیر وہ شے ہے جسے دیتا ہے خدا

گرچہ دنیا میں ہوئے اور ہیں لاکھوں شاعر ۔۔۔ کسب فن سے نہیں ہوتی ہے یہ خوبی پیدا

عید اضحیٰ

عید اضحیٰ نے مہیا کر دیا سامان عید ۔۔۔ گرد پھر پھر کے بیالے ہو گئے قربان عید

ہر مکاں اسباب عشرت سے ہوا ہے کان عید ۔۔۔ سج گئی ہے جنس تفریحات سے دکان عید

مہر نکلا چاک کر کے جیب گریبان سحر ۔۔۔ دست عالم بڑھ کے پہنچا جانب دامان عید

شاہ خاور واں ہوا تخت فلک پر جلوہ گر ۔۔۔ یاں بیاض صبح پر لکھا گیا فرمان عید

"چشمِ ما روشن دلِ ما شاد" سب کہتے اُٹھے — دیدۂ عالم کا سرمہ بن گیا احسانِ عید
ہر بڑے چھوٹے کے گھر میں آج پھیلی ہے خوشی — خانۂ دلہائے عالم آج ہے ایوانِ عید
عیدِ قربانی کا عالم ہو۔ ابد سے ہو حلال — آج پیمانے سے اے ساقی بندھے پیمانِ عید
رندِ مشرب زاہدوں سے ۔۔۔ زاہد ہیں — روحِ پیوندِ جانِ رحمت ہے طاعت جانِ عید
خونِ قربانی کی سرخی نے جمایا ہے وہ رنگ — لالہ زارِ صحنِ جنت بن گیا میدانِ عید
خونِ قربانی پہ ہے قربان رنگِ کہکشاں — جل گئی گاوِ فلک بھی۔ دیکھ کر دعوتِ عید
دام میں وہ دانۂ مرجاں سے ہرگز کم نہ تھا — قطرۂ خونِ مواشی۔ جو ہوا قربانِ عید
پلّۂ تورِ فلک کے ہمپایہ ۔ رانِ گوسپند — ناقۂ صالح خلیل اللہ کا ۔ حلوانِ عید
شوق سے باہم گلے مل لو کہ ہے وقتِ خوشی — بیٹھنے پر عشرۂ ماتم بھی ہے پایانِ عید
زالِ دنیا کا بھی چہرہ ارغوانی بن گیا — واہ رے تاثیرِ اضحی۔ حبذا ای شانِ عید
نورِ باطن کے لئے ۔ روشن دلوں کے واسطے — قرصِ خورشیدِ فلک سے کم نہیں ہے نانِ عید
اس طرح قربان ہوں حکمِ خدا پر باخدا — جس طرح قربانیاں ہیں فدیۂ قربانِ عید

اس غزل سے کیا عجب طالبؔ کہ گھر گھر ہو خوشی
واقعی اس نظم کا ہر بیت ہے شایانِ عید

ولہٗ

اترانی ہوئی! وہ بہارِ سحرِ عید — ہے جلوہ فگن نقش و نگارِ سحرِ عید
قربانیوں میں ملنے پہ قربان ہے ایسا — گردوں بھی ہے پھیر پھیر کے نثارِ سحرِ عید
آئینۂ طاعت پہ جلا کیوں نہ عیاں ہو — سیماب کا کشتہ ہے غبارِ سحرِ عید
اے ساقیِ مہوش مجھے داروئے طرب دے — ہے مرگِ مفاجات خمارِ سحرِ عید
انفاسِ مسیحا سے بھی ہے تاب زیادہ — اللہ رے تاثیر وقارِ سحرِ عید

نکلی ہے لئے مصحفِ خورشید حرم میں ہے آئینہ داروں میں شمارِ سحرِ عید
آنکھوں سے لگا لیتے ہیں محتاجِ زمانہ سرمے سے نہیں کم ہے غبارِ سحرِ عید
معمور ہے انوارِ تجلا سے اک عالم ہے جلوۂ طور آج دوچارِ سحرِ عید
اس یمن و سعادت کی خوشی ہوتی دوبالا دو دن کو بھی ہوتا جو قرارِ سحرِ عید

اللہ سے ہر وقت دعا ہے یہی طالب
مخزن کو مبارک ہو بہارِ سحرِ عید

طالب بنارسی از بمبئی

ترجمہ اینک آرڈن

جو دن اینک بتا گیا تھا آخر وعدے کا وہ دن آیا
اینی خوش ہو کے مانگ لائی جھٹ پٹ لگی دیکھنے
لیکن کیا جانئے کیا ہوا پھیر شاید تھا دوربین کا پھیر
یا اپنی نگاہ کی برابر ٹھیک اس کو نہ کر سکی وہ مضطر
یا آنکھوں میں دھند چھا گئی تھی لغزش ہاتھوں میں آ گئی تھی
تھا پیشِ نظر جہاز جب تک کرتا رہا گو اشارے اینک
پر اسکی مراد بر نہ آئی صورت اسکی نظر نہ آئی

. . . .

جب تک کہ جہاز سامنے تھا پھیرا اینی نے منہ نہ اصلا
حتی کہ ہوئی نظر سے اوجھل وہ لیلی آرزو کی محمل

آخر مایوس ہو کے پلٹی اپنی قسمت کو رو کے پلٹی

. . . .

ہر چند اسے بہت الم تھا شوہر کا فراق اک ستم تھا
گو رہتی تھی وہ اس پہ پُرنم تھا حکم کا اس کے پاس تو ہم
قسمت میں جو دکھ تھا بھرتی تھی وہ اس نے کہا تھا کرتی تھی وہ
تاہم نہ چلی دکانداری اسکو نہ بھلی دکانداری
اس کام سے آشنا نہ تھی وہ آخر زنِ روستا نہ تھی وہ
وہ بنیوں کی چال سے تھی عاری اتنی تھی کب اس میں ہوشیاری
آتے تھے نہ بھاؤ تاؤ کے طور جو کہتی کچھ اور لیتی کچھ اور
مجبور جو کرتی تھی ضرورت رکھتی تھی نہ کچھ خیالِ قیمت

چاہا کہ جہاں کوئی کام | پہنچا دیا اسکو تا بہ انجام
اب کیا تھا چھوڑ کے جو گھربار | پردیس کی تھی ہر راہ دشوار
منظور نہ تھا کچھ اسکو حاشا | دنیا کا دیکھنا تماشا
نیت یہ تھی اس سے کی دوبارا | منشا اسکا یہی تھا سارا
بچوں میں کوئی نہ سرزدہ جائے | محمد تعلیم ان کو دلوائے
ماں باپ میں جس شخص کے ہو مرحوم | اس پر نہ ہوں مائل یہ معصوم
لیکن وہ پسر جب آئیگا وہ | اس حال میں انکو پائیگا وہ
ایسی آوارگی کی حالت | یہ خودسری اور یہ شرارت
دیکھیگا اکیاں جب انکی | یہ صبح سپید عہد طفلی

دل میں کیا اپنے وہ کہیگا | کیا کچھ نہ ملال وہ سہیگا
ازبسکہ ہے میرا دوست اِک | لایا مجھے یہ خیال یا ننگ
انکار ہے کیا تمہیں کچھ اس سے | کیا ہم نہیں دست پیچ کے
بس میری یہ التجا ہے تم سے | بچوں کو کرو مرے حوالے
اسکول میں انکو بھیجدونگا | ممنون بہت تمہارا ہونگا
ہو تم کو اگر خیال کچھ اور | ہے اس کے لئے بھی ایک جلد
تعلیم میں انکی خرچ جو ہو | قرض حسنہ تم اسکو سمجھو

اینک وہ پسر جب آئے گھر کو
جو کچھ ہو حساب کر کے دیدو

غزل

یاد آتے ہیں

وہ دستِ وحشت و چاکِ گریباں یاد آتے ہیں | جنونِ فتنہ ساماں کے وہ ساماں یاد آتے ہیں
کہاں وہ ہمتیں اٹھتی سی سودائے محبت کی | وہ پائے دشت پیما وہ بیاباں یاد آتے ہیں
ہجوم یاس نے کیسی بھری محفل اجاڑی ہے | ہمیں وہ حسرتیں وہ اپنے ارماں یاد آتے ہیں
کبھی ایک ایک نگاہ میں تیری سو سو جاں نوازی تھی | ترے انداز وہ اے لطفِ جاناں یاد آتے ہیں
کبھی الطافِ پنہاں کا سماں آنکھوں میں پھرتا ہے | کبھی تیرے ستم ہائے نمایاں یاد آتے ہیں
وہ فقرے وہ نگاہیں وہ ادا وہ عشوہ پیہم | وہ تیر و نشتر و شمشیر و پیکاں یاد آتے ہیں
جفائیں آپ کی ہم کو بھلا دیں طولِ فرقت نے | اگر کچھ یاد آتے ہیں تو احساں یاد آتے ہیں
محبت اٹھ گئی کچھ رنگِ ہستی ہی نرالا ہے | وہ اگلی صحبتیں وہ اگلے انساں یاد آتے ہیں
وہ شغلِ عاشقی تیر رنگ کچھ ہو پھر بھی اچھا تھا | ہمیں اب وہ تمنائیں وہ حرماں یاد آتے ہیں

(نیرنگ)

[illegible]

دیوان یادگار داغ

مذکور داغ ہی گلہائے انجمن میں ہے
اس پھول کی بہار ہزاروں چمن میں ہے

فن سخن کے مشتاقو! شاعری کے قدردانو!! داغ کے بعد داغ کے آخری دیوان کا انتظار کرنے والو!!! وہ مجموعۂ کلام چھپ گیا جس کا نام یادگار داغ خود مصنف مرحوم نے رکھا تھا۔ اس دیوان میں ڈیڑھ سو غزلیں مکمل اور تین سو نامکمل غزلوں کے برابر اشعار ہیں جس میں اکثر وہ مفردات اشعار و قصائد و قطعات ہیں۔ جو اس سے پہلے کہیں نہ دیکھے ہونگے۔ اور جن کی دلکشی اور جدت اُن کے مشہور طبع شدہ کلام سے جدا ہے۔ اس دیوان کے اول ایک مفید اور قابل دید مضمون ایشیائی نیچرل شاعری کی بحث میں لکھا گیا ہے۔

قیمت ـــــــــــ فی جلد عہ۸ر علاوہ محصول

فی الحال بہت کم جلدیں چھپوائی ہیں۔ جلد منگائیے۔

المشتہر

احسن مارہروی ایڈیٹر فصیح الملک مزنگ لاہور

عرق ماءاللحم انگوری

اور

درازی عمر

یہ بات تجربہ سے معلوم ہوا کہ دو بزرگ ہم عمر عہدہ دار جو اتفاق چند سے ایک ہی ضلع میں متعین تھے ایک ہی مرض
میں مبتلا تھے ضعف دماغ اور تاریکی چشم۔ سر کا گھومنا۔ چکر آنا تھوڑے کام سے دل گھبرانا۔ جس وقت دو چار گھنٹہ
بیٹھ کر کام کرنا پڑے۔ سر درد ہو جانا۔ بھوک کا بند ہو جانا۔ ہاتھ پاؤں کا ٹوٹنے لگنا اور کبھی گھر میں تخلیہ
کا موقع ملے تو صبح کو کوفت اعضاء تھکنی معلوم ہونا۔ چارپائی سے اٹھنے کو دل نہ چاہتا۔ ایک صاحب نے
عرق ماءاللحم کا استعمال شروع کیا اور دوسرے صاحب اور مختلف معالج ڈاکٹروں حکیموں کا کو تعہد ہے
چند دنوں بعد عرق پینے والے کا رنگ سرخ ہو گیا اور زردی چہرہ دور ہو کر گال جو پچکے ہوئے
تھے پر ہو کر رنگ چمکنے لگا تو دوسرے مختلف ادویہ کے کھانے والے کے دوست نے مجھ سے تعجب
سے پوچھا۔ یار کیا بات ہے تم تو چار بجے کے بعد چھ سات بجے تک کچہری میں کام کرتے رہتے
ہو۔ صبح دم دیکھو سویرے ہی اٹھ کر پھر ہوا خوری کے لئے تیار۔ یہ ماجرا کیا ہے۔ اس نے
کہا بات یہ ہے کہ میں عرق ماءاللحم انگوری دوآتشہ ساختہ حکیم غلام نبی لاہوری پیا کرتا ہوں
چنانچہ وہ سن کر نہ رہ سکے جھٹ تار دیا۔ عرق بھیج دو۔

اب اس ڈپٹی کلکٹر کا سارٹیفکیٹ ملاحظہ کیجئے جس نے سول سرجنوں اور معزز دوسرے
حکماء کا علاج کیا اور ناکامیاب رہا۔ دیکھئے وہ کیا کہتا ہے۔ آدھ آنہ کا ٹکٹ بھیج دیجئے۔ سارٹیفکیٹ
صحت یافتہ اصحاب کے بھیج دونگا۔ قیمت فی تولہ عا تین تولہ سے چھ تولہ تک نصف خرچ
عنقہ بذریعہ ریل منگانے میں محصول کی کفایت ہوگی۔ ریلوے سٹیشن معہ لائن صاف لکھیں
اسنہ بذریعہ ڈاک منگوانے میں بیرنگ محصول ٹکٹ پیشگی آنا ضروری ہے۔

پتہ۔ حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکماء لاہور موچی دروازہ (اعلان جنرل)

جلد (۱۰) مارچ ۱۹۰۶ء نمبر (۶)

ایڈیٹر
شیخ عبدالقادر بی۔ اے

مخزن

اُردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

تصویر جناب محسن کاکوروی جناب مولانا سید احمد علی صاحب شوق

مضامین نثر

مضامین نظم

نوکرور ہندوستانی اُردو بولتے ہیں۔ اور اسی قدر اور ہندوستانی اُردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اُردو مادری زبان ہے ☐ ان شہروں میں اُردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اُردو سمجھی جاتی ہے۔

مخزن پریس لاہور میں شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر کے اہتمام سے چھپکر شایع ہوا

مخزن

کشتی اور طوفان

وہ دردناک نظارہ کل سے بھولیگا جب میں نے ایک کشتی اور اس کے سواریوں کو ساحل کے قریب۔ ہزارہا لوگوں کے پیشِ نظر۔ طوفان کی لہروں کے زبردست تھپیڑوں سے ٹکرا کر۔ ڈوبتے دیکھا۔

فرانس کا شمالی ساحل تھا۔ اور اتوار کا دن۔ ہزاروں تماشائی زن و مرد ساحل کے قریب اونچے بند پر بیٹھے طوفان اور تلاطمِ دریا کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سکون کے وقت تو سمندر کے منظر کو دلکش ماننے میں شاید کسی کو بھی کلام نہ ہو لیکن تلاطم کے وقت کا منظر بھی ایک پُرشوکت دلچسپی سے خالی نہیں۔ بشرطیکہ آپ سبکساران ساحل میں ہوں۔ مگر یہ دلچسپی اسی وقت تک ہے۔ کہ سامنے سمندر ہی سمندر ہو۔ کسی انسان کی جان یا کسی کشتی کی قسمت طوفان کے پنجے میں نہ ہو۔ ورنہ فوراً سخت سے سخت دل موم ہونے لگتے ہیں اور دلوں سے دعائیں بے اختیار اُٹھتی ہیں۔ کہ الٰہی ان جانوں کی خیر ہو جو اس پُرشور حالت میں توکل بخدا پانی میں ناؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ جس دن کا میں ذکر کرتا ہوں۔ اُس دن سمندر زوروں پر تھا۔ موجیں بلیوں اُچھلتی تھیں۔ اور کبھی کبھی پانی ساحل کی ساری خشکی طے کر کے بند سے آ کر ٹکراتا تھا اور اس طرح اچھلتا تھا کہ بند کے اوپر کی زمین تر ہو جاتی تھی۔ اور جو لوگ وہاں بیٹھے ہوئے

تھے۔ ... تک پہنچ جاتے تھے۔ یہ تعطیل کا دن۔ فرصت کا زمانہ۔ سمندر کی
بے اعتدالیاں ہنسی میں ٹال دی جاتی تھیں۔ کسی عورت کے دامن تک اگر سمندر کا پانی دست
گستاخی بڑھاتا تھا تو کئی مشتاق ہاتھ بچانے دوڑتے تھے۔ اور چھتری کی ڈھال سامنے
کر دیتے تھے اور عورت منت پذیری کا شکریہ ادا کرتی تھی۔ اگر کسی مرد کا دامن آب شور سے
تر ہو جاتا تھا تو عورتیں تالی بجاتی تھیں اور وہ قہقہے مارتے تھے کہ الامان۔ لوگ بھیگتے تھے
اور پروا نہ کرتے تھے۔ کوئی اپنی جگہ سے ہلتا نہیں تھا۔ ایک طرف باجا بج رہا تھا اور سینکڑوں
لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ اور جو دور تھے وہ بھی اس کی سریلی صداؤں کے مزے لے
رہے تھے۔ کہ اچانک ایک توپ کی آواز آئی۔ چار بجے کے قریب توپ کیوں چلی!
سب حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ جاننے والے جان گئے کہ کوئی جہاز یا کوئی
کشتی خطرے میں ہے اور یہ توپ بندرگاہ کے اس مینار سے چلی ہے جہاں ایک
تجربہ کار بحری افسر اس نگہداشت پر متعین رہتا ہے کہ نواح بندر میں اگر کوئی ایسا حادثہ ہو تو
فوراً اس کی اطلاع دے۔ نگاہیں سمندر کی طرف دوڑیں اور ایک جہاز پر پڑیں۔ جو اپنے
کام سے عاری ہو چکا تھا اور اس سے ایک مستول پر اتریں جو سرنگوں ہوا جاتا تھا۔ کشتی
کا ایک سرا پانی میں تھا اور دوسرا پانی کے اوپر تھا۔ اور اس طرف مستول سے مضطربانہ لپٹے
ہوئے دو آدمی نظر آتے تھے۔ سینکڑوں زن و مرد بے قراری کے ساتھ بند سے نیچے اتر
کر پانی کے قریب جانے لگے۔ اور بعض ہر اک کپڑے اتار کر پانی میں کودے کہ کشتی تک پہنچ کر
اس کی مدد کریں۔ تھوڑی دیر میں دو کشتیاں پانی میں ڈالی گئیں جن میں وردی پوش ملاح
ایک ایسی سوسائٹی کے ملازم تھے جس کا کام ڈوبتوں کی جانیں بچانا ہے اور جو عموماً سمندر کے
کنارے پھرتے رہتے تھے۔ کہ اگر کوئی ناواقف نہاتا ہوا دور تک چلا جائے اور غوطے
کھانے لگے یا اور کوئی واقعہ ہو تو مدد کو پہنچیں۔ مگر موجوں کی یہ حالت تھی۔ کہ دونوں کشتیوں
میں سے ایک بھی وہاں تک نہ پہنچ سکی جہاں کشتی ڈوب رہی تھی۔ یہ لوگ ہمت کر کے اس طرف کو

چلے تو جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔ کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ۔ آخر ایک شخص سے جس نے اس کشتی کو روانہ ہوتے دیکھا تھا معلوم ہوا۔ کہ کشتی میں چھ آدمی تھے۔ ایک کشتی بان اور دو اس کے بچے۔ ایک چودہ سال کا جو کشتی چلانے میں مدد دیتا تھا اور دوسرا آٹھ نو سال کا جس کو باپ بلا خرچ نہ چھوڑ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی ماں مر چکی تھی۔ یہ شخص کشتی کے کنارے پر بیٹھا تھا۔ کہ تین مسافر آئے۔ دو مرد اور ایک عورت۔ انہوں نے کہا ہم سمندر کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دو اور کشتی والوں نے انکار کیا کہ آج طوفان آ رہا ہے۔ ان حالات میں کشتی دریا میں نہیں ڈالی جا سکتی۔ وہ مایوس ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمیں پھر اور موقع نہیں ملتا ہے۔ کل واپس جانا ہے۔ یہ کشتی بان دلیر تھا۔ اس نے کہا۔ آؤ۔ میں لے چلتا ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے سوار ہو لئے اور کشتی چلی۔ آدمی تھا کاریگر۔ خاصی دیر تک باوجود طوفان کے چلاتا رہا۔ مگر اسکی اس دلیری اور ان کے اس شوق کی آڑ میں موت اپنا کھیل رہی تھی۔ ایک تھپیڑا ایسے زور کا آیا۔ کہ کشتی اس کے قابو میں نہ رہی اور الٹ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ نہ کہیں ٹھکانا لگنا تھا نہ لگا۔

اب ان آفت رسیدوں کی کہانی سنو جو سیر کرنے نکلے تھے۔ وہ تھے ایک میاں۔ ایک بی بی۔ اور ایک میاں کا بھائی۔ میاں۔ بی بی میں کچھ عرصے سے عشق صادق تھا اور آخر چند مہینوں نکاح پر متفق ہو گئے تھے۔ اتوار کا یہ حادثہ ہے۔ اور ہفتے کے دن ان کا بیاہ ہوا تھا۔ دونوں کے ماں باپ زندہ تھے اور بیاہ ہوتے ہی یہ ان سے ہنسی خوشی رخصت ہوئے تھے کہ اتوار کا دن بولون کاٹ کر پیر کو گھر آ جائینگے۔ ہفتے کو جب پادری ان کے ہاتھ ملا کر ان کو دعا دے رہا ہوگا۔ تو اسے کیا معلوم ہوگا کہ وہ نکاح آسمان کے لئے باندھ رہا ہے۔ اور زمین پر اس نکاح کی مدت چوبیس گھنٹے سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر وہ چوبیس گھنٹے ایسے تھے کہ ان پر چوبیس سال کی خوشی قربان کر دینی چاہئے۔ کیونکہ ان کا جو انجام ہوا وہ ہر چند پُر درد اور غمناک ہے۔ مگر ایسا انجام ہے کہ کوئی طالب و مطلوب اس سے بڑھ کر آرزو نہیں کر سکتے۔ دونوں ڈوبے تو اکٹھے ڈوبے۔ شب بھر موجوں کے سامنے اکٹھے سینہ سپر رہے۔ اور جب دنیا

بعضے مسائل ایسے بھی ہونگے جن کو خصوصیت کسی زبان کے ساتھ ہے۔ مگر ایسے مسائل بہت کم ہیں۔ مثلاً جغرافیہ لفظی کے ایک نوع قسم کے مسائل ہیں جو تمام آوازوں کے ساتھ علاقہ رکھتے ہیں جیسے موسیقیات کے مسائل جو انسانی وجمادی و حیوانی صوت اور اس کی [illegible]ات و مراتب کے ساتھ متعلق ہیں۔ اور بعضے مخصوص آوازوں کے ساتھ جیسے زبان بہائم طیور سباع جمادات نباتات بسائط عنصری کائنات جو کے علاقہ رکھتے ہیں۔ رعد کی کڑک۔ بادل کی گرج ان سب کا تعلق اسی فن سے ہے۔ بعضے وہ مسائل ہیں جو عام الفاظ کے ساتھ چاہے موضوع ہوں چاہے مہمل متعلق ہیں۔ بعضے بعض مفردات کے خواص کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مفردات کے خواص کیفی و تاثیر فعلی اسی فن سے علاقہ رکھتی ہے۔ علم وفق وغیرہ بھی اسی کا شعبہ ہے یہ کسی لغت کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بعضے مسائل حروف مرکبہ کے ساتھ متعلق ہیں۔ یہاں البتہ کچھ خصوصیت کسی مخصوص زبان کی رکھی گئی ہے مثلاً اس فن کا ایک یہ مسئلہ ہے کہ عربی لغت میں جہاں کہیں ایک لفظ میں نون و فا جمع ہوگا اس سے نقل و حرکت کے معنے سمجھے جاوینگے۔ نفی نفر نفد نفذ نفخ نفق نفل نفث نغس نقش وغیر ذالک۔ یا ایک مسئلہ ہے کہ یہ بات غلط مشہور ہے کہ ہر زبان میں مبدء اشتقاق مصدر ہے۔ فارسی زبان میں جتنے صیغے ہیں سب قیاساً ماضی مطلق سے بنتے ہیں۔ غیر قیاسی کا ذکر نہیں۔ جیسے ماضی ایک آمد ہے۔ نون لگا دیجئے اخیر میں مصدر ہوجاوے۔ خواہ اول میں داخل کیجئے مستقبل ہو۔ می بڑھا دیجئے ماضی ناتمام د اور بود بڑھا دیجئے ماضی بعید ہو۔ علی ہذا القیاس۔ اردو میں جتنے قیاسی صیغے بنتے ہیں سب امر سے۔ آ امر ہے۔ اس میں جس صیغے کی علامتیں بڑھاتے جائیے وہی صیغہ بنجائیگا اور آ اپنے حال پر رہیگا۔ تو اس قسم کے مسائل بھی بعضے بعضے نظر آئینگے۔ جو کسی مخصوص زبان کے ساتھ علاقہ رکھتے ہیں مگر کم۔

مسائل شروع کرنے کے پیشتر چند مقدمات تمہیدی اور چند قواعد اور چند اصطلاحات کا

تین ہوئے۔ یہ فردیت کا مرتبہ ثانی ہے۔ پھر اس مجموعہ پر زوج اول کو اضافہ کیا پانچ ہوئے
یہ فردیت کا مرتبہ ثالثہ ہے پھر زوج اول کو اس مرتبہ پر اضافہ کیا سات حاصل ہوئے۔ یہ
فردیت کا مرتبہ رابعہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ بہرحال ہر عاقل جان سکتا ہے کہ یہ اعداد موقعی
ہیں جو عدد کے لئے ثابت ہیں اور عدد موجود ہیں۔ ایسے امر کو فلسفہ جدیدہ کی اصطلاح
میں ثبوت امکانی۔ وجود برزخے۔ تحقیق بین بینی۔ ثبوت صغری۔ سکون خطی۔ فرض
بعد کہتے ہیں۔ وجہ تسمیہ کے منہ سے معلوم ہوگی۔ ہر موجود کے لئے چار قسم کا وجود
سمجھا جاتا ہے۔ وجود عینی۔ وجود ذہنی۔ وجود لفظی۔ وجود خطی میں ہر ایک موجود کے
وجودات چارگانہ سے بطرز جدید بحث کرونگا۔ اور حتی الوسع ہر مسئلہ کو تفصیل اور توضیح
کے ساتھ بیان کرونگا۔ مگر

نظم گرد آرید وجاں را رہ دہید
بعد ازاں از شوق پا در رہ نہید

اور اگر ہماری ہی سمجھ کا قصور مستمع کے نہ سمجھنے کا ذریعہ ہو تو بھی ممکن ہے۔ جیسا ہم مرایائے
صوری ومعنوی کے تعاکس وتقابل اور مجبولات طبعی اور مخطورات کونی کے تالف وتخالف
کے ذاتی اور صفاتی وافعالی اقسام اور مناسبات اور تاثیرات کی تحقیق میں عنقریب بیان کرینگے
اور یہاں مخاطب اور مخاطب میں اعتبار انسانیت ائتلاف نوعی وجنسی موجود اور اتحاد آلہ ادراک
اور توافق حیثیت تفہیمی اور تفہمی کی جہت سے تقابل مرایائے معنوی بھی حاصل ہے۔ ہاں
علم مناظر میں اگرچہ تعاکس کے لئے زاویہ انعکاسی ونوری کی مساوات ضروری سمجھی
گئی ہے۔ اور اب یہاں بسبب اتحاد مکانی کے اول تو تغایر خطین ساقین ضروری نہیں
تو زاویہ کا بننا معلوم اور اگر ہو تو بسبب اتحاد مراتب مکانی کے حالت انعکاسی اور نوری
میں ایک جانب اگر زاویہ ہے تو قائمہ اور ایک جانب حادہ تو انعکاس ہونا دشوار لیکن
ہمارے فلسفہ جدیدہ کی تحقیق کے موافق جیسا ہم علم مناظر میں بیان کرینگے۔ تساوی زاویتین

ضروری نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو تعاکس صوری ہی ہے نہ تعاکس معنوی ہی بلکہ ہم اسکو ثابت
کر دکھا چکے ہیں کہ افاضہ علمی مفیض اور مستفیض دونوں پر بذریعہ قوت اشراق ہوتا ہے۔ اس کے
لئے تجنیس یا تساوی ذاتی اور شرط نہیں ہاں تقابل اور محاذات اور ترتیب بطور سبب کے
ہونا چاہئے نہ بطور علت موجبہ کے وہ یہاں حاصل ہے۔ بہرحال بنظر تناسب تعاکس جہت
منفاد انعکاس طرفین سے نہ ہو تو ایک طرف سے ضروری ہے اور یہاں نقص اوصاف
کمالی مخاطب اور مخاطب دونوں میں موجود۔ اول فطرت انسانی کیا باعتبار وجود
جسمی اور کیا باعتبار کمال روحی و عقلی ہر طرح سے ناقص۔ اوصاف جسمی کی حیثیت سے
دیکھئے تو کجا خلقت آسمان و زمین کجا خلقنا الانسان من ماء مهين اسی لئے ارشاد
ہوا لخلق السموات والارض اکبر من خلق الناس　ءانتم اشد خلقا
ام السماء۔ اوصاف روحانی کی حیثیت سے ملاحظہ کیجئے تو کفران اس کی شان قتل
الانسان ما اكفره ظلوم و جہول ہونیکا اس کے قرآن میں بیان انه كان ظلوما
جهولا انا عرضنا الامانة میں ذرا سی بات تھی آسمان سمجھ گئے زمین سمجھی پہاڑ
سمجھے۔ یہ نہ سمجھا کہ یہاں بار امانت کے اٹھانیکا امر اور حکم نہیں کہ خواہ مخواہ اٹھانا
لازم ہو بلکہ عرض ہے جو اختیار پر مبنی ہے اور پھر انجام کا حال معلوم نہیں اٹھانے کی
قوت اور توفیق ادھر سے ملے نہ ملے کہ ان الامر كله لله بے سوچے سمجھے اپنے
تئیں معرض تکلیف میں ڈالدیا۔ آخر ظلوم و جہول کہلایا۔ آسمان زمین پہاڑ سمجھ گئے کہ یہ
عرض ہے امر نہیں۔ فابین ان یحملنها واشفقن منها جہاں امر تھا وہاں نہ انکار کیا نہ عذر
ائتیا قالتا اتینا طائعین۔ پہاڑوں کے حق میں اسی سمجھ کی وجہ سے تو ارشاد ہوا ہے
کہ لو انزلنا هذا القرآن على جبل الى آخره　　　(باقی دارد)

مرسلہ

مولوی صبیح الدین بی۔ اے دہلوی از علیگڈھ

ترکوں کی معاشرت[1]

مولوی محمد حسن خان صاحب کے نامِ گرامی سے ہمارے اکثر ناظرین اُن کی تصانیف و تراجم کے ذریعہ سے آشنا ہو نگے۔ ان کے مترجمہ ناول "ہاجرہ خانم" جو حضرت نعمان ثابت بک کا ہیں۔ جس کی ہر بونہ حال کے ترکوں کے معاشرتی معاملات سے کچھ دلبستگی رکھتے ہیں۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ جس کتاب پر ہم آج تنقید کرنے والے ہیں۔ اس کا مدعا ہاجرہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ ہاجرہ میں بہت سے فرضی اشخاص کو تخیل کے سحر سے لا کھڑا کر دیا ہے۔ اور ان کی رفتار و گفتار سے ترکوں کی معاشرت کا عکس دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اور موجودہ کتاب میں ایک ترک کی رام کہانی اس کی اپنی زبانی سنائی ہے جس کے ضمن میں معاشرتی معاملات پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے۔ پہلا طریقہ زیادہ موثر تھا۔ لیکن دوسرا زیادہ معتبر ہے اور اس قابل ہے۔ کہ اسکو زیادہ غور کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔

ہر ایک مترجم کو اپنے مصنف کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہمدردی ضرور ہونی چاہیے۔ کیونکہ اگر ہمدردی نہ ہو تو مترجم اصل کا مطلب بجنسہ بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ مولوی محمد حسن خاں صاحب کی صورت میں یہ مشکل آپڑی ہے کہ انہیں اپنے مصنف سے کافی ہمدردی نہیں۔ وہ جزوی معاملات میں تو اس سے متفق الرائے ہیں۔ لیکن جن بڑے اصولوں کا خالد خلیل مدعی بنتا ہے۔ اس کے مولوی محمد حسن خاں مخالف ہیں۔ اس مشکل کو شاید مولوی صاحب نے بھی محسوس کیا اور انکو اس بات کی ضرورت لاحق ہوئی کہ ایک مطول دیباچہ لکھا جائے جس میں وہ جی کھول کر دل کا بخار نکال لیں۔ لیکن ہم اپنے ناظرین کو دھوکا نہیں دینا چاہتے

[1] ترکوں کی معاشرت ترجمہ دی ڈائری آف اے ٹرک مصنفہ خالد خلیل ایم۔ اے۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ جسے محمد حسن خاں صاحب اسسٹنٹ فنانشل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا نے مع متعدد حواشی اور ایک دیباچے کے مرتب کیا اور مطبع مفید عام آگرہ میں چھپوایا۔ قیمت ۱۲ علاوہ محصول ڈاک۔

دیباچے کا نفسِ کتاب کے ساتھ بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں۔ صرف بالواسطہ تعلق ہے۔ مسز
خالدہ خلیل نے ضمنی طور پر پردے اور آزادیِ نسواں کے بارے میں کچھ "لامذہبیت سے
ملوث زہریلے" خیالات ظاہر کئے ہیں۔ جن کے مہلک اثر سے بچانے کے لئے
مولوی محمد حسن نے دیباچے کا کڑوا تریاق اپنے ناظرین کو دینا ضروری تصور کیا۔
لیکن انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ مسز خالدہ خلیل کی زبان بند کرنے
میں بھی کوئی کمی نہیں کی۔ چنانچہ بعض صفحات جن میں ینگ ترک پارٹی کی طرف سے
مسئلہ اسلام پر حملے کئے گئے تھے۔ بالکل نظرانداز کر دیئے گئے۔ اور اس تصرف کے لئے
مولوی صاحب نے مسز خالدہ خلیل سے معافی بھی نہ مانگی۔ ہمارے خیال میں کسی مترجم
کو یہ حق حاصل نہیں۔ کہ مصنف کو اپنے مفہوم کے آزادانہ اظہار سے محروم رکھے۔ اور
ایسا کرنا محض تنگ خیالی اور تعصب پر مبنی ہو۔ جس سے کوئی معتدبہ فائدہ بھی متصور نہیں
ہو سکتا۔ اگر مترجم کی آرام طلبی اسے اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ مصنف کی رائے
کا کافی وشافی جواب دے۔ تو بیچارہ مصنف اس کی سزا کیوں بھگتے؟

ترکوں کی معاشرت کا دیباچہ اہمیت میں اصل کتاب سے گو سبقت لے گیا ہے۔
اس لئے ہمارے ریمارکس زیادہ تر اسی کے متعلق ہونگے۔ اصل کتاب کی نسبت
صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہو کہ اس کے مطالعہ سے ایک شریف ترک کی عالم طفولیت
سے لیکر شباب تک کے حالات مختصر مگر دلکش پیرائے میں معلوم ہو جاتے ہیں۔ طرز بیان
نہایت سلیس ہے۔ اور مصنف نے صرف وہی ذاتی حالات تحریر کئے ہیں۔ جو دوسروں
کے لئے کارآمد ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے حالات قلمبند کرنے کو شاید بڑھی ہوئی
خودپسندی پر محمول کریں۔ لیکن ہماری رائے میں اپنے خیالات سنانے کے لئے ہمدرد
سامع پیدا کرنے کا اس سے بہتر پیرایہ ممکن نہیں۔

دیباچے میں مسئلہ تعلیم و آزادیِ نسواں و اثباتِ پردہ پر نہایت شرح و بسط

کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ لیکن ہمیں مولوی صاحب معاف فرمائینگے اگر ہم مفصلہ ذیل
سطور میں بعض معاملات پر اُن سے اختلافِ رائے ظاہر کریں۔ ہمارا منشا یہ نہیں کہ انکی
رائے کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ صرف اپنے خیالات کا اظہار مقصود ہے۔ مولوی صاحب
اُن سے فائدہ اُٹھاتے وقت "خُذ ما صفا ودع ما کدر" والی ضرب المثل پر عمل کرسکتے ہیں۔

پردے کا سوال اس قدر نازک ہے۔ اور اس پر اس قدر بحث ہو چکی ہے۔ کہ ہم اُس
سوتے ہوئے فتنے کو بیدار کرنا نہیں چاہتے۔ علاوہ بریں اس مسئلہ کا ایک مذہبی پہلو
بھی ہے۔ جس پر ہمیں اپنے محدود علم کی وجہ سے رائے زنی کا کوئی حق حاصل نہیں۔ بلکہ
شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ پردے کے معاونین اسی مذہبی قلعہ کے اندر محصور ہو کر مامون
رہ سکتے ہیں۔ ورنہ عقلی دلائل کی ڈھال مخالفین کے تیروں کی تاب نہیں لاسکتی۔

مولوی صاحب بحث شروع کرنے سے پہلے کچھ نوتعلیم یافتہ لوگوں کے بھی منہہ
آتے ہیں۔ اور غضب یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے تنزل کا الزام ان بیچاروں کی گردن
پر رکھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ مسلمانوں کے تنزل کا سبب دینی بے پرواہی
ہے۔ کیونکہ دینی لاپرواہی اخلاقی خرابی کی محرک ہوتی ہے۔ اور اخلاقی خرابی تنزل
کا پیش خیمہ ہے۔ اس دعویٰ کو اگر غور سے پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بہت سی
غلط فہمیوں پر مبنی ہے جن کا رفع کرنا ہم ضروری خیال کرتے ہیں۔ اوّل تو مولوی صاحب
نوتعلیم یافتہ گروہ کو اسلامی دنیا میں اس قدر بڑھا ہوا رتبہ دیتے ہیں۔ جس کے وہ کسی
طرح مستحق نہیں ہیں۔ نوتعلیم یافتہ جماعت سے انکی مُراد غالباً ہندوستان کی نوتعلیم یافتہ
جماعت ہے۔ کیونکہ مولوی محمد حسن کو دیگر ممالکِ اسلامی کی نوتعلیم یافتہ جماعت سے کما حقہ
واقفیت نہیں ہو سکتی۔ اور جہاں تک ہمارے محدود علم کی رسائی ہے۔ وہاں تک ہم کہہ
سکتے ہیں کہ ہندوستان کی نوتعلیم یافتہ جماعت کی کسی دوسرے اسلامی ملک میں نہ
صرف کوئی نظیر ہی نہیں ملتی بلکہ اس سے مماثل جماعت کا وجود بھی عنقا ہے۔ کیونکہ وہاں

ابھی تک مذہب کا گوشہ تندرست ہے۔ اور ہر ایک آزادانہ خیال کے پھوٹتے
ہی بیخ کنی کر دی جاتی ہے۔ جسے مولوی محمد حسن دینی لاپرواہی کہتے ہیں۔ اس کی مثالیں
ہندوستان سے باہر بہت کم ملتی ہیں۔ خود مسٹر خالد خلیل کا روزنامچہ اس امر پر شاہد
ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسلامی ممالک میں ہر ایک مدعی اصلاح کو اپنے خیالات کو مذہب
کا جامہ پہنانا ضروری ہو جاتا ہے۔ جس کی شہادت ہمیں باب اور اس کے پیروؤں
میں مل سکتی ہے۔ اگر اختصار مدنظر نہ ہوتا تو ہم ثابت کر سکتے تھے کہ صرف ہندوستان
ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں موجودہ زمانے میں ایک ایسی جماعت کا وجود ممکن ہو سکتا
تھا۔ ان واقعات کو ذہن میں رکھ کے ہمارے ناظرین خود قیاس کر سکتے ہیں کہ
تعلیم یافتہ جماعت شمار و اثر کے لحاظ سے اسلامی دنیا میں لاشے محض ہے۔ خود مولوی صاحب
اس امر کے قائل ہیں کہ تعلیم یافتہ جماعت کے کسی فرد کا جمہور مسلمانان پر زمانہ حال میں
کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور ہماری بگڑی کو بنانے والے سب پرانے مکاتب کے تعلیم یافتہ
ہیں۔ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں کے تنزل کا بوجھ کیوں انکی گردن پر
رکھا جائے۔ اس جزئی بحث سے قطع نظر کر کے بھی ہم اس بات کے ماننے پر تیار نہیں
کہ دینی بے پرواہی اخلاقی خرابی کی محرک ہوتی ہے۔ گو اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ اخلاقی
خرابی تنزل کا پیش خیمہ ہے۔ گو ہم دینداری کو خود صفاتِ حسنہ میں سب سے رفیع تصور
کرتے ہیں۔ لیکن واقعات پر پردہ ڈالنا ہمارا شیوہ نہیں۔ تاریخ سے اس امر کی شہادت
ملتی ہے کہ مذہب کے علاوہ اور بھی بہت سی قوتیں مثلاً قانون یا حبِّ وطن انسان
کو دائرۂ اخلاق کے اندر رکھ سکتی ہیں۔ زمانہ حال میں اس کی ایک مثال جاپان ہماری
آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ انگریزی سوسائٹی اس وقت بامِ ترقی پر ہے لیکن
اس پر دین کا رنگ کسی صورت بھی ہماری سوسائٹی سے زیادہ چڑھا ہوا نہیں۔

انسان کو انسان بنانے والی طاقت دراصل سوسائٹی ہے۔ اور جب سوسائٹی

نے بزور زور نہ رہے۔ تب افراد اخلاقی خرابی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ مذہب بھی سوسائٹی کے شیرازے کو جمع رکھنے والی ایک طاقت ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ بڑی بھاری طاقت ہے لیکن افراد کے اخلاق کے ساتھ اس کا کوئی بلاواسطہ تعلق نہیں۔ اور بعض صورتوں میں اس کا اثر افراد کے اخلاق پر اس قدر کم ہوجاتا ہے۔ کہ اس کا تمیز کرنا دشوار ہوتا ہے۔ ہمیں اس میں بھی تامل ہے کہ آجکل کے مسلمانوں کے اخلاق زمانہ گذشتہ کے مسلمانوں کے اخلاق کی نسبت زیادہ خراب ہیں۔ اور اس لئے انکے تنزل کا باعث صرف اخلاقی خرابی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ مسلمانوں کے تنزل کے اسباب ڈھونڈھنے کے لئے ہمیں زیادہ عمیق نظر ڈالنی چاہئے۔ اور ان امراض کو ڈھونڈھنا چاہئے جو شروع سے خفیہ طور پر مسلمانوں کے اعضائے رئیسہ کو گھن کی طرح کھا رہے تھے لیکن جنہوں نے اپنا مہلک کام تیرہ سو سال کے بعد پورا کیا ہے۔ قرون اولیٰ کو چھوڑ کر جب کہ نئے مذہب کا جوش اور فتوحات کا نشہ مسلمانوں کو رو کی طرح بہائے لئے جاتا تھا۔ اور ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتا تھا۔ اگر ہم اور قرنوں پر غور سے نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا۔ کہ اخلاقی خرابیوں کا یہ داغ مسلمانوں کی سوسائٹی کے چہرے کو ہمیشہ بدنما بناتا رہا ہے۔ بلکہ شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مسلمانوں کی اخلاقی حالت (اگر ہم اس لفظ کے محدود معنی لیں) اس وقت آج سے پانچ چھ صدی پہلے کی نسبت بہت بہتر ہے لیکن کون نہیں جانتا کہ آج سے پانچ چھ صدی پہلے مسلمان معراج ترقی پر تھے۔ مولوی محمد حسن نے اپنے اس دعوے کے اثبات میں ایک اور بھی چونکا دینے والا خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ یہ کہ مغرب کی اعلیٰ تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہے۔ اگر اس کہنے سے انکا یہ منشا ہے کہ مغرب کی اعلیٰ تہذیب ان عالمگیر اصولوں پر مبنی ہے جن پر کہ تمام دنیا کی تہذیبیں مبنی رہی ہیں اور رہینگی۔ اور ازانجملہ اسلامی تہذیب بھی مبنی تھی۔ تو تو ہمیں اس قول کے تسلیم کرلینے سے کوئی انکار نہیں۔ ورنہ بصورت دیگر ہم مغربی تہذیب میں اسلامی تہذیب کی کوئی خاص جھلک نہیں پاتے۔ اور اس قسم کا دعویٰ ہر ایک مذہب کا پیرو اپنے مذہب کے حق میں کرسکتا ہے۔

مسلمانوں کی اس زمانہ کی حیرت انگیز ترقی سے کسی کو انکار نہیں۔ اول تو یہ کوئی دلیل ہی نہیں کہ چونکہ جس زمانے میں مسلمان برسر ترقی تھے۔ اس زمانے میں عورتوں کے مدارس نہ تھے اس لئے اس زمانے میں بھی عورتوں کے مدرس کو ترقی کا ایک ذریعہ تصور نہیں کرنا چاہئے۔ یہ دلیل بالکل ایسی ہی ہے جیسے کہ ہم کہیں کہ جس زمانے میں کونین دریافت نہیں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں بخار سے اموات کسی صورت زمانہ حال کی نسبت زیادہ نہ ہوتی تھیں۔ بلکہ اگر عامہ خلائق کے عقیدے کو درست مانا جائے تو اس زمانے کے لوگوں کی صحت آجکل کے لوگوں کی نسبت بدرجہا بہتر تھی۔ اس لئے کونین نے بنی نوع انسان کو کچھ فائدہ نہیں پہنچایا۔ اور اس کو بخار کا تریاق کہنا سراسر غلطی ہے۔ ہم یہ کب کہتے ہیں کہ ایک زنانہ مدارس ہی ترقی کا ذریعہ ہیں۔ یا کونین ہی بخار کا علاج ہے۔ ہمارا تو صرف یہ دعویٰ ہے کہ جیسے کونین بخار کے علاج کا ایک بہت موثر ذریعہ ہے۔ ویسے ہی زنانہ مدارس قومی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ ہیں لیکن شائد ہم غلطی پر ہیں ہمیں زنانہ مدارس کے بدلے تعلیم نسواں کہنا چاہیے تھا۔ اور مولوی محمد حسن کے جواب میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ چونکہ بہت سے غور و فکر کے بعد روئے زمین کے معقلوں نے مدارس کے طریقہ ہی کو اشاعت تعلیم کا بہترین طریقہ قرار دیا ہے۔ اس لئے تعلیم نسواں کے لئے زنانہ مدارس کا ہونا لابدی ہے۔ ہر ایک زمانے کا طریق عمل جدا گانہ ہوتا ہے۔ اندلس و مصر کا طریق عمل اس زمانے کی کوائف و حالات کے مطابق تھا لیکن اس زمانے کی کوائف و حالات اس امر کی مقتضی ہیں کہ مدارس قائم کئے جائیں اور لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو مغربی اصول پر تعلیم دیجائے۔

مولوی صاحب نے لڑکیوں کے لئے جو نصاب تعلیم تجویز کیا ہے وہ ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ ان جیسے تنگ خیالات کے شخص سے توقع ہو سکتی تھی۔ ہمارا منشا مضمون کی دانتا کلکل نہیں اس لئے ان کے نصاب سے تعرض نہیں کرتے۔ مگر ہم نہایت ادب سے سوال کرتے ہیں کہ انہیں انگریز عورتوں کی استعداد علمی پر حرف رکھنے

کی کیا ضرورت تھی۔ وہ فرماتے ہیں کہ انکا نصاب یورپین زنانہ مدارس کے نصاب کے
بالکل مطابق ہے۔ لیکن انہیں یہ موٹی سی بات نہ سوجھی۔ کہ انگریزی و اردو میں کیا آسمان و
زمین کا فرق ہے۔ جو شخص انگریزی جانتا ہے وہ تو گویا ایک امنڈتی خزانے کی کنجی اپنے
ہاتھ میں رکھتا ہے۔ برخلاف اس کے اردو دان کی مثال اس تشنہ کام کی ہے جو ہاتھ میں
دست خود کٹورہ لئے پانی کی تلاش میں پھرتا ہے۔ ہم اپنے علم ادب کی بے وقعتی کے نہیں
حامی بنتے۔ لیکن حق پسندی [illegible] انگریزی کے مقابلے میں اپنی زبان
و ادب کا ان الفاظ ہی میں تذکرہ کریں۔ علاوہ بریں موسیقی و مصوری جو یورپین زنانہ
مدارس کے نصاب تعلیم کا جزو اعظم ہیں۔ مولوی صاحب کے نصاب تعلیم سے بالکل خارج
کر دیئے گئے ہیں۔ غالباً یہ فروگذاشت سہواً نہیں کی۔ مولوی صاحب جیسے مقدس
بزرگ کے لیے ان مزخرفات کا تذکرہ کرنا کسر شان کا موجب تھا۔

"ترکوں کی معاشرت" کے دیباچے میں مصنف نے جگہ جگہ اپنے اقوال کی تائید
میں انگریز اہل الرائے کے اقوال نقل کئے ہیں۔ مگر ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ
ان میں سے اکثر اقوال ایسے لوگوں کے ہیں جنہیں ہم "اہل الرائے" ماننے پر تیار نہیں۔
ان اقوال کا بیشتر حصہ اخبارات کے "دلچسپ معلومات" کے کالموں سے مقتبس ہے جو رطب و
یابس کی بھرتی کے لئے ضرب المثل ہیں۔ بعض ان لوگوں کے خیالات ہیں جن کا دماغ عجیب
عجیب خیالات سے پُر رہتا ہے۔ اور جو صائب الرائے کے لوگوں کے لئے ہمیشہ مضحکہ
بنے رہتے ہیں۔ بعض چند مذہبی مصنفوں کی تحریروں کے جستہ جستہ فقرات ہیں۔
جنہیں اپنے مطلب کا پا کر سیاقِ عبارت کو ذہن میں رکھے بغیر لے لیا گیا ہے۔ اور اس
بات کی کوئی پتہ نہیں کہ مصنف نے یہ بات کیوں لکھی ہے۔ اور اس صاف گوئی سے
اس کا اصلی مدعا کیا ہے۔ اس آخری قسم کے اقتباسات کو دیکھ کر وہ مثل یاد آتی ہے کہ "میٹھا
میٹھا ہپ ہپ کڑوا کڑوا تھو تھو"۔ حسب منشا اقتباسات ڈھونڈھنے کوئی مشکل کام نہیں۔ اور

گر یہی کسی قول کی صداقت کا معیار ہی تو ہمارا دعویٰ ہی کہ ہم مولوی محمد حسن کے ہر ایک قول کی تردید میں اس سے زیادہ اقتباسات پیش کر سکتے ہیں۔ جتنے کہ انہوں نے اس کی تائید میں پیش کئے ہیں۔

آخر میں ہم اتنا اور کہنا چاہتے ہیں۔ کہ ہم مولوی صاحب موصوف سے بہت سے اہم معاملات میں متفق الرائے بھی ہیں۔ اور جس نیک نیتی سے انہوں نے ہر ایک معاملہ پہ بحث کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی داد دیتے ہیں۔ انکی غلطیاں زیادہ تر ان تعصبات پر مبنی ہیں جو ہمیشہ سے انکے خیالات میں جاگزین رہے ہیں۔ اور جن کے تصرف سے شاید ہی کوئی انسان بچا ہوا ہوتا ہے۔ ہماری مراد ان آراسے ہی جنہیں لارڈ بیکن نے (Idols) یعنی بتوں کے نام سے تعبیر کیا ہو جنہیں ہر ایک شخص اپنے صنم خانہ دل میں پالتا ہے۔ اور کم و بیش انکا مطیع ہوتا ہے۔ "ہندوں کی معاشرت" اور اسکا دیباچہ دونوں سلیس و صاف اُردو میں لکھے گئے ہیں۔ اور ہم مولوی محمد حسن کو انکے عمدہ اور پسندیدہ اسلوب پر مبارکباد دیتے ہیں جس خوبی سے مولوی صاحب نے انگریزی ترکیبوں کو ہندوستانی لباس پہنایا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ اصل کتاب کا حجم ۱۹۲ صفحہ اور دیباچے کا حجم ۴۴ صفحہ ہے۔ لکھائی چھپائی کی نفاست کی مطبع مفید عام آگرہ کا نام ٹائیٹل پیج پر ہونا کافی ضمانت ہی۔ کاغذ بھی اچھا ہے۔ اور سبز رنگ کا بیرونی ٹائیٹل پیج جس پر روپہلی نقوش ہیں۔ بالخصوص دلکش ہے۔ اور آرٹ پریس کلکتہ کے نفیس کام کی بخوبی شہادت دیتا ہے +

محمد سعید

عالم ہو تو اپنے علم کو عمل میں لاؤ۔ اور اس سے فائدہ اٹھاؤ +

جاہل ہو تو اپنی جہالت کا اعتراف کرو۔ کیونکہ کاٹھ کی ہنڈیا ایک ہی دفعہ چڑھے گی +

اگلے وقتوں کی وفاداری

(انیسویں صدی عیسوی کی ایک انگریزی خاتون کی آپ بیتی کہانی اُسی کی زبانی)

اب جو بڑھاپے میں میں اپنی عمر کے سترھویں سال کو یاد کرتی ہوں تو مجھ کو یاد آتا ہے کہ اُس وقت تک سوائے سیدھی سادی باتوں کے مجھ کو کسی چیز کی خبر نہ تھی۔ اور مجھ کو فطرت کے اُس حُسن میں جو جنگلوں اور پہاڑوں کے درمیان ہمارے مکان کے اردگرد کثرت سے موجود تھا کافی سرمایہ مسرت مل جایا کرتا تھا۔ اگرچہ اب میں ضعیف ہو گئی ہوں مگر میں بھولی نہیں اور جب تک میری آنکھیں آخری نیند سے بند نہ ہو جائینگی میں ہمیشہ اپنے تصور میں اپنے باپ دادا کا وُہ مکان دیکھتی رہونگی۔ میرے ایامِ شباب میں یہ مکان سبزہ زار کے ایک بلند قطعے پر واقع تھا۔ بہت سے درختوں کے پتوں میں سے اس کے سُرخ اینٹ کے بُرج اور محرابیں نظر آیا کرتی تھیں۔ اور اس کے صحن اور روشیں بھینی بھینی خوشبو والے پھُولوں سے آراستہ تھیں۔ امن سے زندگی بسر کرنے کے لئے اس سے زیادہ خوشنما مقام کوئی کیا ہوگا؟ اسی میں میں پیدا ہوئی اور اسی میں میں نے اپنی عُمر کا حصّہ نشو و نما ایسی خوشی سے بسر کیا جیسے سبزے میں کوئی پھُول ہو یا جیسے کوئی پرندہ ہو کہ گاتا ہے مگر نہیں جانتا کہ میرا دل شوقِ زمزمہ پیرائی سے کیوں پُر ہے۔ یہیں میرے بچپن کے دوست آیا کرتے تھے۔ اور ہمارے ملنسار پڑوسی جو میرے والدین کی اُنکی شریفانہ انسانیت اور ناموری کی وجہ سے عزت کرتے تھے ہم سے ملنے آیا کرتے تھے۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ میں جن چیزوں کو جانتی نہ تھی اُنکی آرزو کرتی یا اپنے وطن سے زیادہ خوشنما نظاروں کی تمنا کرتی۔

ہم شہروں سے بہت دُور رہتے تھے اور ہم کو دُور کے لوگوں کے حالات بھی

معلوم نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ ہم اپنے ہی معاملات میں مصروف رہتے تھے۔ جو غریب محتاج لوگ ہمارے دروازے آجاتے تھے ان کی ضرورتیں پوری کرنے میں اور جو بیمار اور بھوکے ہمارے پاس مدد اور آرام طلب کرنے کو آتے تھے۔ اُن کی خبر لینے میں ہمارا دن کٹ جاتا تھا۔ اور میرا تو یہ حال تھا کہ میں زندگی کی روشنی اور خوشی اور ماں باپ کی محبت کے سوا اور کسی چیز کا دھیان ہی نہ کرتی تھی۔ اور اگر کوئی خیال تھا تو یہ تھا۔ جو دکھیا اور بیکس لوگ مجھ جیسی دل کی اور جسم کی راحت سے محروم ہیں۔ اُنکی امداد کے لئے تیار ہوں۔

شاید بہت سے لوگ میری اس طرزِ زندگی کو بے رونق اور بے تفریح سمجھتے ہونگے مگر حقیقت اس کے خلاف تھی۔ میں بالکل خوش و خرم تھی۔ اور اپنے زمانے کی اُن دوشیزہ لڑکیوں پر بالکل رشک نہیں کرتی تھی۔ جو گاڑیوں میں سوار ہو کر لندن جایا کرتی تھیں اور عجیب عجیب چیزیں دیکھا کرتی تھیں۔ جنکو دیکھ کر وُہ حیرت زدہ ہوا کرتی تھیں۔ اگر وہ اپنے گھر پر ہی رہتیں تو میری عاجزانہ رائے میں تو زیادہ صبر و قناعت رکھتیں۔

کبھی کبھی کوئی ایسا امیر ہمارے ہاں ملنے آجایا کرتا تھا جس نے بڑے بڑے شہر دیکھے ہوتے تھے اور وہاں کے باشندوں سے بہت کچھ باتیں کی ہوتی تھیں۔ اور اس بدکاری کی بڑی دُنیا میں جو عام رواج معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کا ذکر مجھ کو نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتا تھا۔ میں نے تو کبھی اس دُنیا کو دیکھنے کی آرزو ہی نہیں کی۔

لیکن ان تمام باتوں کا اُس بات سے کچھ تعلق نہیں جو مجھ کو بیان کرنی ہے۔ کیونکہ بہترین زندگی دنیوی رسم و رواج کی زندگی نہیں ہے۔ میرے خیال میں عورت کے واسطے تو حقیقت میں ایک ہی زندگی ہے اور وُہ زندگی محبت ہے۔ کیونکہ جب کسی دوشیزہ کے دل میں محبت آتی ہے وُہ اُس وقت پہلے پہل زندگی میں داخل ہوتی ہے اور جب محبت چلی جاتی ہے زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اور وُہ اپنے آپ کا ایک ہمزاد رہ جاتی ہے اور گذرے ہوئے لُطف کی یاد میں اپنے دن کاٹتی ہے۔ اور اس امر کی گواہی میں دیتی ہوں۔ اسی لئے اب

میں طاقت گویائی رکھتی ہوں۔ میں اس عالی نفس اور با اخلاق شریف مرد کی اعلیٰ صفات اور بے نظیر نیکیوں کی شہادت دیتی ہوں جس کی وفا اور حمیت کی قدر میں مرتے دم تک کرتی رہونگی۔ وہ جس کے روبرو قبر کے دروازے سے گذر کر میں خالص وفاداری کے ساتھ حاضر ہونے کی امید کرتی ہوں۔

جب پہلے پہل برٹ تو موسم نہایت ہی پیارا تھا۔ پرنزکت آرچل لنڈر گر پر حسن تھی اریا تھا۔ سہ پہر کو دھوپ کھل آئی تھی اور پرندے گا رہے تھے کہ میرا باپ بہادر پرسی کو ہمراہ لئے شکار سے واپس آیا۔ اس وقت کی وہ تصویر اب تک بدستور میرے دھیان میں ہے۔ سجیلا جوان تھا۔ پیشانی فراخ اور بہادرانہ تھی جس سے موسم بہار کی روشنی منعکس ہو رہی تھی جب اس نے اپنے گھوڑے کی باگ تھامی تو نہایت خوشگوار تبسم کے ساتھ ہم کو سلام کیا۔

میرے باپ نے کہا "مارجوری۔ اپنی ماں کے پاس جاؤ اور کہو کہ یہ شریف زادہ کچھ دنوں ہمارے ہاں ٹھہر کر ہم کو اپنی میزبانی کی عزت بخشیگا۔ کتب خانے میں چاندی کی صراحی میں شراب اور اس کے ساتھ کے پیالے لے آؤ۔ اور تمہیں ہم کو شراب پلاؤ۔ ہم پیاس کے مارے بے اوسان ہو رہے ہیں اور تم چست و چالاک ہو۔" میں فوراً اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کے لئے گئی اور میرے باپ نے اپنے مہمان کو گھوڑے سے اتارا۔ ابھی نوکر گھوڑوں کو [illegible] صحن میں سے لئے جا رہے تھے کہ میں صراحی اور پیالے ایک خوان میں رکھ کر جھٹ پٹ کتب خانے میں جا پہنچی اور اپنے باپ اور شریف پرسی کی خدمت کے لئے ان کے حکم کی منتظر کھڑی ہو گئی۔ پرسی بولا "حسین مارجوری۔ تمہارا نام مارجوری ہے نہ؟ اگر تمہاری پیاری مرضی ہو تو مجھ کو اجازت دو کہ میں تم کو تمہارے بوجھ سے سبکدوش کر دوں"۔ اور کورنش کر کے اس نے وہ خوان میرے ہاتھ سے لیا اور میز پر رکھدیا۔ پھر ایک نہایت شگفتہ تبسم کے ساتھ جو ہمیشہ کے لئے مجھے یاد ہے۔ میرے باپ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "سر ریجی نالڈ۔ اگر آپ کی بیٹی ہماری یہ گستاخی معاف کرے تو آؤ ہم اس کا جام صحت پیتے ہیں"۔ میرے باپ نے

جواب دینا ضرور۔ بلکہ اس لڑکی کو تو اس عزت پر ناز کرنا چاہیئے۔ آؤ مارجوری آجاؤ۔ جارج کو کسی اَور موقع کے لئے رہنے دو۔ اچھا جارج پرسی اب جام صحت"۔ پرسی نہایت رنگیلے پن سے بولا "مارجوری لزلی کا جام صحت! جو عورتوں میں سب سے حسین ہے"۔ اور میری طرف دیکھ کر اس قدر لطف آمیز التفات سے مجھ کو سلام کیا کہ میں کھسیانی سی ہو گئی۔ اور یہی غنیمت سمجھا کہ اس کمرے سے چلی جاؤں۔ میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مگر جلد ہی میری ماں نے مجھ کو بلا بھیجا اور مہمان کے آرام کے متعلق کل انتظام میرے سپرد کئے۔ میں نے نہایت احتیاط اور سرعت کے ساتھ یہ سب انتظام کر دیئے۔

تعجب یہ ہے کہ پرسی کا موجود ہونا میرے دل کے چین اور راحت کے لئے روز بروز زیادہ ہی زیادہ ضروری ہوتا چلا گیا۔ حالانکہ میں اور میری ماں اُس سے بہت کم ملتے تھے۔ کیونکہ دن بھر وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ادھر اُدھر پھرتا رہتا تھا۔ گویا کسی ضروری کام میں مصروف ہے۔ اور جب شام کو واپس آتا تھا تو وہ اکثر اوقات میرے باپ کے ساتھ کتب خانے میں دروازے بند کر کے باتیں کرتا رہتا تھا۔ میری ماں نے ایک دفعہ مجھ سے کہا "میرا خیال یہ ہے کہ یہ شخص بادشاہ کی طرف سے کوئی خفیہ خدمت انجام دے رہا ہے"۔ یہ سُنکر میرے جسم کا خون آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونے لگا۔ اور کچھ دیر تک میں اس طرح کھڑی رہی جس طرح کوئی یکایک گونگا ہو جائے۔ کیونکہ اگرچہ دیہات کے اس الگ تھلگ حصے میں جس میں ہم رہتے تھے کچھ بہت شورش نہیں ہوئی تھی لیکن سلطنت کی خانہ جنگی کی افواہیں ہم کو بھی پہنچ چکی تھیں۔ اور یہ سُنکر ہم کو سخت رنج ہوا تھا کہ حضرت اقدس شاہ چارلز کے تعاقب میں اُس کے باغی دشمن جگہ جگہ اس طرح پھرتے ہیں جس طرح کسی ہرن کے پیچھے شکاری پھرتا ہو۔ میرا باپ جو بادشاہ کا وفادار خیر خواہ تھا اکثر دُعا کیا کرتا تھا کہ بادشاہ کبھی میرے غریب خانے کو بھی عزت بخشیں تاکہ اگر ضرورت ہو تو میں اُس کا پُشت و پناہ بنوں اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بذاتِ خود اُنکی حفاظت کروں۔ اپنے

باپ کی اس بہادرانہ خیر خواہی کی مَیں بہت تعظیم کرتی تھی۔ لیکن میں وُہ آرزو بادشاہ کی نسبت نہیں کرتی تھی جو میرا باپ کرتا تھا کیونکہ مَیں کمزور اور ڈرپوک طبیعت والی ہُوں اور امن کے آرام کو پسند کرتی ہُوں۔ اِسی لئے جب میری ماں نے کہا کہ میری رائے میں یہ شخص بادشاہ کی کوئی خفیہ خدمت انجام دے رہا ہو تو مَیں خوف کے مارے حیرت زدہ سی ہوگئی۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ خفیہ خدمت میں خطرہ اور بسا اوقات موت تک کا احتمال ہوتا ہی۔ اِس بات کے بعد میں پرسی کو پہلے سے زیادہ شوق کے ساتھ دیکھنے لگی۔ اور جب مَیں اُس سے بات کیا کرتی تھی تو میری آواز کانپ جاتی تھی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ میں نے دیکھا بھی نہیں اور وُہ میرے پاس آکھڑا ہُوا۔ وُہ بولا حسین مارجوری تمہیں کوئی تکلیف ہی؟ تمہارے رُخسارے پہلے کی نسبت زرد ہو گئے۔ اور تمہاری آواز میں وُہ پہلی سی مسرت نہیں رہی۔ مہربان خاتون۔ مجھ کو بتاؤ تو۔ اگرچہ مَیں کسی قابل نہیں لیکن کہیں مَیں نے ہی تو تم کو آزردہ نہیں کر دیا۔ اگر مجھ سے نادانستہ کوئی تصور ہو گیا ہو تو مَیں پُوری پُوری تلافی کرنے کو تیار ہُوں۔ ذرا مسکراؤ اور مجھ سے کہدو کہ تمہارے جانے سے پہلے ہم نے تم کو معاف کیا" مَیں نے کہا "ہائے افسوس۔ آپ اپنے چلے جانے کا ذکر کرتے ہیں؟" اس سے زیادہ مَیں کچھ نہ کہ سکی۔ میرا دل ایک عجب قسم کے بوجھ سے دب گیا۔ اُس نے ایک گونہ فخر کے ساتھ اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا اور اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ بولا "ہاں میں اپنے جانے کا ذکر کرتا ہوں۔ اور تم جو ایک شریف لڑکی ہو۔ میرے جانے کو مُبارک سمجھو گی۔ کہو خُدا حافظ و ناصر! حسین مارجوری کل شب کو بادشاہ پاس کے جنگل میں سے گذریگا۔ اور مَیں اور چند چیدہ چیدہ سوار جائیں گے اور بادشاہ کے ساتھ ہو کر اُس کو سب سے نزدیک بندرگاہ تک پہنچا دینگے"۔ اس کے بعد اُس کی آواز یکایک دھیمی ہوگئی۔ بولا "تم سے رخصت ہونے سے پیشتر مَیں تم سے ایک ایسی بات کا ذکر کرنا چاہتا تھا جس کا مجھ سے بہت ہی گہرا تعلق ہے۔ مگر کیا کروں بہت خطرناک کام پر جا رہا ہُوں۔ ساتھ ہی مجھ کو تمہاری آزردگی کا

بھی خوف ہر۔ہیں ! آنسو بہاتی ہو؟ پیاری ! تم روتی ہو؟ اور اس رونے کا باعث میں ہُوں ؟"

واقعی آنسو میرے بس میں نہ رہے اور ٹپ ٹپ بہنے لگے۔ لیکن باہر کے زینے میں اپنے باپ کی آہٹ سُنکر میں سخت شرمندہ ہوکر اُٹھی۔ میں یہ بھی نہ جانتی تھی کہ میں یہ کیا کر رہی ہوں اور جلدی سے اُس کمرے سے نکل کر ایک دوسرے کمرے میں جا چھپی۔ اور دیر تک روتی رہی۔ تنہائی میں دیر تک میں صبر او تسلیم کے لئے دُعا کرتی رہی۔ روتے روتے جو میں نے آنکھیں اُٹھائیں تو جناب مسیحؑ اور صلیب کی تصویر پر نگاہ پڑی اور اس باوصف غمزدہ چہرے پر مجھ کو ایک تبسم نظر آیا۔ یہ چند لفظ جو میں نے کسی زمانے میں پڑھے تھے مجھ کو یاد آئے۔ "جو کوئی محبت کرتا ہے اُس کو اپنے محبوب کے لئے تمام سختیوں اور تلخیوں سے گلے ملنا پڑتا ہے"۔ اس فقرے کو اپنی تسکینِ خاطر کے لئے میں نے بارہا دُہرایا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اُٹھی۔ دل میں ایک عجیب سکون تھا مگر ایک حیرانی بھی تھی۔

اتنے میں ایک لڑکا آیا اور ایک سر بمُہر لفافہ مجھ کو دیا۔ اور خاموشی کی ہدائیت کے طور پر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر فوراً چل دیا اور میں اُس سے کچھ پُوچھ بھی نہ سکی۔ میں نے لفافہ کھولا۔ خط میں یہ لکھا تھا۔ "یہ خط مارجوری لزلی کے حسین ہاتھوں کے لئے ہے۔ التجا یہ ہے کہ وہ اُس شخص کے حال پر رحم کھائے جو شاید عنقریب اُس کے چہرے کے نُور سے ہمیشہ کے لئے ہی محروم ہو جائے۔ اور آج شب کو جب سر ریجی نالڈ اور اُنکی بیوی سو جائیں تو بڑے کمرے کے مشرقی حصّے میں اُس جگہ آجائے جہاں ندہ لٹکی ہُوئی ہے۔ تاکہ میں وفا شعار عاشقوں کے دستور کے مطابق اُس سے رُخصت ہولوں

جارج پرسی"۔

کسی اور حالت میں اگر اس قسم کا کوئی خط میرے پاس آتا تو میں سہم جاتی۔ کیونکہ اس طرح چھپ چھپ کر کسی سے ملنا میرے کنوارپن کے خیالات کے بالکل خلاف تھا۔ لیکن جب

میں نے غور کیا کہ واقعی شاید پھر مجھ کو بہادر پرسی کو دیکھنا کبھی نصیب ہی نہ ہو۔ تو میری عقل میری محبت سے مغلوب ہو گئی۔ اور میری روح کو نہایت مسرت ہوئی کہ ایک ایسے بہادر شریف آدمی نے اپنے آپ کو میرا عاشق بیان کیا ہے۔ نہایت بیتابی کے ساتھ میں نے شام کی وہ گھڑیاں گن گن کر کاٹیں۔ آخر گھر کے سب لوگوں کے سونے کا وقت آیا۔ اُس وقت میری ماں نے کہا "ماجوری تم کو نیند اچھی طرح بھی آتی ہے؟ یا تم کو کوئی ایسا مرض ہے جس کا تم ذکر نہیں کرتیں؟ تمہارے رخسارے بخار والوں کے سے ہو رہے ہیں آنکھیں ایسی چمکتی ہیں کہ تندرستی میں نہیں چمکتیں۔ تم مجھ سے اپنی تکلیف کو چھپاتی ہو؟ مجھ سے بڑھ کر تمہارا دوست کون ہے؟ اس پر مجھ کو سخت رنج ہوا اور بڑی شرم آئی کیونکہ اپنی زندگی میں پہلی دفعہ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی ماں سے آنکھ نہیں ملا سکتی۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا صرف یہی کہا۔ "نہیں امّاں جان میری طرف سے آپ فکر نہ کریں مجھ کو نیند اچھی طرح آتی ہے اور کوئی تکلیف نہیں"۔ اس پر میری ماں نے ایک آہ کی اور خاموش ہو رہی۔

جب میری ماں چلی گئی تو میں اپنی خوابگاہ میں گئی۔ مجھ کو سخت ندامت ہوئی۔ کہ ہائے یہ کس قدر بیرحمی کی بات ہے کہ میں صرف چند ہفتے میں ایک اجنبی آدمی کو اپنی پیاری ماں سے بھی زیادہ چاہنے لگ گئی۔ اسی افسوس اور حیرت میں اپنی ماں کے کمرے کے دروازے کے آگے ذرا ٹھہری اور کواڑوں کو چومنے لگی اور رو رو کر دل ہی دل میں اپنی ماں سے معافی مانگنے لگی۔ مگر میں اپنے ارادے سے باز نہ آئی۔ میرا دل بہت دھڑک رہا تھا اور میں اپنے کمرے میں بیٹھی کان لگائے سن رہی تھی کہ زینے پر میرے باپ کے پاؤں کی آہٹ کب سنائی دیتی ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنی خوابگاہ کو جا رہے ہیں۔ آخر کار آہٹ سنائی دی۔ اور خوابگاہ کے دروازے کے کھولنے اور بند کرنے کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر اور ٹھہر کر میں اپنے کمرے سے روانہ ہوئی۔ میں سفید رنگ کے

نرم اور بے آواز کپڑے پہنتے ہوئے چپکے چپکے تاریک راستوں سے ہوتی ہوئی مشرقی کمرے میں پہنچی۔ منقش کھڑکیوں میں سے چاندنی کی شعاعیں چمکتی تھیں۔ اور ان شعاعوں سے اُس پُرانی زرہ پر جو وہاں لٹکی ہوئی تھی۔ عجب قسم کے سائے پڑتے تھے۔ بہادر پری کی بانکی صورت سامنے دکھائی دی۔ اور جب میں اس کے قریب پہنچی تو وہ فوراً ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ بولا "شریف مارجوری تم پری ہو۔ رحم اور فرشتوں کی برکت ہو۔ تم نے مجھ پر بڑی مہربانی کی۔ میں تو تم سے اس طرح باتیں کرتا ہوں جس طرح کوئی بستر مرگ پر پڑا ہوا اپنے محبوب سے باتیں کرتا ہے۔ تم جان گئی ہو گی کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ تم نے میری نگاہوں میں میرے اقبالِ جرمِ محبت کو پڑھ لیا ہو اور افسوس کہ تم ناراض ہو گئیں۔ لیکن میں ساری حقیقت تم سے کہتا ہوں۔ خدا کی مرضی یہ ہے کہ محبت اور موت میری زندگی پر آپس میں جھگڑیں۔ اور یاس آہ! جو سب چیزوں سے بڑھکر ہے مجھ کو قبر کی طرف بُلاتا ہے۔ حالانکہ محبت مجھ کو تمہاری! خوشی کی طرف پُکارتی ہو۔ مارجوری میں تم پر مرتا ہوں۔ اپنے باوفا دل کی ساری طاقت اور صداقت کے ساتھ تم پر نثار ہوں۔ مگر تم سے کہتا ہوں کہ مجھ سے نفرت کرو اور مجھ کو بھول جاؤ اور معاف کر دو۔ پھر اُس نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیکر چوما۔ اور کہا۔ "خدا کرے تم کو مجھ سے محبت نہ ہو! لیکن مجھ کو بتاؤ تم کو مجھ سے محبت ہو یا نہیں۔ تاکہ میں اپنی زندگی کی قدر و قیمت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکوں"۔ اس پر میں نے یہ خیال کر کے کہ موت محبت کی طاقت کے آگے کیا ٹھہر سکتی ہے۔ دل مضبوط کر کے خوشی کے لہجے میں کہا۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ دل اور جان سے تم پر فدا ہوں اور میں التجا کرتی ہوں کہ میری خاطر سے اپنی پیاری جان کی حفاظت کرو۔" اس کے بعد دل بے قابو ہو گیا اور میں زار زار رونے لگی وہ بولا "میری پیاری! میری زندگی! یہ کہکر اُس نے میرے گلے میں باہیں ڈالدیں اور میرے ہونٹوں اور آنکھوں کو

چوما اور زور کے ساتھ گلے لگا لیا۔ میں نے خیال کیا "اگر ہم دونوں کی موت اس وقت آجائے تو کیا مبارک ہو ہم کبھی جُدا ہی نہ ہوں"! ہم دیر تک خاموش ایک دوسرے کے گلے سے لگے رہے۔ آخر میرا عاشق بولا "میری پیاری تمہاری وجہ سے میں کل شب کو اپنی جان کی دوہری حفاظت کرونگا۔ اور اگر خدا کو منظور ہو تو خیریت ہی رہیگی۔ افواہ یہ ہے کہ باغیوں نے جنگل میں ایک کمین گاہ بنا رکھی ہو اور ہم پر یکایک حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ مجھ کو خوف بالکل نہیں۔ میرے ساتھ بھی بہت سے آدمی ہونگے اور اگر مقابلہ ہو گیا تو بلاشبہہ ہم فتح پائینگے۔ لیکن میری مارجوری تم کو معلوم بھی ہو تم نے کیا کیا ہو؟ تم نے ایک لقمۂ اجل سے پیمانِ محبت کیا ہو۔ خدا جانے یہ بات تم نے اچھی کی ہو یا بُری"۔
میرے دل میں یکایک اُمید اور ہمت آ گئی اور میں نے مسکرا کر کہا "نہیں میرے پیارے موت کا خطرہ تو ہم سبھی کو ہے۔ مگر موت تم کو تمہاری پیاری سے ایسی جلدی نہیں چھین سکتی۔ اگر خدا کو منظور ہے تو میں تمہاری واپسی پر بڑے فخر کے ساتھ تمہارا خیر مقدم کرونگی"۔ اُس نے سنجیدگی سے کہا "خدا ایسا ہی کرے۔ میری پیاری کیا تم مجھ سے وفا کروگی ممکن ہے کہ میں کئی ہفتے تک تم سے جُدا رہوں۔ تم اپنے عہدِ محبت پر پچھتاؤگی تو نہیں؟ تم اپنے دل میں میری یاد کو جگہ دوگی"! میں نے کہا "ہمیشہ کے لئے! مجھ پر بدگمانی مت کرو۔ میں ہمیشہ زندگی بھر اور موت کے بعد بھی تم سے محبت اور وفا کرونگی۔ میں تم سے وفا کا حلف کرتی ہوں"۔ وہ بولا "اور میں تم سے محبت اور وفا کا حلف کرتا ہوں۔ خدا سُن رہا ہے۔ میں اپنی روح کی رُو سے تمہارا شوہر ہوں اور تم میری بیوی ہو۔ خدا ہم دونوں کی حفاظت کرے اور اپنی مشیت پوری کرے۔ میری مارجوری رخصت سے پہلے مجھ کو دُعا دو اور اپنی خوشی سے میرے ہونٹوں کو بوسہ دو"۔ میں نے اُس کو چوما اور دُعا دی اور بڑے غم کی حالت میں اُس سے لپٹی رہی۔ اُس نے مجھ کو خدا کے حوالے کیا اور میرے ساتھ ساتھ زینے سے اُترا۔ نیچے پہنچکر اُس نے دوبارہ مجھ کو گلے سے

لگا۔ اور کہا "میری مار جوری کل شب کو اس وقت سے پہلے تم کو میرے ارادہ جنگ کا نتیجہ معلوم ہو جائیگا۔ اگر کامیاب ہوا تو میرا قاصد تمہارے پاس خبر لائیگا۔ اور اگر ناکامیاب رہا تو میں خود ہی تمہارے پاس آجاؤنگا۔ اور کچھ نہ پوچھو۔ میری پیاری میری جان خدا حافظ"! اس کے بعد گویا وہ میرے پاس موجود رہنا مصلحت نہ سمجھتا تھا۔ وہ فوراً لوٹا اور تاریک راستوں میں غایب ہو گیا۔ میں جلدی سے گھبرائی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی وہاں پہنچکر اول میں نے خدا کا شکر کیا کہ اس وفا شعار اور عالی خاندان شریف کی محبت مجھکو نصیب ہوئی۔ اور پھر اس کی جان کی سلامتی کی دعا کی۔ وہ رات بہت بے چینی میں کٹی۔ پریشان خواب اور خیالات آتے رہے۔ اور صبح کو میرا چہرہ زرد اور بھاری نظر آنے لگا۔ جب میں ناشتہ کھانے گئی تو میں نے اپنی ماں کو روتے پایا۔ میں نے خوفزدہ ہو کر اس سے رونے کا سبب پوچھا۔ وہ بولی "بچی کیا بتاؤں۔ تمہارا باپ ایسانڈ کہتھ صیار باندھ کر پرسی کے ساتھ گیا ہے اور آج شب کو بادشاہ کو جنگل میں سے لیجا ئیگا میں خوب سمجھتی تھی کہ ان دونوں کا چھپ چھپ کر مشورے کرنا خالی از علت نہیں مجھ کو یہ گمان نہ تھا کہ تمہارا باپ بدیں پیرانہ سالی مجھ کو اور تم کو یوں چھوڑ جائیگا ہم سے ملکر بھی نہ جائیگا اور صرف یہ پرچہ لکھ کر چھوڑ جائیگا"۔ اور میری ماں نے روتے روتے ایک پرچہ دیا جس میں یہ لکھا تھا "نیک بی بی۔ مجھ کو الزام نہ دینا کہ تم سے رخصت بغیر چلا گیا۔ کیونکہ میں ہزار مسلح باغیوں سے بھی اس قدر نہیں ڈرتا جس قدر تمہارے سے ڈرتا ہوں۔ بادشاہ کی حفاظت ضروری ہے اور میں اس ضروری کام میں پرسی کا ساتھ دینے کے لئے جاتا ہوں۔ اگرچہ پرسی تو مجھ کو یہیں چھوڑ جانا چاہتا تھا۔ لڑکی کو میرا پیار کرنا۔ اور میرے سلامت واپس آنے کی دعا کرنا۔ اگر خیریت رہی تو آج آدھی رات تک ہم واپس آجائینگے۔ ہمارا فرض صرف اس قدر ہے کہ بادشاہ کو جنگل کی سرحد سے پار کر دیں۔ خدا حافظ"۔ جب میں نے اپنی ماں کے آنسو دیکھے تو میرا دل اس بدفالی سے دب

میں نے مقدور بھر اپنی ماں کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ اس کو کیا خبر تھی کہ میرے دل میں کونسا چور تھا۔ اگرچہ میں دل سے اپنے باپ کی سلامتی چاہتی تھی لیکن میری بہترین دعائیں اور آرزوئیں اپنے عاشق کے لئے تھیں۔ میں بادشاہ سے بھی نفرت سی کرنے لگی۔ میں کہتی تھی کہ بادشاہ تو آخر ایک ہی آدمی ہے۔ اور دوسروں سے کوئی ایسا زیادہ نیک اور بہتر بھی نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے اتنے بہادر شریف آدمیوں کا خون کیوں بہے۔ شاید یہ خیال باغیانہ ہو لیکن دکھیا بیوی میں اور غمزدہ یتیم شہادت دے سکتے ہیں کہ مرحوم بادشاہ چارلز کی بدولت لوگوں کو خوشی کم پہنچی اور غم زیادہ۔

میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ دن کیونکر کٹا۔ میری ماں بہت کم بولتی تھی اور بار بار ٹھنڈے سانس بھرتی تھی۔ بار بار کھڑکی میں سے جھانکتی تھی۔ اور خدا جانے ہم دونوں کس چیز کی راہ تکتے تھے۔ دن آہستہ آہستہ کٹا اور بڑی مشکلوں سے شام ہوئی۔ نوکروں نے کھانا میز پر چنا۔ ہم نے کھانے کی کوشش کی مگر کچھ کھایا نہ گیا۔ جب کھانا بڑھایا گیا تو ہم پھر کھڑکی کے پاس آ بیٹھے اور پھر راہ تکنے لگے۔

نہایت سنسان رات تھی۔ جب دالان میں گھنٹے نے گیارہ بجائے تو ہم دونوں چونک اٹھے۔ میری ماں اٹھ کر میرے پاس آئی اور اپنا ہاتھ میری گردن پر رکھا۔ ہاتھ ایسا ٹھنڈا تھا کہ میں اس کے چھونے سے کانپ گئی۔ وہ بولی "مارجری کب تم خیال کرتی ہو کہ وہ خیریت سے واپس آجائینگے؟" مجھ کو اپنی ماں پر بڑا ترس آیا۔ اس کی آواز کمزور تھی اور چہرے پر مردنی سی چھا رہی تھی۔ میں نے بشاشت سے بولنے کی کوشش کی اور کہا۔ "پیاری اماں جان تھوڑی دیر میں ہم صحن میں گھوڑوں کے سموں کی آہٹ سنیں گے۔ اور تب یہ معلوم ہوگا کہ ہمارا خوف بیجا تھا۔ خدا کے لئے اس قدر اترا ہوا چہرہ تو نہ بناؤ نہیں تو ابا جان دیکھ کر ہراساں ہو جائینگے۔ تم کو بشاش اور دلیرانہ صورت بنانی چاہئے۔ تم ایک بہادر سپاہی کی بیوی ہو۔" وہ بولی "میری مارجری تم کیسی دلیر ہو؟ لیکن

تم کو بے خوف ہونا آسان ہے تم نے کبھی دل نہیں لگایا۔" میں یہ سنکر کانپ اٹھی لیکن کچھ نہ بولی اس کے بعد دیر تک ہم نے نہ بات کی نہ حرکت کی۔ اتنے میں صحن میں ایک گھوڑے کی تیزی کے ساتھ داخل ہونے کی آہٹ سُنائی دی اور میں اور میری ماں تڑپ کر باہر نکل گئے۔ میرا باپ نہایت بے صبری کے ساتھ زور سے پکارا" کوئی ہے! نوکروں کو ادھر بھیجو۔ ہم نے باغیوں کو مار بھگایا لیکن بہادر پرسی یہاں سے ایک میل پر زخمی اور جاں بلب پڑا ہے۔ اُس کو یہاں لانا ہے۔ ہیں! مارجوری! مارجوری"! میں نے دوڑ کر اُس کے گھوڑے کی باگ پکڑلی تھی اور خدا جانے کن الفاظ میں اُس سے التجا کر رہی تھی کہ مجھ کو ساتھ لے چلو۔ وہ بولا "تمہیں گھوڑا پاؤں سے کچل ڈالیگا۔ لڑکی تم پاگل ہوگئی ہو۔ بی بی! مارجوری! خدا کی پناہ! یہ لڑکی دیوانی تو نہیں ہوگئی؟ میں نے چلا کر کہا" ابا جان خدا کے لئے مجھ کو ساتھ لے چلو۔ میں ساتھ چلوں گی۔ ضرور چلوں گی۔" میری ماں روتی ہوئی اور حیرت زدہ ہو کر آئی۔ اُس سے میں نے مایوسانہ سکون کے ساتھ کہا" اما جان خدا کے لئے میری بات سُنو۔ میں جارج پرسی کی منسوبہ دلہن ہوں۔ مجھ کو اس کے آخری الفاظ سے محروم نہ رکھو۔" میرا باپ وحشت زدہ نگاہ سے مجھ کو دیکھنے لگا اور بولا" اگر خدا کے نزدیک یہ بات سچ ہے تو میں تم کو لے جاؤنگا۔ لیکن میں ایسی عجیب داستان کا یقین کیونکر کروں" میں نے کہا" آپ خوب جانتے ہیں کہ میں نے کبھی آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بولا۔ باتوں میں وقت ضائع نہ کیجئے اور مجھے لے چلئے"۔ میں نے اپنی تمام طاقت کے ساتھ زین تک پہنچنے کی کوشش کی۔ میری ماں رو کر مجھ سے لپٹ گئی۔ لیکن میں اُس کی ایک نہیں سنتی تھی۔ میرے باپ نے مجھ کو اپنے آگے سوار کرلیا۔ میں خواب کے سے عالم میں تھی۔ نوکروں کو ساتھ لیکر ہم روانہ ہوئے اور میں نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ میرے سر پر چادر تک نہ تھی۔ ایک دفعہ شاید میرے باپ نے مجھ کو پیار کیا۔ اور میرے پریشان بال درست کرنے کی کوشش کی مگر یہ بات مجھ کو ایک خواب سا معلوم ہوئی۔ مجھ کو تو ایک ہی خیال تھا

کہ میرا عاشق میرا منسوب شیو ہر جان بلب پڑا ہے اور شاید ہی ہم وقت پر پہنچ سکیں۔ ہم گھوڑے مارے
چلے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ میرے باپ نے یکایک باگ روکی اور کہا ٹھہرو۔ گھوڑے سے اتر کر
اس نے مجھ کو زین سے اُتارا۔ اور نوکروں کو جمع کیا۔ ایک نوکر کو گھوڑوں کی حفاظت کیلئے
چھوڑا۔ اور ہم سب درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف گئے۔ درختوں کے پتوں میں سے نرم
نرم چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ یہاں سبزہ زار پر بہادر ترسی پڑا تھا جب میں دوڑ کر اُس کے
پاس پہنچی تو چاندنی میں میں نے دیکھا کہ اس کے بائیں کوٹ میں اس کا خون ٹپک رہا ہے اس جگہ
بیچ رہا تھا جہاں پہلی شب کو میرا سر رکھا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے کو زرد اور خاموش دیکھ کر
میرا دل غم سے ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے اس کا منہہ چوما۔ اُس کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تو
دل بے حرکت تھا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو میرا باپ اور نوکر ننگے سر کئے سر جھکائے کھڑے
تھے گویا دُعا کر رہے ہیں۔ میں بولی "نہیں! یہ مرا نہیں۔ ابا جان یہ مر نہیں سکتا۔ آپ
کوئی دوا لائے ہیں؟ آپ تو ایسے چپ چاپ کھڑے ہیں کہ گویا کوئی تدبیر یا چارہ باقی ہی نہیں۔ یا
اس کے سر کو اُٹھاؤ۔ ترسی۔ میرے پیارے! میری جان!" یہ کہکر میں اُس سے لپٹ
گئی۔ اور بولی "مارجوری سے بولو۔ خدا کے لئے مجھ سے بولو۔" اس کے بعد سناٹا ہو گیا۔
میں نے اُوپر نظر کی تو دیکھا کہ سرد مہر ستارے بے دردی کے ساتھ میری جان کی زرد اس
چہرے کی طرف دیکھ رہے ہیں جو مسکراتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اب مجھ کو ایسا محسوس ہوا۔
کہ گویا میرے گلے کو کسی نے گھونٹ دیا اور میرے کانوں میں سمندر کی طغیانی کا سا شور
ہونے لگا۔ میری نظروں میں دُنیا اندھیر ہو گئی۔ تمام بدن بیجان سا ہو گیا اور میں غش
کھا کر گر پڑی مجھ کو کچھ معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ جب اس کے بعد مجھ کو ہوش آیا۔
تو میں گھر پر اپنے کمرے میں تھی۔ میرے پلنگ کے پاس میری ماں بیٹھی تھی۔ اور میں بولی
تو وہ بولی۔ ہوش کے ساتھ مجھ کو اپنی مصیبت اور تنہائی کا خیال بھی آیا۔ اور میں نے رو کر
پوچھا "ترسی کو کہاں دفن کیا؟" میری ماں نے کہا "ذرا خاموش ہو جانا صبر کرو۔ میرا خیال کرو

بچی! اپنی جان کو میری خاطر سے بچاؤ۔" اس کی تسکین کے لئے مَیں نے کہا "ہاں بیشک لیکن یہ تو بتا دو اس کو کہاں دفن کیا؟" میری ماں نے نرمی سے کہا "ایک ہی دن تو ہوا ہے کہ اسکو یہاں لائے تھے۔ مشرقی کمرے میں اُس کی لاش تجہیز و تکفین کے لئے تیار رکھی ہے۔" مَیں خاموش ہوگئی۔ مَیں نے سوچا کہ مشرقی کمرے میں میری منگنی ہوئی تھی۔ وہیں میری شادی ہونی چاہئے۔ مَیں نے دل میں اُسی وقت ٹھان لیا کہ کیا کرنا چاہئے۔ لیکن اپنے ارادے کو پورا کرنے کے لئے مَیں نے نیند کا بہانہ کیا اور اپنی ماں سے یہ کہکر کہ مَیں سوتی ہوں۔ بے حرکت لیٹی رہی۔ آخر خدا خدا کرکے شام ہوئی۔ غروبِ آفتاب کے بعد میری ماں میرے پاس کھانا اور شراب لائی۔ مَیں نے کچھ کھایا پیا اور اس سے میری ماں کو تسکین اور خوشی ہوئی۔ تب مَیں نے کہا "اماں جان! آپ مجھ کو تنہا چھوڑ دیں اور خود آرام کریں۔ جب مَیں جانوں گی کہ آپ بھی آرام میں ہیں تو مجھ کو بہتر نیند آئیگی۔ آپ رات بھر فکر اور تکلیف میں رہینگی تو مجھ کو بھی چین نہیں آئیگا۔ آپ جائیے مَیں خُدا سے صبر کے لئے دُعا مانگوں گی اور انشاءاللہ کل کو اچھی ہوجاؤنگی۔" میری ماں نے رو کر مجھ کو پیار کیا اور چلی گئی۔

اِس کے بعد مَیں دُعا مانگتی رہی۔ آخر گھر کے سب لوگ سو گئے۔ اور تمام گھر میں سناٹا ہوگیا۔ مَیں پلنگ سے اُٹھی مگر میرا جسم اِس قدر کمزور ہوگیا تھا کہ بڑی مشکل سے مَیں نے وُہ سفید لباس پہنا جسکو پہنکر مَیں نے اپنے عاشق سے پیمانِ محبت کیا تھا۔ ایک ہیرے کی انگوٹھی جو میرا سب سے بیش قیمت زیور تھا مَیں نے اپنی انگلی میں پہنی۔ آہستہ سے مَیں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور ایک مُردے کے ساتھ شادی کرنے کے لئے روانہ ہوئی۔

مشرقی کمرے میں پہنچکر مَیں نے دائیں بائیں بالکل نہ دیکھا سیدھی اُس جگہ پہنچی جہاں بہادر پیری کی نعش رکھی تھی۔ وُہ اُسی لباس میں تھا جس میں وُہ مرا تھا لیکن اُس کے سینے پر ایک صلیب رکھی تھی اور پھولوں کا ایک ہار اُس کے پاؤں میں رکھا تھا۔ اور اُس کے جسم پر سیاہ

مخمل کی ایک سنہری حاشیے والی چادر سے ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ بے کھٹکے پڑا تھا جسم ٹھنڈا تھا اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ منہ ڈھنپا ہوا نہ تھا۔ اور اس کی نگی تو ار اس کے داہنے ہاتھ کے پاس رکھی تھی۔ میں دوزانو ہو گئی اور اس کا مردہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر میں نے زوجیت کا عہد باندھا۔ اتفاق سے میں نے اس کی انگلی میں ایک لعل کی ایک انگوٹھی دیکھی۔ میں نے تعظیم اور احتیاط کے ساتھ وہ انگوٹھی نکالی ۔۔۔ پنی میرے کی انگوٹھی اس کی جگہ پہنا دی۔ اس طرح اس مردے کے ساتھ میرا نکاح تکمیل کو پہنچا۔ پھر میں خوب جی بھر کر روئی اور اس سرد اور خاموش چہرے کو جس کا دیدار پھر کبھی مجھ کو نصیب ہونیوالا نہ تھا۔ بار بار چومتی رہی۔ تعجب یہ ہے کہ جس وقت میں نے اپنے پیارے کی طرف آخری نگاہ کی تو میرا کلیجہ شق ہو نیکو تھا۔ لیکن میں یہ بھی خوب جانتی تھی کہ اس کی روح زندہ ہے اور مجھ سے روز افزوں محبت کرتی ہے اور اگرچہ یہ مشتِ خاک مجھ کو اس قدر پیاری ہے لیکن آخر یہ ایک خالی صندوقچہ ہے جس میں سے موتی نکال لیا گیا ہے۔

میں آنسوؤں کی بھرمار سے اس قدر اندھی ہو رہی تھی کہ مجھ کو اپنے کمرے کا راستہ بھی نہ سوجھتا تھا۔ جب میں بہزار دقت اپنے کمرے میں پہنچی تو مجھ کو پلنگ پر چین نہ آیا۔ میں اپنی صلیب کے سامنے دوزانو ہو گئی اور دعا کرنے لگی۔ صبح تک میں اسی طرح دوزانو رہی۔ جب صبح کو پرندے چہچہانے لگے تو میں نے مشرقی کمرے کی طرف سے پاؤں کی نرم نرم آہٹ سنی۔ میں سمجھ گئی کہ میرے دولہا کو دفن کرنے لیجاتے ہیں۔ میں نے حرکت تک نہ کی اور برابر دعا میں مشغول رہی۔ دیر کے بعد کوئی آہستہ آہستہ میرے کمرے کے دروازے تک آیا۔ دروازہ کھلا اور میری ماں داخل ہوئی۔ وہ مجھ کو گلے سے لگا کر بولی ہیں! مارجوری! کپڑے پہن چکیں اور دعا مانگ رہی ہو؟ خیر یہ اچھا ہے۔ میں نے اسکو پیار کرنے دیا اور کچھ نہ بولی۔ تھوڑی دیر کے بعد میرا باپ آیا۔ وہ تھا تو ایک اکھڑ سا سپاہی لیکن میرے لئے اس کا دل اس قدر نرما گیا کہ وہ بھی رونے لگا۔ یہ دیکھ کر

مجھ کو عجب پریشانی ہوئی۔ وہ لرزتی ہوئی آواز سے بولا "بچی! شریف جارج پرسی اپنے مدفن میں جا سویا۔ جو بات تم نے مجھ سے کہی تھی ضرور سچ ہوگی۔ کیونکہ میں نے اُس بہادر کی انگلی میں تیری ہیرے کی انگوٹھی دیکھی"۔ یہ سُنکر میں چونک اُٹھی کہ کہیں اُنہوں نے میری محبت کی نشانی کو اس کے پیارے ہاتھ سے اُتار نہ لیا ہو۔ وہ بولا "میری مارجوری! کوئی اندیشہ مت کرو کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہارا باپ ایسی بے ادبی کرسکتا ہے۔ اُن محبت کی نشانیوں کو اُتارنا جو تم دونو نے آپس میں دیں ایک مقدس چیز کی بے ادبی کرنا ہے۔ میں نے دیکھ لیا ہے تمہارے پاس بھی اُس کی انگوٹھی موجود ہے۔ شاید میری بصارت کی پرانی کمزوری تھی یا کیا۔ مجھ کو تو یاد پڑتا ہو کہ وہ اپنی لعل کی انگوٹھی اس وقت پہنے ہوئے تھا جب کل شب کو اُس کا جنازہ تیار کرکے رکھا گیا۔ نہیں میں نے غلطی کی ہوگی۔ مارجوری تمہارے ہیرے تمہارے عاشق کے ساتھ دفن ہوگئے ہیں۔ ورنہ بیشک وہ تمہارے کنوارپن کی محبت کے لائق تھا۔ لیکن ہمت رکھو۔ اور خدا سے دعا کرو کہ تم کو صبر عطا کرے تم کو خوشخبری دیتا ہوں کہ تمہارے دونوں بھائی جو مدت سے پردیس میں تھے اپنے دیس میں واپس آگئے ہیں اور کل تمہارے پاس آپہنچیں گے۔ جارج پرسی کی جان بھی ایک کار خیر میں کام آئی کیونکہ بادشاہ کم از کم اس دفعہ تو اپنے دشمنوں کے پنجے سے بچ نکلا۔ اگر پرسی اکیلا دو باغیوں کے ساتھ بہادری سے نہ لڑتا تو بادشاہ کا بُرا حال ہوتا۔ میں اس شریف کے خاندانی حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں اُس نے مجھ کو کچھ نہیں بتلایا۔ شاہ چارلز کے نام سے میری اور اُس کی دوستی شروع ہوئی۔ لیکن انجام ایسا غمناک ہوا۔ مارجوری مجھ کو کیا خبر تھی۔ تم کو اس کم سنی میں ایسی محبت اور ایسا غم پیش آئیگا۔ لیکن پیاری ہمت رکھو خدا تمہاری امداد کرے"! میرا باپ مجھ کو دعا دیکر چلا گیا۔ میں نے اپنی ماں سے کہا "اگر آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں۔ تو جو کچھ پیش آیا ہے۔ اس کا کبھی ذکر نہ کیجئے"۔ میری ماں نے وعدہ کیا۔

اُس روز سے میری زندگی اس طرح گذری کہ میں دُنیا کی چیزوں سے گویا الگ تھی - میرے دونوں بھائیوں نے شادی کی - اور اب جو میں یہ حالات لکھ رہی ہوں - اُن کے بچے میرے بڑے گرد موجود ہیں اور مجھ کو پھوپھی جان کہکر پکارتے ہیں - میرا بڑا بھتیجا کل میرے پاس اپنی منسوبہ دُلہن کو لایا تھا وُہ اٹھارہ سال کی ایک پیاری لڑکی ہے اور مجھ سے دُعا لینے آئی تھی - میرے محترم والدین نے بُڑھاپے تک پہنچکر انتقال کیا - اور اب میں خدائے قادر کا شکر کرتی ہوں کہ میرا مقدس سفر قریب الاختتام ہے - میں جوانی کے دن کاٹ چکی ہوں - رفتہ رفتہ اُس منزلِ راحت کے نزدیک پہنچ رہی ہوں جس کی تمام عُمر مجھ کو آرزو رہی ہے -

میں ابھی جوان ہی تھی جو بہت سے قابل اور نیک طینت شریفوں نے مجھ سے شادی کرنی چاہی اس قسم کے تذکروں سے مجھ کو سخت رنج ہوتا تھا مگر رفتہ رفتہ انہوں نے مجھ کو کانٹوں میں گھسیٹنا چھوڑ دیا - ایک دفعہ میرے والدین نے بھی کوشش کی کہ میں سمجھ جاؤں کہ شادی کرنے سے انکار کرنے میں میرا کس قدر نقصان ہے - انہوں نے بہت بہت نرمی اور ملائمت سے سمجھایا کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں لیکن میں نے یہی جواب دیا کہ میری شادی تو ہو چکی ہے - اور اگر آپ عیسائی مذہب کے سچے معتقد ہیں تو مجھ کو اپنے عہد پر قائم رہنے کے لئے قابلِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے کیونکہ جب قیامت کے دن بچھڑی ہوئی رُوحیں ملینگی - تو اپنے پیارے کو کیا منہہ دکھاؤنگی اگر میں اپنے پیمانِ وفا کو توڑ دوں - جب اُنہوں نے میرا ارادہ اس قدر پکا دیکھا تو وُہ بھی خاموش ہو رہے - اگرچہ وُہ سخت پچھتاتے تھے کہ جب ہم نے پرسی کو دفن کیا تو گویا اپنی بیٹی کے دل اور اُمید راحت کو بھی ساتھ ہی دفن کر دیا -

لیکن زندگی کے اختصار کو دیکھ کر مجھ کو کس قدر خوشی ہوتی ہے! جُوں جُوں دن گذرتے جاتے ہیں - میں خوشی کے مارے پھولی نہیں سماتی - اور میری رُوح روز بروز قوی اور جوان ہوتی جاتی ہے - کیونکہ میں جانتی ہوں کہ اب بہت جلد میں اپنے پیارے سے جا ملونگی - اور خدا کا شکر ہے کہ میں بے کھٹکے اُس سے آنکھیں چار کر سکتی ہوں - اور کہہ سکتی ہوں - کہ میری جان!

جس طرح میں نے وعدہ کیا تھا اُسی طرح میں نے وفا کی ۔

خدا کا شکر ہے کہ میری زندگی امن سے گذری ۔ اور مجھ پر خدا کے بڑے بڑے احسان ہوئے لیکن بڑی نعمت خدا نے مجھ کو یہ دی کہ مجھ کو اپنے عہد پر قائم رہنے کی طاقت عطا کی ۔

دستخط مارجوری نزلی

اس تحریر کے آخر میں ایک اَور ہاتھ کے لکھے ہُوئے یہ الفاظ ہیں ۔

یہ مارجوری سنہ ۱۹۰۳ء میں خداوند مسیح کے یوم ولادت کو مری ۔ جان نکلنے کے وقت اس کے چہرے پر اس قدر بشاشت اور اُمید اور اَمن برستا تھا کہ جو لوگ اُس کے ماتم میں رونے کے لیے اُس کے گرد کھڑے تھے وہ حیرت میں رونا بھی بھُول گئے ۔ چہرے پر مسرت اور نوجوانی کا حسن چھایا ہُوا تھا ۔ اور جب آخری سانس اُس کے ہونٹوں سے نکلا تو وہ ایسی حسین اور پیاری دکھائی دیتی تھی جیسے کوئی سترہ برس کی دوشیزہ لڑکی ہوتی ہے ۔ اُسکی وصیت کے بموجب اُس کو جارج پرسی کے پہلو میں دفن کیا گیا ۔ اپنے ہاتھ میں وہ جارج پرسی کی لعل کی انگوٹھی پہنے تھی جب اس کے ساتھ دفن کی گئی ٭

نیرنگ

(ترجمہ)

اس پرچے کے ساتھ دو تصویریں چھپی ہیں ۔ ایک تو مرحوم حضرت محسنؔ کاکوروی کی ہے اور دوسری ہمارے مکرم مولانا سید احمد علی صاحب شہری کی ۔ محسنؔ مرحوم کے کلام نعتیہ پر اس سے پہلے ایک مضمون چھپ چکا ہے جس میں اُنکے کلام کے نمونے بھی درج تھے اُنکی تصویر کا میسر آجانا بمنزلہ ایک تبرک کے ہے ۔ جیسے اس عاشق رسول مدنی کے مداح عزیز سمجھکر ضرور اپنے پاس رکھینگے ۔ مگر مولینا شہری کی تصویر ملنے کو بھی ہم غنیمت سمجھتے ہیں ۔ گو خدا کے فضل سے وہ ابتک ہم میں موجود ہیں ۔ اور ہم دعا کرتے ہیں کہ وہ تادیر سلامت رہیں ۔ مولانا شہری ان چند بزرگوں میں ہیں جنہوں نے اپنی عمر علم و ادب کی خدمت میں صرف کردی ہے اور جنکی ذات میں پرانے زمانہ کی تربیت اور نئے زمانے کی روشن خیالی دونوں جمع ہیں نظم میں اُنکی اُستادانہ مہارت اور اُنکے کلام کی بیساختگی محتاج تعریف نہیں ۔

منازلِ حیات

میر دلیر حسین صاحب بی۔ اے نے ذیل کے منتخبات منازل السائرہ سے منتخب کرکے مخزن میں اشاعت کرنے بھیجے ہیں۔ یہ انتخابات بجائے خود نہایت دلچسپ اور قابل قدر ہیں۔ اور گو کتاب منازل السائرہ شائع ہو چکی ہے۔ ہم ان مضامین کو بہت سے ناظرین بالکل نئے پائینگے اور جو پہلے دیکھ چکے ہیں انکو تذکرہ کا مزہ آئیگا مولوی عبدالراشد صاحب کی تحریر کو دوبارہ سہ بارہ پڑھنے سے طبیعت سیر نہیں ہو سکتی :-

گلزارِ شیرخوارگی

یہ ایک چھوٹا سا مگر خوشنما و شاداب باغیچہ تھا مختلف عمروں کے آدمی مرد اور عورتیں بادِ بہاری کا لطف اُٹھاتے پھر رہے تھے۔ صبحِ سعادت کا وقت تھا گلہائے رنگین کی پیاری صورتوں نے زمینِ چمن کو بوقلموں کر رکھا تھا۔ شبنم نے موتیوں کے ہار بچھا دیئے تھے۔ بادِ صبا فرحت و انبساط کے مژدے دیتی پھر رہی تھی۔ عورتوں کی گود میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ مرد جوق جوق ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہنستے بولتے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ اُمیدوں نے اُنکے چہرے مالامال اور دل چونچال کر رکھے تھے۔ ہرے بھرے گلزار آنکھوں کے سامنے لہلہا رہے تھے۔ ارمانوں کے قدرتی چشمے کشتِ اُمید کو تروتازہ کر رہے تھے۔ انتہائے نظر اور حدِ خیال تک چپّہ چپّہ اور ذرہ ذرہ شاداب دکھائی دیتا تھا۔ وسطِ چمن میں ایک دودھ کی نہر لہریں لے رہی تھی۔ کیا بیفکری کا زمانہ تھا۔ مسافر وہی چھوٹے چھوٹے بچے بھوک لگی کنارے پر آئے مُنہ جھکایا اور سیر ہو گئے۔ ہائے کیا نعمت تھی کہ کلیجے سے لگا کر دنیا بھر کی کلفت دُور ہو جاتی تھی۔ افکار و ملال خواب و خیال ہو جاتے تھے۔ رنج و غم غلط ہو جاتا

تھا۔ کیا دولت تھی جس کے مقابل ہفت اقلیم کی سلطنت ہیچ و بے وقعت تھی۔ بادشاہِ وقت کا حکم اتنا مناسب تھا کہ ہر شخص مسافر نوازی اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اس خدمت سے محروم رہ جاتا تو اپنے تئیں نہایت بد قسمت تصور کرتا۔ کیا مبارک سرزمین تھی جو مرد نظر آیا شگفتہ اور جو عورت دکھائی دی وہ باغ باغ۔ عورتوں کے پرے کے پرے جس وقت مسافروں کو گود میں لیکر گلگشت کو نکلتے تھے۔ درختوں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔

یہ محافظ و خبر گیر جو مسافروں کی خدمت پر متعین تھے کیسے اچھے لوگ تھے کہ سو طرح سے نثار تھے ذرا مسافر کے پھانس لگی اور بیچین ہوئے۔ ان لوگوں کی پیشانیاں ستارہ صبح کی طرح روشن تھیں اور اُن کے دل برکتِ نور سے معمور۔ محبت کا سرمہ اُن کی آنکھوں میں لگا ہوا تھا اور خدمتگذاری کی روشنی اُن کے چہروں پر چمک رہی تھی۔ مکر کا نام نہ تھا ریا کا کام نہ تھا خالص محبت تھی اور سچی خدمت۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے کہ جان تک دریغ نہ کرتے تھے۔ خوش قسمت میزبان تھے کہ کامیابی کے ساتھ مہمانوں کی خدمت ختم کرتے تھے اگر کوئی مسافر اُن کی خدمت ہی میں ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو جاتا تھا تو روتے تھے اور پیٹتے تھے۔ یہاں ایک بات دیکھ کر بہت ہی تعجب ہوا۔ بہت کم مسافر ایسے نظر آئے کہ خدمتِ محافظین کو مدِ نظر رکھا۔ اس خدمت کا معاوضہ تو خیر ناممکن تھا۔ جب وہ وقت آتا کہ وہ ان کے محتاج ہوتے تو یہ آنکھ چُرا جاتے۔ لذائذِ نفسانی کے پابند ہو جاتے غیروں سے محبت کرتے دوستوں سے اختلاط کرتے خود محافظ ہو کر مسافروں کی خدمت کرتے لیکن وہ خدمت فراموش کر دیتے جس کی بدولت خدا نے اس قابل کیا۔ پھر بھی وہ اللہ کے بندے ہر حال میں خوش تھے۔ جسکو سنا یہی کہتے سنا ”خدمت کرو تمہاری سعادت ہو نہ کرو کچھ شکایت نہیں“۔

منزلوں مسافروں کے ہمراہ جاتے اور حتی المقدور آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ ہر منزل میں خدمت کرتے ہر مصیبت میں شریک رہتے۔ ان میں بعض عاقبت اندیش ایسے بھی تھے جو عقل کی آنکھوں پر پردے ڈال لیتے تھے اور درجہ محبت کو کمال پر پہنچا رہے تھے

کا امتیاز کھو دیتے تھے۔ اپنے بُرے اعمال اور ناقص افعال کا نمونہ دکھا کر غلاب اصلی نبعہ رہتے تھے اور پہلی ہی منزل سے مسافر بیچاروں کی لوٹ مار شروع کر دیتے تھے۔

(۲)

سرائے طفولیت

سرائے طفولیت ایک عالیشان محل حیات آباد میں سمان کے لحاظ بہتیں ہر رہا تھا شہر کے ہر چہار طرف چونے گچ کی پختہ عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ سرائے کے دروازہ خاص پر رنگ برنگ کے جھنڈے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ دیواروں کی کنگوروں محرابوں کے نقش و نگار موسم بہار کا مزہ دے رہے تھے۔ رنگا رنگ کے جواہرات جڑے ہوئے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ لوگ خوشحال و فارغ البال۔ نہ کوئی مفلس کنگال۔ بازار کشادہ و بارونق۔ دکاندار خلیق و منکسر مزاج۔ عجیب مقام تھا کہ ہر طرف بیفکری کے ڈنکے بج رہے تھے۔

سرائے کے اندر ہر طرف وسیع و پختہ کمرے بنے ہوئے تھے بیفکری کا دور دورہ تھا۔ اطمینان و فارغ البالی کی حکومت تھی۔ امیری کا کارخانہ تھا وجاہت کا نام نہ تھا۔ محافظ زیادہ وہی تھے جو منزل اول میں تھے۔ مگر محبت کا نمبر پہلے سے بڑھ گیا تھا۔ مسافروں کی قدر و منزلت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ کیا مبارک سرزمین تھی کہ رنج و غم پاس آنے نہ پھٹکتا تھا! ناعاقبت اندیشی انواع و اقسام کی نعمتیں انکے دسترخوان پر چن دیتی تھی۔ کھیل کود کی خلعت گراں بہا زیب تن خوشی کا تاج سر پر لگائے ہوئے ادھر ادھر پھرتے تھے۔ کیا دن تھے کہ پھر نہ آئے اور کیا جگہ تھی کہ دوبارہ دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ بغض و حسد کا گذر نہ تھا فکر معیشت کا پتہ نہ تھا۔ دولت و عسرت کا امتیاز نہ تھا۔ نخوت و غیبت کا نام نہ تھا۔ جو ضرورت ہوئی وہ رفع۔ جو خواہش ہوئی وہ پوری۔ ان کی بھولی بھولی باتوں اور بھولے سادے معاملوں پر آسمانِ انصاف سے موتی برس رہے تھے۔ فراغت و

اطمینان کا باغبان خوشی و خرمی کے پھول نچھاور کر رہا تھا۔ محبت و پیار کے ہار گلے میں پڑے تھے کامیابی کے گلدستے طاقوں میں چُنے ہوئے تھے۔ آرام و آسائش کی بیلیں دیواروں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ غرض ہر قطعہ گلزار ارم بنا ہوا تھا۔

محافظ و خبر گیر کیسے کیسے خدمتگذار کہ حکم کی دیر اور تعمیل کو تیار۔ ایسے ایسے نازبردار کہ ذرا سے اشارے پر جان نثار کرنے کو آمادہ انتظام اتنا معقول کہ بڑے بڑے سرکش و تاجدار مسافروں کے سامنے عاجز و لاچار تھے۔ اِس منزل کا تمام زمانہ آزادانہ و بیباکانہ گذر گیا۔ ضرورت سے پہلے اور حاجت سے پیشتر ہر چیز تیار اور موجود۔ نہ کسی بات کا کھٹکا تھا نہ کسی قسم کا خوف۔ نہ عزت کی خواہش تھی نہ دولت کا ارمان۔ نہ نخوت کے اسباب نہ غرور کا سامان۔ جو ملا وہ کھا لیا۔ جہاں نیند آئی وہاں پڑ رہے۔ طبیعت میں شر نہ تھا اور دل میں فساد نہ تھا۔ "کیا ہوگا" کا فکر نہ تھا۔ "کیا ہو گیا" یہ یاد نہ تھا۔ کوئی بات خلافِ مزاج ہوئی رو دیے کوئی چیز اچھی ہاتھ آگئی ہنس دیئے۔ مگر طبیعتوں میں قبولیت کا مادہ موجود تھا جو سنتے تھے وہ کہتے تھے جو دیکھتے تھے وہ کرتے تھے۔ نتائجِ سفر کا دار و مدار اسی جگہ تھا۔ ذرا سی لاپروائی بدتر سے بدتر بنا دیتی تھی +

(۳)

چمنستانِ شباب

چمنستانِ شباب کی سرحد میں داخل ہوتے ہی طبیعت خود بخود شگفتہ ہونے لگی۔ ہوا کے فرحت بخش جھونکے دل و دماغ کو تر و تازہ کرنے لگے۔ پھولوں کی تیز اور مست خوشبو سے کوسوں تک جنگل مہک رہا تھا۔ جُوں جُوں آگے بڑھتے گئے دِل میں اُمنگ اور خواہشیں پیدا ہوتی گئیں۔ پاس پہنچکر دیکھا ایک خوشنما باغ دُور تک چلا گیا ہے۔ دروازے لگے ہوئے ہیں۔ چار دیواری کھینچی ہوئی ہے مگر اندر جانے کے واسطے اجازتِ عام ہے۔ کسی قسم کی روک ٹوک

نہیں۔ آگے قدم بڑھایا۔ تمام عالم سرسبز و شاداب نظر آیا۔ ہر قطعۂ چمن بہشت بریں بنا ہوا ہے
رنگ برنگ کے پھول کھل رہے ہیں۔ خوشبوؤں نے ہوا اور ہوا نے باغ کو لہکا رکھا ہے۔
گلاب کے تختے پھیلے ہوئے ہیں۔ میٹھے اور ٹھنڈے پانی کے چشمے بہ رہے ہیں۔ بارآور
درخت جھنڈ کے جھنڈ جھوم جھوم کر زمین کو چوم رہے ہیں۔ طائرانِ خوش الحان ڈالیوں
پر بیٹھے چہکار رہے ہیں۔ ہرے بھرے درخت کھڑے لہلہا رہے ہیں۔ پرند کلیلیں
کر رہے ہیں۔ گملے قطار در قطار چلے گئے ہیں۔ کیلے کی چھاؤں دُور تک پھیلی ہوئی ہے
سنگ مرمر کے حوض بنے ہوئے ہیں۔ رنگ برنگ کی مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ وسطِ چمن میں
ایک بارہ دری ہے۔ پٹاپٹی کے پردے پڑے ہوئے ہیں مخمل رُومی و کاشانی کا فرش بچھا
ہوا ہے۔ کنیزان مہرو سر سے پاؤں تک جواہرات میں ڈوبی زرق برق لباس سے
آراستہ پیراستہ اِدھر اُدھر پھر رہی ہیں۔

سرائے طفولیت کی طرف سے مسافر بھاگے دوڑے چلے آ رہے تھے اور چمنستان
شباب کے اسباب دیکھ کر اس طرح دلدادہ ہوتے تھے کہ گویا اب تمام عمر یہ فرحت و شگفتگی
اُن کا ساتھ نہ چھوڑیگی۔ اس سرزمین کی ہر چیز میں کچھ ایسا مقناطیسی اثر تھا کہ دِل خود بخود
کھنچا چلا جاتا تھا۔ دو چار صُورتیں ایسی بھی دکھائی دیں جنہوں نے اس بات کا پتہ لگا لیا
کہ یہ دلفریب جلوے عارضی و فانی ہیں۔

غور سے دیکھا تو درحقیقت تمام چمنستان ایک جادو کا کارخانہ تھا۔ گلاب کے
پودے کانٹوں سے پٹے پڑے تھے۔ چنبیلی کے پھولوں میں شہد کی مکھیاں چھپی بیٹھی تھیں
بیلوں میں سانپ بچھو لپٹے ہوئے تھے۔ چشموں کا پانی دیکھنے میں صاف شفاف مگر پینے
میں زہر ہلاہل۔ چور قزاق گرہ کٹ اُٹھائی گیرے آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے
اور چلنے فن کے ایسے کامل اور ہوشیار کہ کیسا ہی تجربہ کار آدمی کیوں نہ ہو بات کی اور
گرفتار ہوا۔ نشے کا سا عالم تھا۔ جو نظر آیا وہ بیخود و سرشار۔ دیواروں پر خوبصورت

تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ مگر ہر تصویر ایک دام تزویر تھا ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھا اور گلے کا ہار ہوئی۔ جو چیز تھی دیکھنے میں کچھ برتنے میں کچھ۔ ہوائے خوشگوار جھونکوں تک میں سمیت تی ہوئی تھی ذرا ہوا لگی اور مسافر کچھ کا کچھ ہوا۔ باغ کے اُس طرف ایک بیابان تھا۔ دُور تک کا جنگل کوسوں دُور چلا گیا تھا۔ جانورانِ صحرائی ہر طرف بسے ہوئے تھے۔ درندوں کی خونخوار آوازے رات کو تمام جنگل گونج جاتا تھا۔ بھیڑیئے بسا اوقات اندر گھس آتے تھے۔ شیروں کے مُنھ کو خون لگا ہوا تھا۔ چیتے ہر وقت تاک لگاتے رہتے تھے۔ ہاتھیوں کا غول بار ہا اِدھر سے اُدھر نکل جاتا تھا۔

چمنستانِ شباب کے پانی میں خاص طور پر یہ تاثیر تھی کہ مسافر اپنی اصلیت بھول جاتا تھا۔ حرص و طمع دامنگیر ہوجاتے تھے خواہش و ارمان کا ہجوم ہوجاتا تھا مزاج میں نخوت آجاتی تھی۔ آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑ جاتے تھے حسن و عشق کی تصویریں دلوں کو مسخر کر لیتی تھیں۔ اتلافِ حقوق۔ ظلم و تعدی عادات ہوجاتے تھے۔ خوفِ خُدا غارت ہوجاتا تھا۔ خود غرضی کا جال ایک طرف بچھا ہوا تھا۔ علائق کی زنجیریں دُوسری طرف پڑی ہوئی تھیں۔ غرض از ابتدا تا انتہا چمنستان ادبارہ دری ایک سانچا تھا کہ مسافر کو ڈھال اور دوسری طرف پھینکدیا۔ گرفتارانِ بلا ہاتھوں میں ہتکڑیاں پاؤں میں بیڑیاں جکڑے ہوئے اور کسے ہوئے دھکے کھا کھا کر باہر نکلتے تھے۔ زمانہ گذشتہ کی یادگار دو چار کلنک کے ٹیکے دس پانچ بدنامیوں کے تمغے باقی رہ جاتے تھے۔ گناہوں کی بھاری گٹھری سر پر ہوتی تھی۔ مُڑ مُڑ کر دیکھتے جاتے تھے۔ مگر جو قدم اُٹھتا تھا پھر پلٹ نہیں سکتا تھا۔

یہ لوگ اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں میں کلہاڑیاں مارتے تھے۔ ورنہ خود چمنستان شباب کے واقعات اگر چشمِ بصیرت سے دیکھتے اور تامل صحیح کرتے تو اصلاح کو کافی تھے۔ بیمار پڑے ہُوئے کراہ رہے تھے۔ مُصیبت زدہ چیخ چلا رہے تھے۔ قبرستان قبروں سے اٹے تھے۔ وہ مُٹھی کھوپڑیوں اور ہڈیوں سے پٹ رہے تھے۔ کوئی یاں کے غم میں سوگوار تھا۔

کوئی باپ کے رنج میں بیقرار کسی کی بہن چھٹ رہی تھی - کسی کا بھائی جُدا ہو رہا تھا - ایک جوان بیٹی کو رو رہا تھا - دوسرا بیٹے پر جان کھو رہا تھا - کوئی رو رہا تھا کوئی ہنس رہا تھا کہیں پیدایش کہیں موت کہیں چھٹی کہیں برات کہیں دن کہیں رات - زمین سے لیکر آسمان تک ہر چیز رنج و فکر میں ڈوبی ہُوئی مرد مغموم عورتیں متفکر - غرض جو تھا بُڈھا ہو یا جوان حیران و پریشان عظیم الشان محل ویران پڑے تھے - سنگین پختہ عمارتیں سنسان کھڑی تھیں آبادی بیشمار تھی مگر ہر ایک اپنے دُکھ درد میں گرفتار تھا - بہت سے ایسے بھی تھے جنکو خدا نے ہر اعتبار سے مالامال کر رکھا تھا عنایت ایزدی شاملِ حال تھی صاحب اولاد تھے فارغ البال تھے مگر غور سے دیکھا تو رنج و آفات میں بال بال جکڑے ہُوئے تھے - ضلالت و غفلت کی انگلیاں اُن کے کانوں میں ٹھُسی ہُوئی تھیں اور طمع و حرص کے پردے آنکھوں پر پڑے ہُوئے تھے *

(۴)

عالمِ ضعیفی یا دریائے انحطاط

چمنستانِ شباب کے اُس کنارے پر حیات آباد ہے - جو دریائے انحطاط لہریں لے رہا تھا لوگ کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر پار اُترنے کی کوشش کر رہے تھے - موجوں کے تھپیڑے پانی کے گرداب پہاڑوں کی چٹانیں بادِ مخالف کے جھونکے دھارے کے سامنے بھی مشکل سے آہنے دیتے تھے - غفلت و بےپروائی کے ناخدا جب کسی بلا کا سامنا ہوتا تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے تھے مُسافروں کی آنکھوں پر ایسے غفلت کے پردے پڑے ہُوئے تھے کہ ساتھ کی کشتیاں برابر ڈوبتی چلی جاتی تھیں اور اپنی بربادی کا خیال بھُولکر نہ آتا تھا - حیاتِ ابدی کا تکیہ لگائے ہُوئے جوں وا ہاں سے میٹھے ترانے سُنتے چلے جاتے تھے ختتامِ سفر کا کوئی وقت معین نہ تھا - زندگی کے تمام سامان کشتیوں میں موجود تھے

اور دُنیا بھر کے کاروبار پانی میں ہو رہے تھے۔ عاقبت اندیشی کا گذر نہ تھا انجام پر نظر نہ تھی غرور کا سودا دماغوں میں سمایا ہوا تھا طمع زبردستِ شفقت پھیر رہی تھی۔ ذرائع ناجائز گود میں لوٹ رہے تھے۔ بے ایمانی کی گھٹا سروں پر چھائی ہُوئی تھی۔ نام و نمود کے کہرے نے کوسوں تک تیرہ و تار کر رکھا تھا۔ ناپائداری دُنیا کا ابر تلا ہوا سروں پر کھڑا تھا مگر ہٹ دھرمی اور خودپسندی کی خوبصورت دیبیاں آنکھ اُٹھانے کی مہلت نہ دیتی تھیں۔ ریاکاری کا تلاطم برپا تھا۔ مکر و فریب کے گھڑیال مُنہہ کھولے بیٹھے تھے۔ اتلافِ حقوق کے بھنور جابجا پڑ رہے تھے مگر یہ اُمید کے بندے ہمچو من دیگرے نیست کے نعرے مار رہے تھے۔

گناہ اور تصوّر کے اُونچے اُونچے پہاڑ پرا جمائے کھڑے تھے قطب نما اور دُوربینیں خاک کام نہ کرتی تھیں۔ پاپ کی ناؤ ٹکر کھا کر بیچ منجدھار میں ڈوبتی تھی۔ ساتھ کی کشتیوں کو ڈوبتا دیکھ کر بھی باقی ماندہ ہمسفر احتیاط نہ کرتے تھے اور ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ جو ڈوبا وہ اسی نتیجے کا سزاوار تھا۔ مجھ کو کوئی کھٹکا نہیں۔ دُوسری کشتیوں کی تباہی دیکھ کر ہنستے تھے اور جب اپنے اُوپر آ کر پڑتی تھی تو چیختے جاتے تھے اور ڈوبتے جاتے تھے۔

دریائے انحطاط میں ایک جزیرہ نظر آیا "جزیرۂ ندامت"۔ چند نیک سیرت بزرگ صُورت پُھوس کی جھونپڑیاں ڈالے ہُوئے سرنگوں بیٹھے تھے۔ اُن کی سپید ڈاڑھیاں اُن کے چہروں پر نور برسا رہی تھیں۔ فضیلت کے بڑے بڑے عمامے سر سے بندھے ہُوئے تھے مگر فتنہ پردازی کی چھینٹیں پڑی ہُوئی تھیں اور گھٹے پڑی ہُوئی پیشانیوں پر کلنک کا ٹیکا چمک رہا تھا۔ افعالِ گذشتہ کا تاسف اور اعمال کی پشیمانی چاروں طرف سے گھیرے ہُوئے تھی ازفرق تا پا عرقِ خجالت میں ڈوبے ہُوئے تھے۔ آسمان پر نگاہ تھی اور لب پر اللہ ہی اللہ تھا۔

ایک گروہ دیکھا قویٰ بالکل بیکار ہو گئے تھے منہہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ سر پر موت منڈلا رہی تھی مگر حسرت و ارمان دونوں طرف مورچھل ہلا رہے تھے۔ انقلاب زمانہ نے اُن کی

صورتیں بگاڑ رہی تھیں۔ دنیا ان سے بھاگ رہی تھی اور وہ دنیا کو لپٹ رہے تھے۔

ایک جم غفیر عورتوں کا ایسا ملا کہ اس کبرسنی میں بھی جبکہ قبروں میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں اپنی نمائش ظاہری سے فرصت نہ تھی۔ بغض وحسد کا کاجل آنکھوں میں پھیلا ہوا تھا۔ نخوت و غیبت کے تیل سے سر گندھے ہوئے کذب و افترا کا زیور پہنے ہوئے نافرمانی کا جھومر لگا ہوا شرک و بدعت کے پھول بھرے ہوئے مکر و فریب کا تکیہ لگاتے ہوئے حیاتِ ابدی کا پٹہ لکھے ہوئے تن تن کر اپنے حسنِ صورت کو دیکھ رہی تھیں۔ ایک شخص کو دیکھا آنکھوں سے اندھا ہاتھوں سے لولا پاؤں سے لنگڑا منہ میں دانت نہیں پیٹ میں آنت نہیں۔ داڑھی سفید بگلے کا پر پنڈلیں دونی کا کاکا ایک درخت کے نیچے کھڑا بیاج کے ٹوٹے کو رو رہا تھا۔

اس سے ملی ہوئی سرحد عدم آباد تھی جس کی پختہ و سنگین فصیل آسمان سے باتیں کر رہی تھی قلعہ کی یہ حال تھا کہ پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا وسعت و رفعت کی یہ کیفیت تھی کہ اندر کی آواز باہر نہ آتی تھی۔ مسافر لوگ بھاٹک تک پہنچ سکتے تھے آگے کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکتا تھا۔ دروازے پر ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا "مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنا سفر نیکی کے ساتھ پورا کر کے آئے"۔

محمد عبد الراشد دہلوی

اگر کسی وقت طبیعت اُداس ہو اور پریشان کرنے والے خیالات طبیعت پر غالب ہوں تو اپنی کتابوں ہی کی طرف توجہ کرو۔ یہی تمہارا دل بھی بہلائیں گی اور یہی ہر قسم کے متوحش خیالات تمہارے دل و دماغ سے دور کر دینگی۔ اور جس وقت بھی تم اُن کی طرف رجوع لاؤ گے تمہارے ساتھ نہایت اخلاق سے پیش آئینگی اور ہر وقت تمہاری اُداسی اور پریشانی کو دور کرنیکے لئے دست بستہ حاضر ہونگی +

عالمِ ارواح کی سیر

رُوح کیا چیز ہے۔ اور مرنے کے بعد کہاں چلی جاتی ہے۔ ایک مشکل سوال ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ رُوح اثر یا کیفیت کا نام ہے۔ جسم میں اُس کی تاثیریں محدود رہتی ہیں اور جسم سے جُدا ہوکر اس کے اثر کی وسعت لامحدود ہو جاتی ہے۔

شاید یہ بیان سچ ہو کیونکہ ہم مرنے والوں کے مقبروں اور رہنے کے مکانوں میں ایک ایسی کیفیت محسوس کرتے ہیں جس میں صاحبِ قبر اور صاحبِ مکان کی گذشتہ حالت کا اثر صاف طور سے نظر آتا ہے۔ اور اوقات کی تبدیلی سے مختلف شکلوں میں جلوہ دکھاتا ہے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۰۶ء کے اخیر عشرہ میں آگرہ کی مشہور عمارتیں دیکھنے کا اتفاق ہوا تو ہر عمارت میں رُوحانیت کا موثر ظہور دیکھا جاتا تھا۔ انہی کیفیات میں سے بعض کو مخزن کے لئے قلمبند کرلیا گیا تاکہ نوعِ اِنسان کے اور افراد بھی وجُودِ مطلق کے کرشموں کا مشاہدہ کریں۔

سب سے پہلے جلال الدین محمد اکبر شاہ کے مقبرہ کی زیارت کی۔ جو فنِ تعمیر کا نہایت اعلیٰ اور خوشنما نمونہ ہے۔ مرقد کے بالائی حصّہ میں قبر کے تعویذ پر آسمان کا سایہ ہے۔ سُورج کی روشنی میں اکبری جاہ و جلال کی روح رعب و سکوت کے ساتھ قائم نظر آتی ہے۔ لیکن جب نیچے کے طبقہ میں جائیں جہاں اصلی مدفن ہے تو تاریکی و وحشت کا سامنا ہوتا ہے۔ قبر کی سبز چادر بھی دیر تک دکھائی نہیں دیتی۔ خیال کی آنکھیں بوڑھے شہنشاہ کو کفن کی بوسیدہ چادر میں لپیٹا ہوا دیکھتی ہیں۔ دروازہ پر بیکسی و لاچاری کا پہرہ اور اندر عبرت کی رُوح پر پھیلائے نظر آتی ہے۔ اس وقت اگر تم اکبر کی اس رُوح کا خیال کرو جو جسم میں قید تھی اور شہنشاہی کے مزے لوٹتی تھی تو وُہ بھی فوراً آ جائیگی اور اس اندھیری کوٹھڑی میں اپنا گذشتہ تماشا دکھاوے گی۔ مگر میں تو جانا چاہتا ہوں۔ تاکہ نواب اعتماد الدولہ کے

مقبرہ کو دیکھوں۔ یہ مقبرہ شہر کی آبادی کے قریب جمنا کے پار واقع ہے۔ چھوٹی سی عمارت ہے
مگر اس قدر حسین و خوشنما ہے کہ آنکھیں سیر نہیں ہوتیں۔ اس میں وہ باپ سوتا ہے جس کی بیٹی لاہور
میں راوی کے کنارے خاک میں ملی پڑی ہے اور دردمند آنکھوں کو رُلاتی ہے۔

مرزا غیاث کے مقبرہ میں بیٹھ کر جمنا کے چمکدار پانی کی سیر کر رہا تھا اور دلگیرت وصاحب
(جو آگرہ کے مشہور بزرگ خاندان سے ہیں) پہلو میں تھے۔ کہ استے میں نامراد نورجہاں
کی رُوح شکستہ کشتی میں سامنے سے گذری۔ جس نورجہاں کے سبب مرزا غیاث اعتماد الدولہ
بنے اور ایسی خوبصورت خوابگاہ پائی وُہی بدنصیب ویران مسہری سے گھبرا کر یوں ماری
ماری پھرتی ہے۔

بے وقوف راویوں نے بیان کیا کہ اعتماد الدولہ تاج محل کا میر عمارت تھا جو پتھر
تاج سے بچا وُہ اپنے مقبرہ میں لگا لیا۔ مگر اس روایت پر وُہی بے خبر یقین کرتے ہیں۔
جنہیں معلوم نہیں ہے کہ اعتماد الدولہ شاہجہان کی تخت نشینی سے پہلے مرگیا تھا۔ ۴۹

آگرہ کے قلعہ میں دہلی کے قلعہ کی نسبت زیادہ عمارتیں باقی ہیں۔ موتی مسجد سر سے
پیر تک سنگِ مرمر کی ہے اور اس قدر خوشنما ہے کہ دہلی کی جامع مسجد بھی ایک دفعہ دل سے فراموش
ہو جاتی ہے۔ ایک تصویر ہے جس کو نور کے سانچے میں ڈھال کر کھڑا کر دیا ہے۔

دیوان عام و خاص زیادہ اچھے نہیں۔ البتہ بیگمات کے محل عُمدہ و خوشنما ہیں۔ جودھ
بائی کا محل بالکل ہندوانی طرز کا بنا ہوا ہے۔ جودھ بائی کی نسبت گائڈ بیان کرتے ہیں کہ اکبر
کی بیوی تھی۔ حالانکہ جہانگیر کی بیوی اور شاہجہان کی ماں ہونے کا ثبوت موجود ہے۔ گائڈ
لوگ بہت سی جھوٹی باتیں بنا لیتے ہیں۔ جس کے باعث غیر مُلک کے سیاحوں کو دھوکہ ہوتا
ہے اور وُہ ایشیائی بادشاہوں کی نسبت غلط خیال قائم کر لیتے ہیں۔ چنانچہ مجھ کو ایک چھوٹا سا
حُجرہ دکھایا گیا۔ جس کے اندر دو آدمی مشکل سے سو سکتے ہونگے۔ اور کہا کہ یہاں شاہجہان قید
تھے۔ اور اس سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن تاریخ سے ثابت ہے کہ وُہ تمام قلعہ میں

چل پھر سکتے تھے۔ اور محض نظربندی کی قید تھی۔ دیوان خاص کی پیشانی پر جو تحریریں ہیں اُن میں ایک عجیب بات دیکھی گئی کہ ایک رُخ پر تو عمرؓ و علیؓ لکھا ہے اور دُوسرے رُخ پر عثمانؓ و ابوبکرؓ یہ ترتیب باوجودِ غور سمجھ میں نہیں آئی۔

شام کے قریب اُس عمارت میں پہنچے جو تمام ایشیا کا فخر ہے۔ جس کی صناعیوں نے آجکل کے یورپ کو بھی حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ جو دُنیا کی لاثانی عمارتوں کا تاج ہے۔

جس وقت ہم نے دروازہ میں قدم رکھا اور سامنے نظر اُٹھائی تو نُورانی گنبد پر دُھوپ کی زرد شعاعیں چمکتی دکھائی دیں۔ اور آگے بڑھے تو باغ کی سبز ٹہنیاں خوشرنگ پھولوں سے جھوم رہی تھیں۔ شاہ دلگیر تو ان نظاروں میں محو ہو کر باہر بیٹھ گئے اور مَیں تاج محل میں رہنے والی ارجمند بانو کے پاس اندر پہنچا۔ نصیبہ والی ملکہ جڑاؤ چھپر کھٹ میں قرآنی حرفوں کا دوشالہ اوڑھے لیٹی تھی۔ پہلو میں شاہجہان تھا اور خاکی چلمن کے پردہ میں راز نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں نُورانی مکان میں ظلمت کی باریک چادر بچھی ہوئی تھی اور مَیں شاہجہان و تاج بی بی کے عالمِ ارواح کی سیر کر رہا تھا کہ ایک گرجدار چیخ کی آواز آئی اور مَیں اپنے استغراق سے چونک پڑا۔ دیکھا کہ قبروں کے سامنے دو انگریز کھڑے ہیں اور اُن کے سُنانے کو خادم مقبرہ نے نعرہ لگایا ہے (بلند گنبد چاروں طرف سے بند ہے اس لئے گونجتا ہے۔ آواز ٹکراتی ہوئی نیچے واپس آتی ہے تو عجیب غریب سُر معلوم ہوتے ہیں۔ خادم لوگ تماشا دکھانے کے خیال سے چیخا کرتے ہیں) آواز نصف منٹ تک برج میں چکر لگاتی رہی اور آسمانی باجوں کے سُروں کا مزا آگیا۔ لیکن ساتھ ہی ملکہ کی ناتوان آواز گوشِ خیال میں آئی جس کے یہ لفظ سمجھ میں آسکے گستاخ۔ بے ادب۔ چُپ۔ چُپ۔۔۔۔ ارے میری نیند۔ نیند۔ سر میں درد۔ در۔۔۔

اِس ایک موتی کے محل سے نکل کر باہر آیا تو خُدائی کا جلوہ نظر آتا تھا۔ اور بیسیوں یورپین نقشِ حیرت بنے کھڑے تھے۔ سامنے جمنا تھی۔ جو سردی کے سبب سُکڑی ہوئی ریت کا لحاف اوڑھے تاج کی ملکوتی شان کو دیکھ رہی تھی۔ غرضکہ ہر در و دیوار۔ یہ رُوحانی حُور بن ہاؤ

سنگار کیے بیٹھی تھیں اور ملکہ ارجمند بانو تاج محل کے نام پر درود پڑھ رہی تھیں۔ ان سب کی زیارتیں کرتا ہوا شاہ دلگیر کے پاس پہنچا اور ان کے ہمراہ باغ کی سیر کرنے لگا۔ ایک ہندو نوعمر مالی رہبر بنا۔ ہر درخت کو نام بنام بتاتا جاتا تھا۔ ایک درخت کو کہا کہ یہ آشو ہے۔ پوچھا گیا۔ آشو کیا۔ نظریں جھکا کر جواب دیا۔ وہی جسے مسلمان شمشاد کہتے ہیں۔ اس بے ساختہ جواب سے بڑا لطف آیا۔ اور تاج پر حسرت کی آخری نگاہ ڈال کر رخصت ہو گئے۔ جی چاہتا تھا کہ صبح کا تاج۔ چاندنی کا تاج۔ تاریکی کا تاج۔ برسات کا تاج۔ وقت ملے تو سب دیکھیں مگر افسوس یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

اتفاق سے مولوی معین الدین جنرل سپرنٹنڈنٹ کلکٹری متھرا کی کتاب معین الآثار مل گئی جن میں۔ تاج محل کے محققانہ مفصل حالات تھے اس کے پڑھنے سے اور بھی مسرت ہوئی اور خوش و خرم مکان کو واپس ہوئے راستہ میں شاہ دلگیر نے ہمارا نظیر اکبرآبادی کی قبر دکھائی جو بالکل شکستگی کی حالت میں ایک ویران جگہ واقع ہے۔ کوئی دن میں یہ رہا سہا نشان بھی مٹ جائیگا تو کوئی نہ بتا سکیگا کہ نظیر کی ہڈیاں کہاں دفن ہیں۔

آگرہ کی سیر سے فارغ ہو کر فتح پور سیکری کا عزم کیا جہاں مغلوں کے ابتدائی زمانہ کی عمارتیں کثرت سے ہیں۔ خوبیِ تقدیر سے ایک ایسا لائق و محقق رہنما مل گیا جو آجکل تاریخ فتح پور لکھ رہا ہے (یعنے مولوی سعید احمد مارہروی مؤلفِ حیات خسرو و آثار خیر وغیرہ) ہمارا قافلہ آگرہ سے روانہ ہو کر فتح پور پہنچا اور پیرزادہ شیخ تجمل حسین صاحب خانقاہ نشینِ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر قیام ہوا۔ یہ حضرت شیخ سلیم چشتی کی صاحبزادی کی اولاد ہیں۔ مشائخ کے قطع نظر حکام میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ سب سے اول حضرت شیخ سلیم چشتی کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوئے۔ نہایت عظیم الشان سنگ سرخ کی عمارت ہے جس کے درمیان سنگِ مرمر کا خوبصورت مقبرہ ہے۔ یہاں وہ بزرگ آرام فرماتے ہیں۔ جن کے قدموں پر اکبر جیسا شہنشاہ سر جھکانا فخر سمجھتا تھا۔ اور جنکی دعا

کا جہانگیر سا بیٹا نمونہ تھا۔

آج نہ اکبر ہے نہ جہانگیر نہ انکی حکومت۔ مگر شیخ کی روحانی سلطنت اسی طرح برقرار ہے۔ صاحب نفس شیخ کی بادشاہی کے جلوے اب بھی دیکھ سکتے ہیں۔

اس کے بعد کامل دو روز تک اکبر کے عالیشان محلوں کی سیر کرتے رہے۔ مردانے محل۔ زنانے محل۔ حمام۔ اصطبل۔ خوابگاہیں۔ سیرگاہیں۔ عشرت خانے۔ ایک چیز ہو تو لکھی جائے۔ ہزاروں مکان ہیں۔ مگر ویران سنسان۔ آدم نہ آدم زاد۔ لارڈ کرزن نے مرمت کرا کے سنبھال دیا ہے ورنہ ڈھونڈوں کا مسکن بنگیا تھا۔

یہاں کی سیر میں سب سے زیادہ موثر روحانیت ایک اجاڑ سراں میں دیکھی جو کسی زمانہ میں بڑی رونق کی جگہ تھی۔ نامی نامی سوداگر۔ غیر ممالک کے سیاح۔ اسی سراں میں قیام کرتے تھے۔ اسی سراں میں ایرانی مسافر مرزا غیاث اپنے شکستہ حال کنبہ سمیت ٹھہرا تھا۔ یہی مقام ہے جہاں مہرالنساسی اقبالمند لڑکی گودیوں میں پلتی تھی۔ یہ ابتدائی غربت کی نشانی ہے جس کی انتہا لاہور میں پاؤ گے۔ جو اداسی نورجہاں کی قبر پر ہے وہی اداسی اس سراں میں موجود ہے۔ پیرزادہ شیخ عزیزالدین صاحب اور منشی عابد علی وغیرہ میرے مجنونانہ شوق پر تعجب کرتے تھے کہ خوبصورت عمارتوں کے مقابلہ میں اس کھنڈر کو کیوں پسند کرتا ہوں۔ اور بار بار اس کی زیارت کو جاتا ہوں۔ مگر آہ انہیں کیا خبر کہ مجھ کو اس برباد سرا میں نورجہاں کی غربت مجسم نظر آتی تھی۔ کاش مولوی سعید احمد فتحپوری باتصویر تاریخ جلدی چھپوائیں۔ تاکہ اس سراں کی تصویر کو دوبارہ دیکھوں اور ان ضدی نادانوں کو دکھاؤں جو حسن اور دولت کو لازوال سمجھے بیٹھے ہیں ؂ لطیف بود حکایت دراز تر گفتم

حسن نظامی
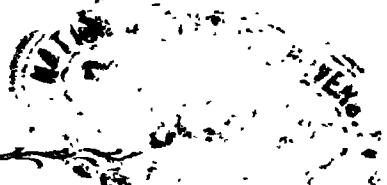
حُسن اور زوال

اصل خیال جرمن نثر میں دیکھا گیا۔ میں نے ناظرینِ مخزن کے لئے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اردو نظم میں منتقل کر دیا۔ (اقبال)

خدا سے حُسن نے اک روز یہ سوال کیا — جہاں میں کیوں نہ مجھے تُو نے لازوال کیا؟
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دُنیا — شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دُنیا
ہُوئی ہے رنگِ تغیّر سے جب نمود اسکی — وُہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جسکی
کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سُنی — فلک پہ عام ہُوئی اخترِ سحر نے سُنی
سحر نے تارے سے سُنکر سُنائی شبنم کو — فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو!
بھر آئے پھُول کے آنسو پیامِ شبنم سے — کلی کا ننھا سا دِل خُون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا [illegible]

شکرِ نعمت

زمانے کا نہ ہو شاکی کہ تو بھی اُس میں داخل ہے — خُدا کا شُکر کر۔ اِنسان ہی۔ گویا ہی۔ عاقل ہے
ہزاروں نعمتیں ایسی ہیں جو بے مانگے ملتی ہیں — تعقّل کے لئے سر ہے۔ محبت کے لئے دِل ہے
ہَوا میں سانس لیتا ہی۔ ہوَا ہے۔ زندگی تیری — نسیمِ صبح سے کیا کیا تجھے تفریح حاصل ہے
جسے پانی سمجھتا ہے وُہ آبِ زندگانی ہے — یہی اَمرت ہی۔ جاں بخشی کا جسکی خضر قائل ہے

لگی ہے آگ بھی آٹھوں پہر رحمت رسانی میں — پکانے کو ہر چولہا۔ روشنی کو شمع محفل ہے

بھلا مٹی بھی کوئی شے ہے؟ لیکن اُف رے نیرنگی — ابھی گِل ہے ابھی گُل ہے۔ ابھی گُل ہے ابھی گِل ہے

چلی آتی ہے خوشبو۔ رُوح کو ہے تازگی جس سے — اِدھر ہے ہاتھ میں گجرا۔ اُدھر بدھی حمائل ہے

صبا کو دیکھ کر چلتے۔ نہیں پھولا سماتا جی — گُلوں کو دیکھ کر کھلتے۔ شگفتہ غنچۂ دل ہے

وُہ پھولوں کے ہیں عارض۔ چُومنے سے لب نہیں تھکتے — وُہ کانٹوں کی ہیں پلکیں۔ طائرِ جاں نیم بسمل ہے

گُل و بلبل کو چھوڑو۔ تو اب ترکاریاں دیکھو — بتانا کُنہہ لذت یاں حکیموں کو بھی مشکل ہے

ہزاروں ہی ہیں میوے تو ہزاروں ہی مزے ہونگے — یہ میٹھا ہے۔ یہ کھٹا ہے۔ یہ میٹھا ترشی مائل ہے

مزوں سے بعض جا خوشبوئیں بھی کچھ لپٹی رہتی ہیں — مزہ ہے ذائقے کو۔ شامّے کو لطف حاصل ہے

اُٹھاؤ اب زمیں سے آنکھ اور افلاک کو دیکھو — وہ بحرِ بیکراں حلقہ اُفق کا جس کا ساحل ہے

کواکب کے پڑے ہیں تہ میں جس کی لاکھوں ہی موتی — صدف بھی ہیں ہزاروں ایک انہیں میں ماہِ کامل ہے

نہیں خورشید ہے غوّاص۔ اِدھر ڈوبا اُدھر نکلے — گُہر ایسے کہ مول ایک ایک کا ملکوں کا حاصل ہے

انہی کو عالمِ تقدیس میں تسبیح کی خاطر — پروتا ہے نظر کے تار میں جو مردِ کامل ہے

الٰہی شکر تیری نعمتوں کا ہو نہیں سکتا — جو ہو بھی لو فرضنا۔ وُہ بھی اک نعمت کو شامل ہے

تا افلاک تلک شہباز بس سجدے میں جھک جاؤ — تواضع ہی فقط اس بحرِ بے پایاں کا ساحل ہے

ایک علمی جلسہ

۲۱۔ فروری سنہ ۱۹۰۶ء کو لاہور میں پنڈت رام بھجدت صاحب بی۔ اے وکیل کی زیرِ صدارت ایک مقصد سے ایک علمی جلسہ ہوا تھا جس میں شعرا و اخبار نویس اور دیگر مصنفین مدعو تھے۔ ہندو مسلمانوں کے اتحاد، حُبِ وطن اور فضائلِ علم کے متعلق مضامین اور نظمیں پڑھی گئیں۔ اس جلسے میں سارے نامو

دوست حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی نے یک نہایت دلپذیر نظم بھیجی ہے جسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:-

نیا سال تقدیر نے پھر دکھایا   زمانے کا گلشن بہاروں پہ آیا
شگوفے کھلے کونپلوں کو سجایا   درختوں نے شاخوں کو دولہن بنایا
کھلے پھول - سبزے لہکنے لگے ہیں
گلستاں میں بلبل چہکنے لگے ہیں

بسنت آئی پہنے بسنتی قبائیں   مہکتی ہوئی چل رہی ہیں ہوائیں
برستی ہیں گھر گھر کے کالی گھٹائیں   یہ ہر سمت سے آ رہی ہیں صدائیں
پھر انداز قدرت نے بدلا ہوا ہے
پھر اب آریہ ورت چمکا ہوا ہے

چھلکتے ہیں گنگ و جمن آج کیا کیا؟   چڑھے پھر ہیں پنجاب کے پانچ دریا
جدھر دیکھئے زرد - سرسوں کا تختہ   پہاڑوں سے بارش کے پانی کا گرنا
چلو اس چھما چھم کی خوشیاں منائیں
چلو کاشی جی ہردوار ہو کے جائیں

چلو چل کے تربینی کا رنگ دیکھیں   نظر کی کمندیں ہمالہ پہ پھینکیں
وہ جنگل کی رو ٹاپڑی کی وہ سوتیں   وہ شاداب رمنے وہ ہوتوں کی جوتیں
آہا ہا عجب اس کی قدرت عیاں ہے
بہشت بریں ہے کہ ہندوستاں ہے

کہیں مینہہ برس کر وہ کھلنا - آہا ہا   وہ ہر پھول پتی کا دھلنا آہا ہا
وہ قطروں کا کانٹے میں تننا آہا ہا   گل و سبزہ کا ملنا جلنا آہا ہا
مبارک ہوائے ہند یہ رنگا رنگی

اسی پر تو مرتے ہیں سارے فرنگی

سروں پر وُہ نیلاہٹیں آسماں کی
دھنک ترچھی ترچھی وہ بانکی کماں کی
اچانک جھلک مہرِ شعلہ فشاں کی
کہوں کیا کہ قدرت نہیں ہو بیاں کی

نظر باز ہی کوئی پہچانتا ہے
کہ جو دیکھتا ہے وُہی جانتا ہے

یہ سب کچھ مناسب! مگر اے مری جاں
مجھے دل سے بھاتا نہیں کوئی ساماں
تری مدح حاضر ہے گو میرا ایماں
مَیں سو بار ہندوستاں تجھ پہ قرباں

مگر کیا کروں دل میں سوزِ نہاں ہے
جو سچی خوشی ہے وہ پیارے کہاں ہے

ہے دورانِ خوں۔ مجھ کو شعلہ کی تیزی
ہوا معتدل۔ تیز ہے اک چھری سی
یہ فصلِ بہاری خزاں پوری پوری
یہ بارانِ رحمت گھٹائیں ہیں غم کی

تری آبیاری سے لب تشنہ ہوں میں
ستم دیدۂ زخمِ صد دشنہ ہوں میں

تجھے اپنا کچھ دھیان ہوتا نہ ہوتا
مگر کاش مَیں تجھ میں پیدا نہ ہوتا
بلا سے بُرا ہو کے اچھا نہ ہوتا
گلے میں یہ پھانسی کا پھندا نہ ہوتا

یہ گندم نما جَو فروشی نے مارا
مجھے تیری حلقہ بگوشی نے مارا

یہ دستور ہے اک پرندہ بھی پکڑیں
تو ہم جنس اُس کے نہ دم بھر بھی دم لیں
اکٹھے وُہ ہو ہو کے شورش جتائیں
سروں پر اڑیں چیختے۔ چیخیں ماریں

مگر ہم میں اتنا بھی ایکا نہیں ہے
یہاں کوئی اپنا بھی اپنا نہیں ہے

نغمۂ شوق

اُٹھا دے ذات کے رخ سے نقاب اسما کو
چھپا نہ جسم سے تو صورت مسمّٰی کو

نقاب چہرہ الٹ دے ذرا نکل باہر
اس اپنی خلوت وحدت سے سیر دنیا کو

اگرچہ پرتو انوار محو کر دے گا
اگر نقاب یہ الٹا جمیع اشیاء کو

اگرچہ ماؤمنی میں بھی تو ہی تو ہے نہاں
اُٹھا لے ماؤمنی سے ذرا من و ما کو

اگرچہ سایۂ عنقائے مغربی ہے جہاں
مگر یہ سایہ چھپائے کہیں نہ عنقا کو

نقوش کثرت امواج ظاہر دریا
حجاب وحدت باطن بنے ہیں دریا کو

فروغ چہرۂ عذرا چھپائے رکھتا ہے
نظر سے وامق بیدل کی روئے عذرا کو

حجاب اہل نظر سے تجھے نہیں شایان
کہ نور دیدہ ہے تو چشم مرد بینا کو

ہو مغربی کہ ہو اعجاز تو ہی ناظر ہے
چھپا نہ ان سے تو اے دوست روئے زیبا کو

اعجاز (مغربی)

لوازم شاعری

جناب "شاد" کا لکھنا بجا صحیح درست
جناب "داغ" کا کہنا سر اور آنکھوں پر

مگر زمانے نے جو داغ بیل ڈالی ہے
ضرور چاہئے اس کا خیال مد نظر

جو شاعرانہ قدیم ادب کا مقصد تھی
وہ اب نہیں ہے مذاق سخن کی راہگذر

نہیں ہے جسکی طبیعت میں خاص موزونی — عروض و قافیہ پڑھ کر وہ ہو سخن گستر

پڑھے وہ مثنویاں اور مختلف نظمیں — وہ مرثیوں کو بھی پڑھتا رہے وان غور

عروض میں جو قواعد لکھے ہیں وہ سمجھے — ہر ایک بحر سے لائے نکال کر گوہر

نگاہ چاہیئے شاعر کی دور تک جائے — خیال و فکر میں رکھتا ہو وہ بلند نظر

خدا نے دی ہے جنہیں خود طبیعت موزوں — اونہیں بھی چاہیئے کسب کمال ہو رہبر

پرانے لفظ جو متروک ہیں فصیحوں میں — ہمیں بھی چاہیئے اُن سے ہو اجتناب و حذر

اسیطرح جو نئے لفظ اور داخل ہوں — جو کام آئیں ہماری زبان میں یکسر

مقابلہ میں نہ ہوں جنکے دوسرے الفاظ — تو چاہیئے ہمیں اُن سے ہو مستفیض اثر

فن عروض و قوافی میں جو کتابیں ہیں — ضرور چاہیئے شاعر کے ہوں وہ پیش نظر

ہوئے اصول ادب کے جو داخل انشا — نہ چاہیئے کہ ہو اُس راہ سے قدم باہر

مصنفان سبب وزن پر نگاہ رہے — ہو جسکی جتنی سمجھ اور جس کی جتنی نظر

رباعی کو قدما نے بہت ترقی دی — مگر ہماری زباں میں رواج ہے کمتر

بڑے بڑے جو مسائل ہیں یاد کے قابل — وہ اختصار سے اسمیں سما سکیں یکسر

جو لفظ غیر زبانوں کے آئیں اُردو میں — وہ بولے عام میں جاتے ہیں جسطرح اکثر

تصرف اُن میں نہ اپنا کرو نہ سمجھو غلط — جو ہیں زبانوں پہ جاری وہی لکھو یکسر

کلام چاہیئے عیبوں سے پاک صاف رہے — زباں میں طرز ادا ہو فصیح و جان پرور

ہیں شاعری کے جو موضوع اونکے لکھنے میں — ہر ایک درجہ کے لائق ہو سخن گستر

جو بات پردہ کی ہے اسکو کھولکر نہ کہو — رہے مجاز و حقیقت کا ساتھ پیش نظر

غرض یہ ہے کہ کریں سب خیال حفظ ادب
ہو ایک جادۂ معقول سب کی راہگذر

خواب عبرت

اک روز کہ میں خواب میں ہنگام سحر تھا ناگاہ مرا تربت قیصر پہ گذر تھا
یاد آئی یکایک جو مجھے شوکت مرحوم عبرت سے یہ دریافت کیا با دل مغموم
کیوں مٹ گئے وہ نقش نگیں کیا ہوئی صولت کیا تھی یہی دو ہاتھ زمیں کے لئے دولت
تربت سے ندا آئی کہ اے وائے مقدر دو ہاتھ میں بھی پاؤں نہ پھیلا سر بستر
دو ہاتھ زمیں بھی نہیں آرام کی جا ہے ہر عضو مرا اس میں بھی کیڑوں کی غذا ہے

دنیا جسے کہتے ہیں وہ اک شب سرا ہے گر اس کو کوئی سمجھے تو افسوس کی جا ہے
وہ کون ہے جو آ کے مدام اس میں رہا ہے دو روز کی ہستی ہے پھر آخر کو فنا ہے
جو شاہ فلک جاہ تھے افلاک کے نیچے بے نام و نشاں سوتے ہیں وہ خاک کے نیچے

ہیں جیتے ہی جی کام کے یہ درہم و دینار جب تن سے گئی جان تو سب ہو گئے بیکار
عیسیٰ نفسوں کو بھی کیا موت نے ناچار ہشیار کو لازم ہے رہے مرگ سے ہشیار
کہلاتے ہیں جو لوگ شہنشاہ زمن کے ہوتے ہیں پس مرگ وہ محتاج کفن کے
تنہا تجھے جانا ہے عدم کا وہ سفر ہے شفقت کے لئے باپ نہ خدمت کو پسر ہے
کچھ زور کی درکار نہ کچھ حاجت زر ہے جو شاہ کا ایواں ہے گدا کا وہی گھر ہے
گھر سے جو کیا کوچ تو بے گھر ہوئے دونوں
جب قبر میں اترے تو برابر ہوئے دونوں

طالب بنارسی

ترجمہ اینک آرڈن

گزشتہ اشاعت سے آگے

یہ سنکے ہوئی خجل وہ ناچار — بیٹھی منہ کرکے سوئے دیوار
کیونکر کہوں تم سے چار آنکھیں — اٹھتی نہیں شرمسار آنکھیں
کیسی میں ہوں بدنصیب اسقدر — ملتی نہیں میرے بچوں کی تباہ
داخل ہوئے تم جو گھر کے اندر — مر گیا کبھی بار غم سے دب
اور اب یہ کلام مہربانی — شکر کرتے ہیں پانی پانی
لیکن زندہ ابھی ہے اینک — اسمیں نہیں ہے دل کو کچھ شک
کردیگا تمہاری وہ ادائی — ممکن ہے ادائی دینے کی
البتہ یہ بار لطف و احسان — اترے سر سے نہیں یہ امکان

- - - - - - - - - -

یہ سنکے وہ بولا ہوکے مسرور — اینی! کیا تم کو ہے یہ منظور؟
دیوار سے منہ پھیر کے اینی — اٹھی اسکے قریب آئی
آنسو آنکھوں میں ڈبڈبائے — چہرے کی طرف نظر جمائے
تکتی رہی تھوڑی دیر تک — پھر دیکے دعائے خیر و برکت
اور ہاتھ میں اسکے ہاتھ لیکے — آہستہ سے تکان دے کے
چھوٹا سا جو گھر میں اک چمن تھا — پکڑے ہوئے ہاتھ لائی اُسکا
طے ہو چکے یوں جو سب مراتب — پھر خوش خوش وہ گھر کی جانب

- - - - - - - - - -

آخر بھائی بہن کو لے کے — بھیجا اسکول میں جناب نے
درکار کتابیں جسقدر تھیں — انکی خاطر وہ سب منگائیں
سمجھے ہر ایک امر میں وہ — فرزندوں کے مثل ان کو
از غم اپنا سمجھ کے انکا کام — دل سے کرتا رہا سرانجام
پھر بھی اندیشہ شماتت — اسکی دیتا نہ تھا اجازت
اینی کے گھر کو آئے پائے — دل کی جو مراد تھی بر آئے
بدنامی اینی کا جو ڈر تھا — اس ڈر سے بھی نہ تھا گذرتا
ہاں لڑکوں کے ہاتھ سے ہمیشہ — تھا بھیجا رہتا کوئی تحفہ
جیسے ترکاری و میوہ — جو باغ میں اس کے ہوتا پیدا
یا کرکے عمدگی کا حیلہ — خیرات کا ہو نہ جس میں شبہ
اعلےٰ درجے کا صاف آٹا — اکثر گرنی سے بھیجتا تھا

- - - - - - - - - -

لیکن نہ ہوا فلپ پہ زنہار — مشکوری اینی کا کچھ اظہار
ہر چند کہ یہ تھا حال اسکا — بندہ تھا بال بال اسکا
جوش جذبات حق گزاری — دیتا تھا نہ گفتگو کی باری
کرتی ایک آدھ دفعہ کچھ بات — آتا وہ اگر پئے ملاقات
جب شکر کا ذکر لب پہ لاتی — گونگے کا سا خواب گنگناتی

پھر ہوا ہم کو دل و دین کا بچانا مشکل ۔ نگہ ناز کا پھر ہم سے تقاضا ہے وہی
ناز نے پھر کیا آغاز وہ اندازِ نیاز ۔ حسن جاں سوز کو پھر سوز کا دعویٰ ہے وہی
محو دیدِ چمنِ حسن ہے پھر دیدۂ شوق ۔ گل شاداب وہی بلبل شیدا ہے وہی
پھر چمک اُٹھی وہ کجلائی ہوئی چنگاری ۔ رخت ہستی ہے وہی عشق کا شعلہ ہے وہی
آرزو جی اُٹھی پھر پیار جو اُس بُت نے کیا ۔ پھر لب یار میں اعجاز مسیحا ہے وہی
پاسِ ناموس نے پھر رخصتِ رفتن چاہی ۔ شہرتِ حسن وہی الفتِ رسوا ہے وہی
پھر ہوئی لیلےٰ و مجنوں کی حکایت تازہ ۔ اُن کا عالم وہی نیرنگ کا نقشہ ہے وہی

نیرنگ

از تصنیف جناب نواب شمشیر بہادر ساغر رئیس جیگڑہ

ذرے افشاں کے جو عارض پہ چمک جاتے ہیں ۔ چاندنی رات میں تارے سے چھٹک جاتے ہیں
دل کے شعلوں سے یوں مجبور ہوئی کیا آہیں ۔ کہ ہوا پاتے ہی یہ اور بھڑک جاتے ہیں
کھکھلا کر جو وہ ہنستے ہیں کبھی گلشن میں ۔ غنچے خوش ہوتے ہیں ایسا کہ چٹک جاتے ہیں
چشم بیخواب سے میری جو کبھی ہوتی ہے شرط ۔ دیدۂ انجم رخشندہ جھپک جاتے ہیں
منزلِ عشق کا آسان نہیں طے ہونا ۔ یہ وہ ہے راہ کہ لاکھوں ہی بھٹک جاتے ہیں
ناتوانی میں ہو کس طرح تجسس اُس کا ۔ ہم تو چلنے کے تصور سے بھی تھک جاتے ہیں
کچھ مئے عشق کی لذت سے جو واقف ہیں تو ہم ۔ شیخ تو ایک ہی جلوے میں بہک جاتے ہیں
دم آخر یہ ہے موقوف جو وصلِ محبوب ۔ لوگ کچھ سوچکے بالیں سے سرک جاتے ہیں

جوہری ہیں جو دُرِ بحر سخن کے ساغر
سُن کے اشعار مرے دل میں پھڑک جاتے ہیں

عرق ماءاللحم انگوری

اور

درازی عمر

یہ امر تازہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ دو بزرگ ہمعمر جو اتفاق سے ایک ہی ضلع میں مقرر تھے ایک ہی مرض میں مبتلا تھے ضعف باہ اور تاریکی چشم۔ سر کا گھومنا چکرانا۔ تھوڑے کام سے دل گھبرانا چند گھنٹہ بیٹھ کر کام کرنا پڑے سردرد ہوجانا۔ بھوک کا بند ہوجانا۔ ہاتھ پاؤں کا ٹوٹنے لگنا اور کبھی گھر میں تخلیہ کا موقع ملے تو صبح کو کوفت عضو کی معلوم ہونا۔ چارپائی سے اُٹھنے کو دل نہ چاہنا۔ ایک صاحب نے عرق ماءاللحم کا استعمال شروع کیا اور دوسرے صاحب اور مختلف معالجہ ڈاکٹروں حکیموں کا کرتے رہے چند دنوں بعد عرق پینے والے کا رنگ روشن سرخ ہوگیا اور زردی چہرہ دور ہوکر گال جو پچکے ہوئے تھے پُر ہوکر رنگ چمکنے لگا تو دوسرے مختلف ادویہ کھانے والے دوست نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ یار کیا بات ہے تم تو چار بجے کے بعد سات بجے تک کچہری میں کام کرتے رہتے ہو۔ صبح دم دیکھو سویرے ہی اُٹھ کر پھر ہوا خوری کے لئے تیار۔ یہ ماجرا کیا ہے۔ سُن نے کہا بات یہ ہے کہ میں **عرق ماءاللحم انگوری دو آتشہ** ساختہ حکیم غلام نبی لاہوری پیا کرتا ہوں چنانچہ وہ سن کر نہ رہ سکے جھٹ تار دیا۔ عرق بھیجدو +

اب اس ڈپٹی کلکٹر کا سارٹیفکیٹ ملاحظہ کیجئے جس نے سول سرجنوں اور معزز دوسرے حکماء کا علاج کیا اور ناکامیاب رہا۔ دیکھئے وہ کیا کہتا ہے۔ آدھ آنہ کا ٹکٹ بھیجدیجئے۔ سارٹیفکیٹ صحت یافتہ صاحب کے بھیجدونگا۔ قیمت فی بوتل عہ تین بوتل سے چھ بوتل عہ فی درجن عہ بذریعہ ریل منگانے میں محصول کی کفایت ہوگی ریلوے سٹیشن بمعہ لائن صاف لکھیں ورنہ بذریعہ ڈاک منگوانے میں علاوہ محصول ڈاک پیشگی آنا ضروری ہے +

پتہ ۔ حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکماء لاہور موچی دروازہ (اعلان منزل)

۵
مبارک! مبارک!! مبارک!!!
مشہور تہوار بیساکھی کی یادگار میں صرف شروع اپریل ۱۹۰۶ء کیلئے خاص رعایت
یہ رعایت صرف انکو دیجاویگی جنکی درخواست بمہر ڈاکخانہ شروع اپریل ۱۹۰۶ء کی ہوگی مگر دور
شہروں کے باشندگان ۱۵ اپریل ۱۹۰۶ء تک درخواستیں روانہ کرسکتے ہیں +
اصل قیمت چھ روپیہ
رعائتی صرف تین روپیہ
معہ ریشمی چین
اس گھڑی میں جس قدر صفات
موجود ہین اگرچہ انکا اظہار کرنا
فضول نہ ہوگا مگر اس قدر بیان
کردینا کافی ہوگا کہ یہ گھڑی خوبی
اور پائیداری میں بے مثال
اور دنیا کے مشہور ترین کارخانہ رسکوپ کی ساخت ہے اور باوجود ان تمام اوصاف
کے قیمت بھی بہت تھوڑی ہے یعنی اصل قیمت چھ روپیہ رعائتی فروخت تین روپیہ معہ ریشمی
چین اور طرفہ یہ کہ گارنٹی بھی پانچ سال ہے۔ ریلوے گارڈ واچ گارنٹی آٹھ سال اصل
قیمت بارہ روپیہ رعائتی صرف چھ روپیہ۔ محصول ڈاک بذمہ خریدار نام اور پتہ خوشخط
اور صاف تحریر کریں اور بوقت درخواست حوالہ رسالہ دین +
المشتہر
لچھمن داس آہوجہ چونی منڈی لاہور۔
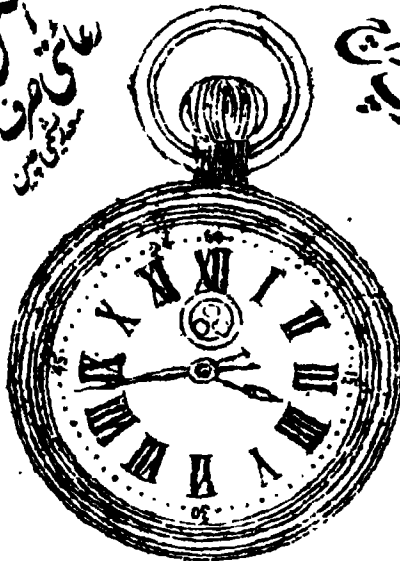
وکیل اور زمیندار کا قصہ

کسی گاؤں میں ایک سادہ لوح وغریب زمیندار برنارڈ نامی رہا کرتا تھا۔ ایک دن اسکو شہر جانیکا اتفاق ہوا جہاں وہ ایک مشہور وکیل سے ملا اور پوچھا کہ مال دار بننے کی کوئی راہ بتلائیں وکیل نے اپنی فیس لیکر ایک بند لفافہ برنارڈ کے حوالہ کیا۔ گھر میں آکر شام کے وقت زمیندار نے لفافہ کھولا۔ تو لکھا تھا:۔

جو کام آج کر سکتے ہو اس کو کل پر مت ڈالو

زمیندار کا ہزاروں من چارہ باہر کھیت میں پڑا تھا۔ فوراً اس کو گھر لا کر مکان کے اندر رکھوا دیا رات کو طوفان آیا اور بارش موسلا دھار ہوئی جن لوگوں کا چارہ باہر تھا سب بہ گیا گویا سارے گاؤں میں صرف برناڈ ہی بشاش تھا۔ طاعون کا طوفان بارش کے طوفان سے بدرجہا خوفناک ہے جو لوگ برنارڈ کی طرح خوش وخرم وبے فکر رہنا چاہتے ہوں ان کو طاعون کی دوا ہر وقت گھر میں رکھنی چاہئے ہم نے کبھی نہیں سنا کہ کسی مریض نے ہماری دوا کا استعمال کیا ہو اور وہ صحت یاب نہ ہوا ہو یا کسی تندرست آدمی نے اسکا تھوڑا سا استعمال کیا ہو اور وہ طاعون کا شکار ہوا ہو +

(۱) دوائی طاعون ہزاروں جانیں بچا چکی ہے قیمت دو روپے فی شیشی۔

(۲) خضاب مثل تیل چنبیلی کے لگایا جاتا ہے۔ سفید بالوں کو سیاہ بھنورا کرکے اصلی رنگت دیتا ہے بالوں کو ریشم جیسے نرم رکھتا ہے جلد پر داغ نہیں دیتا۔ قیمت دو روپے (عہ) فی شیشی۔

(۳) روغن گل بیان اسکے استعمال سے بال ہمیشہ سیاہ رہتے ہیں اگر سفید ہو گئے ہوں تو بھی آہستہ آہستہ سیاہ ہو جاتے ہیں قیمت دو روپے (عہ)

(۴) گلگونہ: چہرہ سے جھریاں چھائیاں سیاہ داغ وکیل دور کر دیتا ہے خوبصورتی کیواسطے لازمی ہے قیمت دو روپے (عہ)

(۵) دوائی بواسیر۔ بواسیر خونی ہو یا بادی ۔ مسے اگر ہوں تو بلا تکلف گم بشرطیہ شفا۔ قیمت دو روپے (عہ)

(۶) روح النساء۔ عورتوں کی سب بیماریوں کے لئے اکسیر ہے قیمت تین روپیہ (ﷲ)

(۷) روغن کان۔ بہری ہو یا بہتی ہوں۔ درد ۔ سائیں سائیں یا طرح طرح کی آوازیں آتی ہوں فوراً آرام ہوتا ہے قیمت (عہ)

(۸) سرمہ ۔ دھند غبار سلائی پڑوال جالا ۔ وغیرہ کیواسطے اکسیر ہوتیا بند کیواسطے مفید امریکہ جرمنی تک مشہور فی تولہ (عہ)

(۹) بال اڑانیکا تیل۔ بلا تکلف ایک دو منٹ میں بال دور ہوں قیمت ۸ فی شیشی محصولڈاک ذمہ خریدار ہے +

ملنے کا پتہ:۔ ڈاکٹر کیسر سنگھ ایم۔ اے بجرم ہسپتال فیروزپور شہر پنجاب